دنیازاد

کتابی سلسلہ ۳۱

ترتیب: آصف فرخی

کتابی سلسلہ

دنیا زاد

کتاب ۳۱

وقت کا باغ

ترتیب و تالیف

آصف فرخی

کتابی سلسلہ

دنیا زاد

کتاب ۳۱

جون ۲۰۱۱ء

کمپوزنگ : احمد گرافکس، کراچی info@ahmedgraf.com

طباعت : اے جی پرنٹنگ سروسز، کراچی

رابطہ : شہرزاد

بی ۱۵۵، بلاک ۵، گلشن اقبال، کراچی

ای میل : asiffarrukhi@hotmail.com

کتابی سلسلہ، سال میں تین کتابیں

پاکستان میں : ۶۰۰ روپے

بیرون ملک : ۶۰ امریکی ڈالر

Courtesy Miss Zahida Qadri
London

فہرست

محفل

اپنے ڈراؤنے خوابوں میں بازی گر کا وہ تماشا یاد آتا ہے جو شاید دیکھا تھا یا بچپن میں اس کا حال پڑھا تھا اور یوں لگا تھا جیسے آنکھوں کے سامنے سے گزر گیا ہے۔ اس تماشے کا مرکز وہ نشانہ باز تھا جو اپنی مہارت کے ثبوت مختلف طرح سے پیش کر رہا تھا۔ اس نے چلتی ہوئی چیزوں اور گھومتی ہوئی نشانیوں کو مار گرایا۔ تب اس نے کھیل کا وہ حصہ شروع کیا جس کے دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ سنہری بالوں اور چمک دار لباس والی اس لڑکی کو ایک تختے کے سامنے کھڑا کر کے اس نے خنجر اچھالنے شروع کیے اور تھوڑی دیر کے بعد وہ لڑکی مسکراتی ہوئی وہاں سے اٹھی تو اس کے گداز بدن کا نقشہ چاقوؤں سے کھینچا ہوا تھا۔ ڈراؤنے خوابوں میں اب وہ لڑکی غائب ہو چکی ہے اور اس کی جگہ میں اپنے آپ کو پاتا ہوں، خوف کے اس عالم میں کہ اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے، میرے چاروں طرف چلتے ہوئے چاقو چمک رہے ہیں۔ مگر ان چاقوؤں کے پھل عجیب سے ہیں۔ میں ان کو اپنی کھال سے بال برابر نزدیک گزرتے ہوئے محسوس کرتا ہوں اور ذرا سی بھی جنبش کیے بغیر، آنکھیں گھما کر دیکھتا ہوں — میرے چاروں طرف سنسناتے ہوئے چاقوؤں کے پھل سوالیہ نشان کی شکل کے ہیں۔ ان سوالیہ نشانوں میں، گھرا ہوا اور بندھا ہوا میں کھڑا ہوں، نہ میرا ڈر کم ہوتا ہے اور نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ مسلسل سوالوں کی اس دھار دار یلغار کا آخر کوئی جواب بھی ہے؟ میری جانب رواں یہ دھار دار سوال روز بروز کم ہونے کے بجائے بڑھتے چلے آ رہے ہیں، میں ایک ٹک دیکھے جاتا ہوں اور دم نہیں مار سکتا...

اس خواب سے بھی اب میں اتنی بار گزرا ہوں کہ مجھے یہ اپنی جاگتی ہوئی حقیقت معلوم ہونے لگا ہے اور ہر کونے کھدرے سے، گلی کوچے سے مجھ پر لپکتا ہے۔ میں اخبار کھولتا ہوں یا ٹی وی کا کوئی چینل، یہی ہے جو میری جانب بڑھے چلا آتا ہے۔ ایسے اندرونی و بیرونی خلفشار میں مبتلا جو نہ حل ہوتا ہے اور نہ سمجھنے سمجھانے میں آتا ہے، یہ آج کل کے دن، ہر گھڑی سوالوں کی نئی بوچھار ساتھ لے کر آتے ہیں۔ عسکریت پسندوں کی کارروائی سرحدوں کو پھلانگتی کر اندرون ملک ایک روزمرہ حقیقت بن چکی ہے، سماجی ادارے پسپا ہونے لگے ہیں اور معیشت رو بہ زوال —

ایسے میں ساری دنیا کی توجہ ایک بار پھر پاکستان کی طرف مبذول ہوجاتی ہے، روز افزوں بڑھتے ہوئے اس بحران کی وجہ سے نہیں بلکہ چشم زدن میں مکمل ہوجانے والی اس فوجی کارروائی سے جس کے نتیجے میں ''دنیا کا سب سے زیادہ مطلوب شخص''، اسامہ بن لادن، پاکستان کے شمالی شہر ایبٹ آباد میں ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ کارروائی مکمل کرنے کے بعد سپر پاور امریکا کے ہیلی کاپٹر سرعت سے پرواز کر جاتے ہیں اور ہکا بکا رہ جانے والی دنیا کے سامنے یہ اطلاع نشر ہونے لگتی ہے کہ اس کی لاش کو سمندر بُرد کر دیا گیا۔ ایک سوال کے بارے میں سوچتے ہیں تو کنپٹی کے پاس سے ایک اور چاقو بس چھوتا ہوا گزر جاتا ہے۔ نہ جانے ابھی اور کتنا وقت لگے گا کہ ہمارے اوسان بحال ہوں اور ہم اس واردات کے دور رس نتائج کا اندازہ لگا سکیں۔ ہم اس وقت بھی نشانہ بنے ہوئے ہیں اور اگر بول رہے ہیں تو اسی حالت میں ...اب کوئی اور تو آ کر ہمیں بتانے سے رہا کہ ہم نشانے کے اس تختے تک پہنچے کیسے اور چاقوؤں کے اس کھیل میں ہمارا کردار کیا ہو کر رہ گیا ہے۔ اب وہ بچپن باقی ہے نہ خواب، لیکن میرا اکڑا ہوا بدن اتنے دن سے حرکت کرنے سے کیوں قاصر ہے، اور میری آنکھیں یہ سب دیکھنے پر مُصر کیوں ہیں؟

اسامہ بن لادن اپنے انجام کو پہنچا اور یوں معاصر تاریخ کا ایک ہیبت ناک باب ختم ہوا جس نے اس ہزاریے کے آغاز کے فوراً بعد ہی پوری دنیا کو دہشت کی لپیٹ میں لے لیا تھا اور خاص طور پر مسلمانوں کے لیے بین الاقوامی سطح پر رسوائی اور اندرونی طور پر بے جواز و بے لچک، برخود غلط تشدد و غارت گری کا سامان فراہم کر دیا۔ یہ صورت حال پاکستان کے لیے اور زیادہ تکلیف دہ ہے جو پہلے ہی گہرے سماجی و سیاسی آشوب میں مبتلا ہے۔ اس پر دو آتشہ صورت حال کا یہ نیا رُخ جو ریاست کے بگڑتے ہوئے حالات اور انتشار کو مزید نمایاں کر رہا ہے۔ ہم یہ نیا صدمہ کس طرح سہہ سکیں گے؟

حالات جب اتنے زیادہ خراب ہوں تو کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ کاش کسی طرح وقت کی طنابیں کھنچ جائیں اور اپنے وقت سے دور، ہم کسی اور زمانے میں پہنچ جائیں، وقت کے باغ میں کھلنے والے نئے پھول دیکھیں، لیکن یہ طلسم تو خود ایک نئی حیرت سے دوچار کرتا ہے۔ جدید افسانے کے آقائے نام دار بورخیس نے اپنے مختصر افسانے ''خفیہ معجزہ'' میں اس الٹی پلٹتی کیفیت کو سمیٹ لیا ہے، اس سے زیادہ بڑے کینوس پر وقت کی اس کارگزاری کا نقشہ شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے نئے

افسانے میں بڑی دلآویز تفصیل کے ساتھ کھینچا ہے۔ زمانہ قدیم کو زبان و بیان، لباس و رسوم کے ذریعے زندہ کر دینا ان کا خاص فن ہے جس کا مظاہرہ انہوں نے اپنے معرکتہ الآراء ناول میں خوب خوب کیا ہے۔ یہ افسانہ، اس ناول کے بعد ان کی پہلی افسانوی تحریر ہے۔ اپنے مخصوص میدان میں فاروقی صاحب نے حال ہی میں داستانوں پر اپنے تنقیدی سلسلے کی چوتھی کتاب مکمل کی ہے جو لاہور سے جلد ہی شائع ہوگی۔ فاروقی صاحب کا یہ افسانہ وقت کو ایک نئے ڈھنگ سے سوچنے اور محسوس کرنے پر اکساتا ہے اور وقت کا یہ حیرت کدہ ''دنیا زاد'' کی اس نئی اشاعت کا خاص حوالہ بھی بن جاتا ہے۔ جے جی بیلارڈ، جس کا انتقال حال ہی میں ہوا ہے، موجودہ دور کے سب سے زیادہ طباع اور ذہین انگریزی ادیبوں میں سے تھا۔ اس کے مترجم محمد سلیم الرحمٰن کا خیال ہے کہ بیلارڈ کے بعض افسانے، اس صدی کے اہم ترین افسانوں میں جگہ پا سکتے ہیں۔ وقت کو غازی صلاح الدین نے کسی اور ہی ڈھنگ سے دیکھا ہے۔ پاکستان کے معروف صحافی غازی صلاح الدین نے ابتداء میں بڑے تواتر کے ساتھ افسانے بھی لکھے تھے۔ جو آج بھی ان کے پڑھنے والوں کو یاد ہیں۔ غازی صلاح الدین کی زیر تصنیف کتاب کا پہلا باب پیشِ خدمت ہے۔ غازی صلاح الدین نے ''دنیا زاد'' سے وعدہ کیا ہے کہ اس سلسلے کو آگے بڑھائیں گے۔

وقت کے باغ میں جن تحریروں کی دل کشی ماند نہیں پڑتی، وہ کلاسیک کی حیثیت اختیار کر جاتی ہیں اور یہی حیثیت میرزا عبدالقادر بیدل کی ہے جو ہندوستان میں فارسی کے مسلم الثبوت استاد ہی نہیں تھے بلکہ نابغۂ روزگار شخصیت کے حامل بھی تھے۔ مرزا غالب نے ''طرز بیدل'' میں ریختہ لکھنے کو قیامت جانا تھا، لیکن زمانے کی گرد نے طرز بیدل کو ہمارے لیے ایک بند کتاب بنا کر رکھ دیا ہے جس کی زبان بھی ہمارے لیے پوری طرح مانوس نہیں۔ افضال احمد سیّد کا بیدل کے اشعار کا ایک انتخاب ترجمے کے ساتھ نقشِ شیشہ گر کے نام سے اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس سے شائع ہونے والا ہے۔ افضال احمد سیّد نے بیدل کے مزید اشعار کا ترجمہ کیا ہے جن کی اشاعت وہ امروز نارسیدہ کے نام سے پسند کریں گے۔ اس کا ایک حصہ آیندہ صفحات میں پیش ہے۔

''متوقع طور پر غیر متوقع'' — خالدہ حسین کے نئے افسانے کی پہلی سطر ہی گرفت میں لے لیتی ہے۔ سربرآوردہ افسانہ نگار خالدہ حسین کے ہر نئے افسانے سے ہمیں یہی توقع ہوتی ہے کہ وہ غیر متوقع ہوگا، نئے ڈھنگ کا ہوگا اور ایک نئی کیفیت کا حامل۔ ''جانِ من و جانِ شما'' کے تواتر میں

''معدن'' جیسا ڈھلا ڈھلایا افسانہ لکھ کر خالدہ حسین نے پڑھنے والوں کی توقعات نہ صرف پورا کیا بلکہ نئی منزلوں کا سراغ بھی دیا ہے جن کی طرف ان کا قلم گام زن ہے۔ لکھنؤ میں مقیم افسانہ نگار اور نقاد انیس اشفاق نے ایک عرصے کے بعد افسانے کی طرف دوبارہ رُخ کیا ہے۔ ہماری نظر میں وہ اس دور کے اہم اور قابل ذکر افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں اور افسانے کی طرف مراجعت پر خوش آمدید کہتے ہیں۔ راشد اشرف انجینئر ہیں اور وہ ادبی ویب سائٹز پر بہت فعال ہیں۔ یہ ان کا پہلا افسانہ ہے۔ حیدرآباد میں طویل عرصے قیام کے بعد حسن منظر کراچی منتقل ہوگئے ہیں اور اپنے نئے ناول ''انسان، اے انسان!'' (جس کا ذکر ''زقوم'' کے نام سے ان صفحات میں پہلے آچکا ہے) کو اشاعت کے لیے تیار کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے چند مختصر افسانے بھی لکھے ہیں جن میں سے ایک اس بار شاملِ اشاعت ہے۔ حسن منظر کا ارادہ ہے کہ وہ چند اور مختصر افسانے مکمل کریں گے، پھر کوئی اور کام—

زہرا نگاہ نے حال ہی میں ہندوستان کے بارے میں ایک رپورٹ پڑھی کہ حاملہ عورتیں ہونے والے بچے کی جنس معلوم کرانے کے لیے کثرت سے ٹیسٹ کروا رہی ہیں اور اگر یہ معلوم ہو جائے کہ لڑکی پیدا ہوگی تو بچے کی پیدائش کے بجائے اسقاط کروالیتی ہیں۔ یہ نظم اسی حوالے کے گرد تعمیر کی گئی ہے۔ خواجہ رضی حیدر کی زیادہ شہرت ان کی غزلوں کے حوالے سے ہے لیکن ان کی نظموں پر ان کے اسلوب کی مخصوص پختگی کی چھاپ نظر آتی ہے۔ نثری نظم میں اختصاص رکھنے والی معروف شاعرہ تنویر انجم کا نیا مجموعہ ''زندگی میرے پیروں سے لپٹ جائے گی'' حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ تنویر انجم کی ایک نظم ''دنیا زاد'' میں کمپوزنگ کی فاش غلطیوں کے ساتھ شائع ہوئی تھی جس سے نظم کا تاثر مجروح ہوگیا تھا۔ معذرت کے ساتھ یہ نظم دوبارہ شائع کی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر طاہر مسعود کی تازہ ترین کتاب ان کے افسانوں کا مجموعہ ''گم شدہ ستارے'' ہے۔ وہ باضابطہ شاعری تو نہیں کرتے لیکن کبھی کبھار نظمیں لکھتے رہے ہیں، جن کا انتخاب اس بار ''دنیا زاد'' میں شامل ہے۔ احمد فواد نے اپنے پہلے مجموعے ''یہ کوئی کتاب نہیں'' کی اشاعت سے جدید نظم کے قارئین کو چونکا دیا تھا۔ اس کے بعد ان کے دو مزید مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ وہ سوات کے شہر سیدو شریف میں انگریزی ادب کی تدریس سے وابستہ ہیں۔ منفرد لب و لہجے کے شاعر اور ''بچے، تتلی، پھول'' جیسے مجموعے کے مصنف ن م دانش کا قیام نیویارک میں ہے۔ پنہاں کا قیام اب امریکا میں ہے اور تنقید اور شاعری پر ان کی توجہ جاری ہے۔ عرفان ستار اور اجمل سراج دونوں غزل کے شاعر ہیں اور ایک ایک مجموعے کی

اشاعت سے ہی اپنا رنگ جما چکے ہیں۔

ایک نئے عنوان کے تحت محمد منشا یاد پر انتظار حسین کی تحریر پیش ہے، حالاں کہ ان کا پچھلا مضمون ہی باعثِ نزاع بن گیا ہے۔ ظفر اقبال کو ایک بار پھر جناب انتظار حسین پر غصہ آ گیا ہے۔ خفگی کچھ ان فقروں کی وجہ سے ہے جو کشور ناہید کے ذکر پر انتظار صاحب نے ظفر اقبال کے حوالے سے لکھ دیے تھے۔ ان کے جواب میں ظفر اقبال نے اپنی توپوں کا رُخ انتظار صاحب کی طرف کردیا، شاید یہ سوچتے ہوئے کہ ہلّہ بول دینا ہی بہترین دفاع ہے۔ انتظار صاحب کے فقروں کا شاید اثر اتنا زیادہ ہوا ہے کہ اس کی تکرار ظفر اقبال کی نئی غزلوں میں گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ اس صورت میں یہ ادبی اختلاف تو نہ رہا، آپ کا کیا خیال ہے؟

انتظار حسین اور ظفر اقبال اپنی اپنی جگہ۔ ان کے علاوہ ''دنیا زاد'' کے مستقل قلم کاروں میں احمد مشتاق اور فہمیدہ ریاض کی شمولیت ہمارے لیے باعثِ افتخار ہے۔ احمد مشتاق نے پچھلے دنوں محض ایک آدھ غزل لکھی ہے (جس سے بھی انہوں نے ہمیں محروم رکھا ہے) اور پوری تندہی کے ساتھ سارا ماگو کے ناول ''اندھے لوگ'' کے ترجمے پر جٹے رہے۔ انہوں نے گویا خود سے شرط باندھ لی تھی کہ جب تک یہ ترجمہ مکمل نہ ہوجائے گا، وہ کسی اور کام پر ہاتھ نہیں ڈالیں گے۔ سارا ماگو کا ترجمہ بھاری پتھر ہے، اس لیے کہ اس کے طویل اور پیچ دار جملے اس طرح کے چیلنج کی سی حیثیت رکھتے ہیں جس کا اندازہ عسکری صاحب کے تجزیے سے ہوسکتا ہے کہ اردو میں صحیح معنوں میں لمبا جملہ لکھنا بہت مشکل ہے۔ احمد مشتاق اب اس ترجمے کو اشاعت کے لیے تیار کر رہے ہیں اور خیال ہے کہ یہ ناول ''شہرزاد'' کی جانب سے اسی سال شائع ہوجائے گا۔ ''اندھے لوگ'' کی تکمیل کے بعد احمد مشتاق چند نظموں اور ایک نئے ناول کے ترجمے کا ارادہ کر رہے ہیں — تفصیلات کا انتظار کیجیے۔ مگر اس طرح کا انتظار نہیں جو ظفر اقبال کر رہے ہیں! فہمیدہ ریاض بیک وقت کئی اصناف میں قدرتِ اظہار رکھتی ہیں۔ ان کی نظم سی آئی اے کے اس اہل کار کے حوالے سے ہے جو لاہور کی سڑک پر دو پاکستانیوں کو کچلنے کے بعد سفارت کار کے روپ میں یہاں سے غائب کروا دیا گیا اور ان کی کہانی کچھ ان واقعات کی روداد جو ایک سرکاری ادارے کی سربراہی میں ان پر گزرے۔ یوں اس کہانی کا ماجرا، اس روداد سے قریب تر ہے مگر صرف ومحض اسی پر مبنی نہیں۔ فہمیدہ ریاض کی جس نظم پر ''دنیا زاد'' کی پچھلی کتاب اختتام پذیر ہوئی تھی، اس کا حوالہ معروف صحافی زبیدہ مصطفیٰ نے اپنے اخباری مضمون میں دیا ہے۔ تعلیم، سماجی معاملات اور حالات حاضرہ کے حوالے سے زبیدہ

مصطفیٰ کی تحریریں اخباری اشاعت کے علاوہ اب ویب سائٹ پر بھی دستیاب ہے۔ ہمارے سماجی ڈسکورس میں معاصر اردو ادب کا حوالہ شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتا ہے، خاص طور پر اس لیے بھی یہ مضمون اہم معلوم ہوا۔ عرب موسم بہار اور امید انقلاب کی توقع کی جگہ اس وقت اسامہ بن لادن کی ہلاکت پر قیاس آرائی نے لے لی ہے۔ یعنی ایک بار پھر وہی سوال اور خنجروں کی بوچھار...

اسامہ بن لادن کی ہلاکت کے لیے امریکا نے جو طریقۂ واردات اختیار کیا، اس پر نکتہ چینی کرنے سے پہلے — نوم چومسکی جیسے دانش ور نے ایک بیان میں اس کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے— ہم اس پورے معاملے میں پاکستانی حکومت کی کارکردگی کی وضاحت بھی ضروری سمجھتے ہیں جس کے رویے ہمارے سمجھ میں نہیں آتے۔ کیا یہ ہمارے فہم کا قصور ہے؟ امریکی حکومت کا طریقۂ واردات کے بارے میں اختلاف و اعتراض بہرحال اسامہ بن لادن کو ایک مقبول عام شخصیت یا ''اسلامی سورما'' بنانے کے لیے کافی نہیں۔ پاکستان کے ایک معتبر صحافی نے، جن کے کالم ہم اسی سنجیدگی کے ساتھ پڑھتے ہیں جس سنجیدگی سے وہ لکھتے ہوں گے— اسامہ بن لادن کو اسلامی تاریخ کی عظیم ترین شخصیات میں شامل کیا ہے اور اس کا موازنہ جلال الدین خوارزم شاہ سے کیا ہے جس نے اپنے عہد کی ''سپر پاور'' چنگیز خان کے منگول لشکر سے لی تھی۔ اس موازنے سے اسامہ بن لادن کی عظمت کا ثبوت ملنے کے بجائے ہمیں جلال الدین خوارزم کی اہانت محسوس ہوتی ہے، جس کے ہاتھ دھماکوں میں ہلاک ہونے والے نہتے شہریوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے اور نہ اس نے اسلام کے نام پر چنگیزی روش اختیار کی تھی۔ بہرحال، جلال الدین خوارزم سے پوری ہم دردی رکھنے کے باوجود ہمیں زیادہ صائب رائے اس وقت دہلی پر تخت نشین سلاطین کی معلوم ہوتی ہے جنھوں نے کسی کو اپنی سرحدوں میں داخل ہو کر اس مملکت کی تاراجی کا راستہ دکھانے کی اجازت نہیں دی۔ ''خوارزم پرستی'' کے وفور میں یہ حوالہ بھی ذہن میں رکھا جائے تو رموز مملکت شاید بہتر سمجھ میں آنے لگیں۔ ایک اور کالم نویس صاحب نے فرطِ جذبات کے ساتھ گلہ کیا ہے کہ اسامہ بن لادن کو اخبارات میں شہید کیوں نہیں لکھا جاتا؟ ان سے ہماری درخواست ہے کہ منٹو کا افسانہ ''شہید ساز'' پڑھ کر دیکھ لیں — منٹو کی یہ کہانی بار بار پڑھے جانے کی متقاضی ہے۔

حالات بدستور، ہمارا ارادہ ہے کہ ''دنیا زاد'' کی اشاعت میں تواتر رکھا جائے، صفحوں کی تعداد اور قیمت بھی ہمارے قارئین کے مشوروں کے مطابق ہو۔ ہمیں اس بارے میں بھی آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

میرزا عبدالقادر بیدل
فارسی سے ترجمہ: افضال احمد سیّد

امروزِ نارسیدہ

تصویر حسن و قبح جہاں تاکشیدہ اند
بر رنگ دیدہ اند مقدّم زگال را

جب بھی دنیا کے حسن و قبح کی تصویر کھینچی گئی ہے
رنگ پر سیاہی کو مقدم پایا گیا ہے

خاکِ صحرا موج مے شد از تپیدنہائے دل
چشمِ مستت خونِ این بسمل عجب مستانہ ریخت

دل کے تڑپنے سے صحرا کی خاک شراب کی موج بن گئی
تیری چشمِ مست نے اس بسمل کا خون عجب مستانہ (انداز میں) بہایا ہے

❋

گل جامِ خود عبث به شکستن نمی دهد
صافِ طرب به شیشہ رنگِ پریدہ است

گل اپنا جام یونہی ٹوٹنے نہیں دیتے
شادمانی کی خالص شراب اڑے ہوئے رنگ کے پیمانے میں ہے

❋

ننشست اگر به پهلوئے ما تیر او ز ناز
نقشے به حسرتش ز نئے بوریا بس است

اگر ہمارے پہلو میں (اپنے) غرور کی وجہ اس کا تیر پیوست نہیں ہوا
اس کی حسرت میں بوریئے کے نرسل کا ایک نشان بہت ہے

❋

عالم از خاکسترِ ما موج ساغر می زند
چشمِ مخمورِ که ما را این قدر مستانه سوخت

دنیا ہماری راکھ سے ساغر کی اس قدر مستی کے ساتھ جلایا ہے
کس کی مخمور آنکھوں نے ہمیں اس قدر مستی کے ساتھ جلایا ہے

❋

گر نه شاگردِ جنوں است دلِ بیدلِؔ ما
ابجدِ چاکِ گریباں ز که آموخته است

اگر ہمارے بیدلؔ کا دل جنوں کا شاگرد نہیں ہے
(تو پھر) چاکِ گریبان کی ابجد کس سے سیکھی ہے

❋

خاموشیٔ آں لب بہ حیا داشت سوالے
دادیم دل از دست و نگفتیم : جواب ست

اُن لبوں کی خاموشی حیا کے ساتھ ایک سوال رکھتی تھی
ہم نے دل ہاتھ سے دے دیا اور (اس سے) نہیں کہا (کہ یہ اس کے سوال کا) جواب ہے

❋

الفتِ دل عمر باشد دست و پایم بستہ است
قطرۂ خونے ز سر تا پا حنایم بستہ است

دل کی الفت نے مدّت گزر گئی (کہ) ہمارے دست و پا کو باندھ رکھا ہے
خون کے ایک قطرے نے ہم پر سر سے پاؤں تک حنا باندھ دی ہے

❋

مرا معائنه شد از خطِ شکستۂ موج
که نقشِ پائے هوا سرنوشتِ ایں دریاست

میں نے موج کے خطِ شکستہ سے مشاہدہ کیا
کہ ہوا کا نقشِ پا اس بحر کی سرنوشت ہے

❋

مشقِ اسرارِ دبستانِ ادب پُرنازک است
نامِ لغزش تا نوشت، خامه از مسطر گذشت

ادب کے مکتب کی مشقِ اسرار بہت زیادہ نازک ہے
جب تک لغزش کا لفظ لکھا گیا، قلم مسطر سے ہٹ گیا

به چشمِ کم منگر بیدلِؔ ستم زده را
که آبروئے محبّت به دیدۂ نمِ اوست

ستم زدہ بیدؔل کو حقارت سے مت دیکھ
کہ محبت کی آبرو اس کی نم ناک آنکھوں سے ہے

صبر کن اے شیشه برسنگِ جفائے محتسب
گردنِ ایں دشمنِ عشرت، خدا خواهد شکست

اے شیشہ محتسب کے ظلم کے پتھر پر صبر کر
خدا اس دشمنِ عشرت کی گردن توڑے گا

خیرگیہائے نظر محوِ نقاب آرائی است
ورنه هر گز، لیلیٰ آزادِ ما، محمل نداشت

نظر کی شوخی نقاب سجانے میں محو ہے
ورنہ کبھی بھی ہماری آزاد لیلیٰ کا (کوئی) محمل نہیں تھا

غمِ تحیّرِ حسنِ قبول باید خورد
نه هر که آئینه پرداخت بابِ دیدار است

حسنِ قبول کے تحیّر کا غم کھانا چاہیے
ایسا نہیں ہے کہ جس نے بھی آئینہ سنبھال لیا (وہ) دیدار کا اہل ہے

٭

به عالمے که نگاهِ تو نشّه طوفاں است
ز خویش رفتنِ ما ، موجِ بادہ عنبی است

اس دنیا میں کہ جہاں تیری نگاہ سے نشے کا طوفان (آیا ہوا) ہے
ہمارا خود سے گزر جانا بادۂ انگور کی موج ہے

٭

ترحم است بر آں دل که گاهِ عرض و نیاز
ز بے نیازئ فریاد رس گداخته است

اس دل پر رحم آتا کہ عرض و نیاز کے وقت
فریاد سننے والے کی بے نیازی سے ٹوٹ گیا ہے

❋

کو دلے کز ہوس آرائشِ دکانش نیست
در صفاخانۂ ہر آئینہ، بازارے ہست

کون سا دل ہے جس میں ہوس کی دکان نہیں سجی ہوئی ہے
ہر آئینے کے صفا خانے میں ایک بازار (آباد) ہے

❋

بہ ہجر زندہ ام آئینہ پیشِ من مگذار
جدا ز یار بخود روبرو شدن ستم است

ہجر میں زندہ ہوں، میرے سامنے آئینہ مت رکھ
یار سے جدا (ہو کر) اپنے روبرو ہونا ستم ہے

چشم وا کن رنگِ اسرارِ دگر دارد بہار
آں چہ در وہمت نگنجد، جلوہ گر دارد بہار

آنکھیں کھول، بہار میں اور ہی اسرار کے رنگ ہیں
جو تیرے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتا، بہار اس کا جلوہ دکھارہی ہے

مخور فریبِ مرّوت ز چرخ مینارنگ
کہ جائے بادہ از ایں شیشہ سنگ می بارد

مینا کی شکل جیسے آسماں سے احسان (کرنے) کا فریب مت کھا
کہ شراب کے بجائے اس شیشے سے پتھر برستے ہیں

❊

جهاں جوشِ بهارے بے نیازی ست
به یک صورت دو گل کم آفریدند

دنیا بے نیازی کی بہار کی مستی ہے
ایک ہی صورت کے دو پھول کم پیدا کیے ہیں

❊

وقت است که بر بیکسئی عشق بگرئیم
که ایں شعله ز خار و خسِ ما خاک نیش شد

وقت آ گیا ہے کہ (ہم) عشق کی بے کسی پر روئیں
کہ یہ شعلہ ہمارے خار وخس کی وجہ سے خاک میں دب گیا

❋

به قبولِ آں کفِ نازنیں که کند شفاعتِ خونِ من
درِ صبر می زنم آں قدر که بهارِ رنگِ حنا رسد

میرے خون کو شرفِ قبولیت بخشنے کی اُس کفِ نازنیں سے سفارش کون کرتا
صبر کا دروازہ اس قدر پیٹتا ہوں کہ رنگِ حنا کی بہار آ پہنچتی ہے

❋

در پرده بود صورتِ موهوم هستیم
آئینۂ خیالِ تو افشائے راز کرد

میری ہستی کی موہوم صورت پردے میں تھی
تیرے خیال کے آئینے نے راز کو افشا کر دیا

❊

در احتیاج بر درِ بیگانه خاک شو
اما مکن نظر به رخِ آشنا بلند

حاجت آ پڑنے پر بیگانے کے دروازے پر خاک ہو جا
لیکن (کسی) آشنا کے چہرے کی طرف نظر نہ اٹھا

❊

ملکے ست بیکسی که در آں جا غریبِ یاس
گر می شود شهید ، ستمکش نمی شود

ایک ملک ہے بے کسی کہ جس میں غریبِ یاس
اگر شہید (بھی) ہو جائے مظلوم نہیں ہو پاتا

❋

بیدلؔ به عرضِ جوهرِ اسرارِ خوب و زشت
آئینۂ به صفحۂ سیما نمی رسد

بیدل اچھے اور برے کے راز کی حقیقت کو ظاہر کرنے میں
ایک آئینہ بھی پیشانی کے صفحہ کو نہیں پہنچتا

❋

رفعِ کدورتِ دو جهان سودنِ کفے ست
آزادگاں به آبِ گهر دست شته اند

ہاتھ ملنا دونوں جہاں کی آلودگی کو دور کرنا ہے
آزادگاں نے آبِ گہر سے ہاتھوں کو دھویا ہے

❋

این است اگر حقیقتِ نیرنگِ وعده ات
مائیم و فرصتے که به فردا نمی رسد

اگر تیرے وعدہ کے طلسم کی اصلیت یہی ہے
ہم ہیں اور وہ فرصت کہ آئندہ کل تک نہیں پہنچتی

❋

صد نگارستانِ چیں با بے خودی طے کردہ ام
لغزشِ پا هم به راهت، خامه بهزاد بود

بے خودی میں سینکڑوں نگارستان چین طے کر چکا ہوں
تیری راہ میں ہماری لغزشِ پا بھی بہزاد کا موقلم تھی

❋

هیهات که در انجمنِ عبرتِ تحقیق
بر روئے کسے باز نشد بندِ قبائیش

افسوس کہ عبرتِ تحقیق کی انجمن میں
کسی کے سامنے اس کی قبا کا بند نہیں کھلا

❋

دریں ستمکده گوئے دگر نمی باشد
سرِ بریدۂ ما می کند به میدان رقص

اس ستمکدے میں اور کوئی گیند نہیں رہی ہوگی
(کہ) ہمارا کٹا ہوا سر میدان میں رقص کررہا ہے

❋

هوس هزار گل و لاله گو بهم سائد
کفت همان ز حنائے نبسته دارد رنگ

ہوس اگر چہ ہزار گل و لالہ کو ایک ساتھ پیس ڈالے
تیرے ہاتھوں میں اسی نہ بندھی ہوئی حنا کا رنگ ہے

❋

گفتم: چه سازم با ربطِ هستی
آزاد طبعان گفتند: بگسل

کہا: ہستی سے تعلق کا کیا کروں
آزاد طبیعت رکھنے والوں نے کہا: توڑ دے

❋

هزار شکر که آخر ز حسنِ سعی وفا
حنائے پائے تو گردید اشکِ رنگینم

ہزار شکر کہ آخر وفا کی کوشش کی بہار سے
میرا اشکِ رنگیں تیرے پاؤں کی حنا بن گیا

❋

حیرتے دارم ز اسبابِ جہاں درکار و بس
نقشِ دیوار است چوں آئینہ رختِ خانہ ام

اسبابِ جہاں میں سے بس حیرت ہی مجھے درکار ہے
آئینے کی طرح دیوار کا نقش (ہی) میرے گھر کا ساز و سامان ہے

❋

محمل و قافله و ناقه دریں وحشت گاه
گردے از بانگِ درائے ست که من می دانم

محمل اور قافلہ اور ناقہ اس وحشت گاہ میں
ایک بانگِ درا کی گرد ہے (جسے) کہ میں (ہی) جانتا ہوں

❋

بود عمرے به برم دلبرِ نکشوده نقاب
بیدلؔ ایں نیز ادائے ست که من می دانم

ایک مدّت تک (میری) دلبر نقاب اتارے بغیر میری آغوش میں آتی رہی
بیدلؔ یہ بھی ایک ادا ہے کہ (جسے) میں (ہی) جانتا ہوں

❋

ز نقشِ پائے تو بوئے بہار می آید
بیا کہ جبہہ نہم بر زمیں و گل چینم

تیرے نقشِ پا سے بہار کی خوشبو آتی ہے
آ جا کہ (میں) زمین پر پیشانی جھکاؤں اور پھول چنوں

❋

ز خوابِ نازِ ہستی غافلم لیک ایں قدر دانم
کہ ہر کس می برد نامِ تو ، من بیدار می گردم

ہستی کے خوابِ ناز میں غافل (پڑا) ہوں لیکن اتنا جانتا ہوں
کہ (جب) کوئی بھی تیرا نام لیتا ہے، میں بیدار ہو جاتا ہوں

❊

کو لغزشِ پائے کہ بہ ناموسِ وفایت
بارِ دو جہاں گیرم و بردوشِ خود افتم

لغزشِ پا کہاں کی کہ تیری وفا کے ناموس کے لیے
دو جہاں کا بار اٹھاتا ہوں اور اپنے کاندھے پر ڈال لیتا ہوں

❊

بیدلؔ ز سحرکاریٔ طولِ امل مپرس
کہ امروزِ نارسیدہ بہ فردا رسانده ایم

بیدلؔ امید کی درازی کی سحرکاری کو نہ پوچھ
کہ (ہم نے) نہ آئے ہوئے آج کو آنے والے کل تک پہنچا دیا ہے

تا خونِ من از خواب به صد حشر نخیزد
در سایهٔ مژگانِ تو کردند شهیدم

تا کہ میرا خون نیند سے سو قیامت تک (بھی) نہ اٹھے
مجھے تیری مژگاں کے سائے میں شہید کیا گیا ہے

ایں عالمِ آشفته که هستی ست غبارش
رنگے ست که من صبحِ ازل باخته بودم

یہ پریشاں حال دنیا کہ ہستی جس کا غبار ہے
ایک رنگ ہے (جسے) کہ میں نے صبحِ ازل اڑا دیا تھا

ہر جزوم از شکستہ دلی موج می زند
من شیشہ ریزہ ام، حذر از پائے مالی ام

میرا ہر جزو شکستہ دلی سے موج مار رہا ہے
میں شیشہ ریزہ ہوں، میری پائمالی سے حذر کر

من و دلبر بہم نقشے ببستیم از ہم آغوشی
ز نقاشِ ازل زیں رنگ یک تصویر می خواہم

میں اور دلبر مل کر ہم آغوشی کا ایک نقش باندھیں
نقاشِ ازل سے اس طرح کی ایک تصویر چاہتا ہوں

❋

در دشتِ توہم جہتے نیست معین
ما را چہ ضرور است بدانیم، کجاییم

توہم کے دشت میں جہت معین نہیں ہے
ہمیں کیا ضرور ہے کہ جانیں، کہاں ہیں

❋

می دھم خودرا بہ یادش تا فراموشم کند
مصرعۂ در رنگِ مضمونِ تغافل بستہ ام

خود کو اس کی یاد کے سپرد کرتا ہوں تا کہ (وہ) مجھے بھول جائے
(میں نے) مضمونِ تغافل کے رنگ میں ایک مصرعہ باندھا ہے

❁

از طبعِ بے تعلق ، حیراں کارِ خویشم
ایں صفحہ نقش نگرفت یا من رقم نکردم

بے تعلق طبیعت (کی وجہ) سے اپنے معاملے میں حیراں ہوں
اس صفحہ نے تحریر نہیں قبول کی یا میں نے لکھا (ہی) نہیں

❁

آبرو می طلبی، ترکِ طمع کن بیدلؔ
ایں دو تمثال بہ ہیچ آئینہ ننشست بہم

(تو) آبرو چاہتا ہے (اے) بیدلؔ طمع کو ترک کر
یہ دو شکلیں کسی بھی آئینے میں ایک ساتھ نہیں سماتیں

❊

سخنے ز پردہ شنیدہ ام، بہ حضورِ دل نرسیدہ ام
چہ نمایم آں چہ ندیدہ ام تو بپرس از آئینہ سازِ من

ایک بات پردے میں سے سنی ہے، دل کے حضور میں نہیں پہنچا ہوں
وہ کیسے دکھاؤں جسے دیکھا نہیں، (یہ) تو میرے آئینہ ساز سے پوچھ

❊

ہر چند خاکِ من بہ غبارِ فنا رود
اے حسرتِ وصال تو دامن مچیں ز من

ہر چند میری خاک فنا کے غبار کے ساتھ (اڑی) جا رہی ہے
(لیکن) اے وصل کی حسرت تو مجھ سے دامن نہ چھڑا

❊

آفتِ رنگِ حنا دست بهم سوده مباد
خونِ عاشق گنهے نیست ، پشیماں نشوی

ہاتھ ملنا رنگِ حنا کے لیے آفت نہ بن جائے
عاشق کا خون کوئی گناہ نہیں ہے، پشیمان مت ہو

❊

در ملکِ قناعت به مه و مهر مپرداز
گر نانِ شبے هست و چراغِ سرِ شامے

ملکِ قناعت میں مہ و مہر کی طرف توجہ مت دے
اگر (تجھے) رات کی روٹی اور شام کا چراغ (میسّر) ہے

شمس الرحمن فاروقی

قبض زماں

شیخ ابن سکینہ نے فرمایا۔۔اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ اپنے کسی بندے کے لئے زمانے کو پھیلا دے اور وقت کو دراز کردے، جب کہ وہ دوسروں کے لیے بدستورکوتاہ رہے اسی طرح، اللہ تعالیٰ کبھی قبض زماں فرماتا ہے کہ زمانۂ دراز کوتاہ معلوم ہوتا ہے۔

کنز الکرامات، یعنی مولاناجامی کی نفخات الأنس سے چند کرامات کا اردو ترجمہ، از حامد حسن قادری

میں بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا، اس وجہ سے نہیں کہ میرے ذہن میں کوئی خلفشار تھا یا دل میں کوئی خلش تھی۔ کبھی کبھی شام ڈھلتے ہی اور بستر پر جانے کے پہلے احساس ہو جاتا ہے کہ آج کی رات نیند نہ آئے گی۔ مجھے کیفی اعظمی کے مصرعے یاد آئے، لیکن یہ خیال میں نہ آسکا کہ میں نے انھیں کب اور کہاں پڑھا تھا۔

آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی
آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے

ہم ہندوستانیوں کے لیے گرمی سے بہت زیادہ سردی آزار رساں ہے (کم از میرا تو یہی خیال ہے) لیکن ہم گرم ملک کے رہنے والے، مئی جون کی کٹھور دھوپ میں چٹیل میدانوں میں ننگے پاؤں چلنے والے، ہمیں گرمی۔۔۔اف گرمی۔۔۔لگتا ہے آسمان سے آگ برس رہی ہے۔۔۔زمین یوں تپ رہی ہے کہ دانہ ڈالو تو بھن جائے۔۔۔وہ دھوپ ہے کہ چیل انڈا چھوڑتی ہے (یہ محاورہ میں نے بچپن میں کہیں پڑھا تھا، اب تو سننے میں بھی نہیں آتا، لیکن اسی وقت سے مجھے خلجان رہتا تھا کہ آخر چیل ہی

کیوں؟اورانڈا چھوڑنے کے کیا معنی ہیں؟ اگر یہ کہ چیل انڈے پر بیٹھی تھی اور اب اسے انڈے کو سینے کی ضرورت نہیں بھی کہ گرمی کے مارے انڈا خود ہی سے جائے گا،تو پھر بہت سے پرندے ایسے ہوں گے،بچاری چیل ہی کیوں؟شاید اس لیے کہ چیلیں صرف مئی جون میں انڈا دیتی ہیں؟مگر یہ بات کچھ دل کو لگتی نہیں۔اس وقت تو نہیں سمجھ سکا تھا،لیکن ذرا علم لسان کی شد بد ہوئی تو معلوم ہوا کہ زبان یوں ہی الل ٹپ ہوتی ہے۔لفظ ''الل ٹپ'' سے اب شاید بہت سے لوگ واقف نہ ہوں،اس لیے اس کا انگریزی ترجمہ arbitrary عرض کیے دیتا ہوں(گویا اس لفظ کے جاننے والے بہت سے ہوں گے)...بچپن میں ایک بار''الف لیلہ''(اب اس کو کیا کیجئے کہ بہت سے پڑھے لکھے لوگ اسے ''الف لیلیٰ'' سمجھتے ہیں،یعنی شاید الف ب کی وہ کتاب جسے لیلیٰ پڑھتی تھی)...خیر میں اسی ''الف لیلیٰ'' کی سند باد جہازی والی کہانی فارسی میں پڑھ رہا تھا۔کہانی یوں شروع ہوتی تھی کہ اس دن اس قدر گرمی اور تپش تھی کہ''جگر حربا می سوخت۔''بھلا یہ ''حربا'' کون ہے؟مولوی صاحب نے بتایا کہ اسے اردو میں ''گرگٹ'' کہتے ہیں(بلکہ ہماری طرف تو اسے ''گرگٹان'' کہتے تھے،شاید اس لیے کہ اس طرح گرگٹ اور زیادہ زہریلا معلوم ہوتا تھا۔) اس وقت بھی مجھے یہ فکر لگی تھی کہ آخر بچارا گرگٹان ہی کیوں؟اور بھی تو ایسے جانور ہوں گے جنھیں گرمی بہت لگتی ہوگی؟لیکن یہ معما اب تک حل نہ ہوا۔مجھے زوالوجی(Zoology) پڑھنی چاہیے تھی۔(آج کل بہت سے لوگ اسے ''جولاجی'' کہتے ہیں۔پھر فرق کیا پڑتا ہے؟علم تو وہی ہے۔)

کیفی صاحب مرحوم کی نظم (اگر یہ نظم ان کی ہے) کے دو مصرعوں نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔یہ بہر حال حقیقت تھی کہ مجھے نیند نہیں آرہی تھی،اور ہوا بھی کچھ گرم تھی۔آخر اپریل کی رات تھی،مئی جون نہ سہی،اور میں اپنے آبائی گاؤں کے آبائی مکان کے دروازے پر دور تک پھیلی ہوئی کھلی زمین پر نیم کے نیچے سو رہا...نہیں، بلکہ سونے کی کوشش کر رہا تھا۔پرانی وضع کا بھاری پلنگ،جسے کئی لوگ مل کر میری خاطر اٹھا کر اندر میری دادی کے کمرے سے لے آئے تھے۔اس کی نواڑ ابھی اچھی حالت میں تھی،دادی کے زمانے کی دریاں اور چادریں بھی مہیا تھیں۔دادی کا زمانہ؟اب ان کو غریق رحمت ہوئے چھ دہائیوں سے زیادہ گذر چکی تھیں۔خاندان کے لڑکے لڑکیاں جواب کم و بیش تمام دنیا میں پھیلے ہوئے تھے،ان کے لیے ساٹھ برس سے بہت کم کی مدت بھی قبل تاریخ کا زمانہ معلوم ہوتی تھی۔فرینک کرموڈ نے کہیں لکھا ہے کہ آج کل کے طالب علم کے لیے ہر کتاب قبل تاریخ کے زمانے کی ہے اگر وہ پندرہ،یا اس سے زیادہ برس پہلے لکھی گئی تھی۔

دادی کے زمانے میں ان کے پلنگ، بلکہ سبھی کے پلنگ کھٹملوں کا صدر مقام تھے۔تمام رات انھیں کاٹتے گذرتی تھی مگر ہم لوگوں کی رات بے کھٹکے جاتی تھی کیوں کہ ہماری نیندیں ایسی نہ تھیں کہ کوئی کھٹمل، کوئی مچھر، انھیں فتح کر سکے، یا ان کی دیواروں میں ذرا سا رخنہ ہی ڈال دے۔ لیکن میر کا شعر اکثر میرے ایک چچازاد بھائی کی زبان پر اکثر رہتا تھا ۔

آخرش شام سے ہو شب بیدار
کھیلتا ہوں میں کھٹملوں کا شکار

خدا جانے اس پلنگ میں مچھروں کے کتنے شہر، کتنے قلعے، کتنی فصیلیں اب بھی باقی ہوں گی۔ مجھے تو ابھی کچھ خاموشی ہی لگ رہی تھی لیکن اس خاموشی کا کچھ اعتبار نہیں۔ نہ جانے کب، کس طرف سے حملہ کر دیں۔ مجھے یاد آیا کہ امریکہ کے بعض جنوبی شہروں میں ہندوستان پاکستان کے لوگ ٹریفک پولیس والوں کو اسی لیے کھٹمل کہتے ہیں کہ خدا جانے کہاں سے بالکل اچانک برآمد ہو کر آپ کا پیچھا کرنے لگتے ہیں۔ اور اگر ایک بار وہ آپ کے تعاقب میں لگ گئے تو آپ ان سے بچ نہیں سکتے۔ وہ آپ کا چالان کر ہی کے چھوڑیں گے۔

ہمارے آبائی گھر کے آگے کوئی صدر دروازہ یا چہار دیواری نہ تھی، پتہ نہیں کیوں۔ دور تک بنجر زمینیں، کچھ کھیت اور دو چار پرانے پرانے درخت تھے۔ رات میں باہر سونے والوں کو وسعت، بلکہ غیر دلچسپ لیکن بے پروا وسعت کا احساس ہوتا تھا۔ (یہ بات میں اپنی طرف سے کہہ رہا ہوں، کیونکہ اس وقت بھلا کون دس برس کے بچے پر اپنے تاثرات ظاہر کرتا، اور خود میں کبھی اکیلا کھلے میں سویا نہ تھا۔) مجھے تو وہ سارا منظر مجھ سے، لہٰذا ہم انسانوں کی زندگی سے بے نیاز لگتا تھا۔ گویا اسے کوئی غرض نہ ہو کہ یہاں کون سو رہا ہے، کون جاگ رہا ہے، کون جلد اٹھنے والا ہے، کون دن چڑھے تک سوتا رہے گا۔ لیکن ذرا ٹھہریئے۔ اس زمانے میں ہمارے دروازے پر سونے والوں میں کس کی مجال تھی کہ دن چڑھے تک سوتا رہتا؟ اور کچھ نہیں تو بدلتی ہوئی ہوا کی بے خوابی، دل شب کے طے ہو جانے کے بعد اس کا بتدریج ہلکا پڑتا ہوا بہاؤ، اس کی بے چین آواز میں کمی، اندھیرے کی آہستہ، بہت آہستہ پسپائی، افق کے دھیرے دھیرے نزدیک آتے چلنے کا احساس، جو شعور کی کسی بہت گہری سطح پر سیاہی کی ٹھوس دیوار کا کسی بہت ہی نامحسوس لیکن یقینی عمل کے اثر سے ملگجے پتوں اور سرکنڈوں کی ڈالیوں کے گچھے اور پھر ہلکے سبز ارتعاش میں بدلتا دکھائی دیتا ہے، یہ سب اور بہت سی باتیں الفاظ جن کا بیان نہیں ہو سکتا، ان کے ہوتے ہوئے کھلے آسمان تلے کشادہ زمین پر سونے والا دن چڑھے

تک سو بھی کہاں سکتا تھا؟

اب تو ہمارے بھی شہروں میں آسمان پردہ پوش رہنے لگا ہے۔اور میں اس جگہ سے آیا تھا جہاں اگر کبھی ستارے دکھائی دے جائیں تو اسے قابل ذکر واقعہ خیال کیا جاتا ہے۔اور یہاں کا عالم نہ پوچھیے۔آدھا چاند آسمان پر، نیم کی چھوٹی پتیوں کا جھرمٹ بنائے ہوئے پیڑ کی شاخیں، ہوا ذرا سی بھی سنکتی تو چاند کی ایک آدھ کرن مجھ تک پہنچ ہی جاتی۔مجھے ناسخ کا شعر یاد آیا ۔

ہجر میں اب کس طرح بے یار جاؤں باغ کو

سارے پتوں کو بنا دیتی ہے خنجر چاندنی

میرے وطن اقامت و اختیاری میں تو ہم لوگ کام کے لیے نکلتے تھے تو روشنی پوری طرح پھیلی نہ ہوتی تھی۔کسی کو بیس میل جانا تھا، کسی کو پچیس میل، کسی کو اور بھی دور۔صاحب استطاعت اور ہم لوگوں سے بھی زیادہ کابل تر لوگوں کے پاس ہیلی کاپٹر تھے۔وہ ہم لوگوں سے بہت بعد میں نکلتے تو تھے،لیکن لفٹ کے ذریعہ چھت پر جانے کے پہلے وہ اپنی خواب گاہوں یا طعام خانوں میں ہوتے۔چاند انھیں بھی نہ دکھائی دیتا۔اور واپسی تک تو سب کے لیے شام اچھی طرح پھول ہی چکی ہوتی تھی۔سب لوگ اوپر کی فضا سے بے خبر (بشرطیکہ کہیں آندھی نہ آئی ہو)اپنی اپنی محفوظ دنیاؤں میں واپس چلے جاتے تھے۔

''زندہ غنودگی''، مجھے رابرٹ لوئیس اسٹیونسن (Robert Louis Stevenson) کی بات یاد آئی۔فرانس کے نیم کوہستانی علاقوں میں تنہا گھومتے پھرنے اور جگہ جگہ کا ذائقہ چکھنے کے بعد (جس میں کھلے آسمان کے نیچے کئی راتیں گذارنے کا مزا بھی شامل تھا)اس نے ایک سفر نامہ نما چھوٹی سی کتاب لکھی ۔اس میں کھلے میں رات گذارنے کا بیان ایک جگہ لکھا ہے اور ایسا لکھ دیا ہے کہ میں سو برس بھی کوشش کروں تو نہیں لکھ سکتا۔اسی میں یہ فقرہ Living slumber (زندہ غنودگی) بھی ہے۔مگر میں کہاں کا شاعر یا افسانہ نگار کہ اسٹیونسن یا کسی اور کی طرح لکھنے کا ارمان رکھوں۔مسعود حسن رضوی ادیب صاحب مرحوم نے لکھا ہے کہ انھوں نے اسٹیونسن کا اثر قبول کیا ہے۔بے شک۔ان کی نثر ایسی شستہ اور سجل اور رواں ہے کہ بس پڑھتے جائیے۔

نیند تو مجھے بہر حال نہ آرہی تھی۔مجھے یاد آیا کہ ہمارے گھر کے سامنے کچھ فاصلے پر،یعنی سبحان اللہ دادا کے مکان کے پیچھے ایک بڑا چھتنار اور جسیم درخت تھا۔یہ یاد نہیں کہ کاہے کا پیڑ تھا،بس راتوں کو ایسا لگتا تھا کہ وہ درخت کچھ نزدیک آگیا ہے۔ہم لوگوں میں مشہور تھا کہ اس پیڑ پر

ایک برم رہتا ہے جو ہر آنے جانے والے کو، اور خاص کر آٹھ دس برس کی عمر کے لڑکوں کو للچائی ہوئی نظر سے دیکھتا رہتا ہے۔ تو وہ کیا چاہتا ہے؟ اس بات کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ الگ الگ قیاس آرائیاں تھیں۔ کوئی کہتا وہ جس کو پکڑ لے اسے بھی اپنی طرح کا برم بنا لے گا۔ اور اسی لیے اسے لڑکوں کی زیادہ ہوس تھی کہ وہ آسانی سے برم بن جائیں گے۔ کوئی کہتا نہیں، اس کے بدن پر کھال اور ہڈیاں ہیں، اور کچھ نہیں ہے۔ اس کا منصوبہ ہمیشہ یہی رہتا ہے کہ کسی کو پکڑ پائے تو اس کا گوشت اپنے بدن پر چڑھا لے۔ لڑکوں کو پسند کرنے کا منشا یہی تھا کہ ان کا گوشت نرم ہوتا ہے۔ ایک لڑکا کہتا تھا کہ نہیں، وہ برم کسی وجہ سے اس درخت میں قید ہے۔ اسے کسی انسان کی ضرورت اس لیے ہے کہ وہ راتوں کو اس پر سوار ہو کر دور دور کے گاؤں جا کر مویشیوں اور انسانوں کا خون کر سکتا تھا۔ سنا گیا کہ ایک بار برم نے ایک نوجوان کسان کو پکڑ ہی لیا تھا۔ اس نے کہا کہ تو میری راتوں کی سواری بن جائے تو میں تجھے گھوڑے کی طرح طاقت ور بنا دوں گا۔ دن بھر اپنی کھیتی کسانی آسانی سے کرتے رہیو۔ کسی جھگڑے لڑائی میں بھی کوئی تجھ پر قابو نہ پا سکے گا۔ وہ کسان اس کے چنگل سے چھوٹا کیسے، یہ بات کسی کو نہ معلوم تھی۔ شاید ہمارے دادا نے اسے کوئی تعویذ پہنا دیا تھا کہ ایسے ہی کسی سنکٹ میں کام آئے۔

سنا ہے بہت دن پہلے ہمارے دادا کا ایک کارندہ راتوں کو کھلیان کی حفاظت پر مامور تھا۔ ایک دن وہ ٹھٹھرتا، کانپتا آیا، جیسے اسے جاڑا دے کر بخار چڑھا ہو۔ اس نے دادا سے کہا کہ مولوی جی، میں اب کھلیان کی رکھوالی نہ کروں گا۔ سامنے والے پیڑ میں ایک بیتال آ گیا ہے۔ وہ مجھے رات بھر دانت دکھا دکھا کر کھیسیاتا رہا اور کہتا رہا کہ کل تجھے نہ چھوڑوں گا۔ دادا نے اس کی پیٹھ ٹھونکی اور ایک تعویذ اسے لکھ دیا اور کہا کہ لے اسے گلے میں پہن لے۔ جا، اب وہ بیتال تیرا کچھ نہ بگاڑے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ ہمارے ایک بڑی عمر کے چچا زاد بھائی قسم کھا کر کہتے تھے کہ دادا نے تعویذ میں بھوجپوری زبان میں یہ لکھا تھا کہ دیکھو جی، یہ آدمی ہمارا رکھوالا ہے۔ کوئی اس سے ہرگز کچھ تعرض نہ کرے۔

واللہ اعلم یہ بیان سچا ہے کہ جھوٹا، لیکن مجھے اس بات میں کوئی شک نہیں گھر کے سامنے کا برم والا پیڑ رات کو کچھ نزدیک اس لیے لگتا تھا کہ وہ برم اسی پیڑ کو اپنی سواری بنا ڈالنے کی کوشش میں اسے کچھ آگے پیچھے کرتا رہتا تھا۔

آج رات وہ گھنا کالا پہاڑ جیسا پیڑ مجھے دکھائی نہ دیتا تھا۔ سامنے سبحان اللہ دادا کا گھر

سہ منزلہ ہو گیا تھا اور پیچھے کی تمام وسعتیں، تمام شجر حجر کی آبادیاں نظر سے اوجھل ہو گئی تھیں۔ صبح اگر میں بچ رہا تو دن کی چمکتی نیلی دھوپ میں جا کر اس پیڑ کو ضرور دیکھوں گا۔

بچ رہا؟ کیا مطلب؟ کیا میں خرچ ہو رہا ہوں، یا گھٹتا جا رہا ہوں کہ بچ رہنے کیا بات میرے ذہن میں آئی؟ میں تو بس کل بھر کے لیے یہاں ہوں۔ شاید میں کہنا چاہ رہا تھا ''ٹھہر گیا'' اور کسی وجہ سے، شاید نیند کے کسی جھونکے میں ''بچ رہا'' کہہ گیا تھا۔ یہاں کوئی ڈر کی بات تو ہے نہیں۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ بچپن میں ان سب بھوت، بیتال، برم، چڑیل وغیرہ کی باتوں سے ہمیں (یا کم سے کم مجھے) موت کا خوف نہ آتا تھا۔ وہ خوف تو عجب طرح کا تھا، کسی جنس غیر کے قبضے میں چلے جانے کا، گرفتار ہو جانے کا خوف، انجانی شے کا خوف۔ موت ان میں سے کسی مد حساب میں نہ تھی۔ بے شک ہم لوگوں نے سنسان یا اجنبی گھروں کے آسیب زدہ ہونے کے بارے میں کئی ڈراونی کہانیاں پڑھی تھیں اور ان میں سے اکثر کا انجام کسی نڈر شخص کی موت پر ہوتا تھا، لیکن اپنے اصلی اور حقیقی بھوتوں پریتوں سے ہمیں موت کا ڈر نہ تھا۔

مثلاً ایک قصہ جو میں نے پڑھا تھا وہ اس طرح تھا کہ ایک شخص کسی اجنبی جگہ مہمان اترتا ہے، اور اسے رات رہنے کے لیے جو کمرہ دیا جاتا ہے وہ اسے ناپسند کر کے بخیال خود ایک زیادہ پُرفضا کمرہ اختیار کرتا ہے، در حالے کہ میزبان اسے متنبہ کرتا ہے کہ اس کمرے میں کوئی آسیب ہے۔ خیر، وہ مہمان ہنسی خوشی اس کمرے میں شب باشی کے لیے جا کر کمرہ اندر سے بند کر لیتا ہے۔ جب دن چڑھ آنے کے بہت دیر بعد تک دروازہ نہیں کھلتا اور نہ دروازہ کھٹکھٹانے کا کوئی نتیجہ نکلتا ہے تو دروازہ توڑ کر لوگ اندر داخل ہوتے ہیں۔ مہمان وہاں موجود تو ہے، لیکن وہ گھٹنوں کے بل ہے، اس کے دونوں ہاتھ آگے بڑھے ہوئے ہیں، گویا وہ کسی چیز کو روکنا یا پیچھے دھکیلنا چاہتا ہے۔ یا کسی چیز سے منت کر رہا ہے کہ اور آگے نہ آؤ۔ اس کی آنکھیں بند ہیں لیکن چہرہ وفور خوف سے ٹیڑھا ہو رہا ہے۔ میزبان اسے جلد از جلد اسپتال لے جاتا ہے لیکن راستے ہی میں مہمان کی موت ہو جاتی ہے۔

اس طرح کی خرافات سے ہم لوگوں کا دماغ ان دنوں کسی بھوت بنگلہ جیسی چیز سے کم نہ تھا۔ اب میں خیال کرتا ہوں تو زیادہ خوف (کم از کم مجھے) جنون کا تھا، کہ ایسی باتیں مجھ پر گذریں تو میں ہوش حواس کھو کر پاگل یا مجذوب ہو جاؤں گا۔ مجھے سڑک پر گھومنے والے پاگل یا فاتر العقل لوگوں اور شراب کے نشے میں چور لوگوں سے بہت ڈر لگتا تھا۔ ہمارے شہر میں ایک عورت سڑکوں پر

آوارہ پھرتی تھی، خدا معلوم بوڑھی تھی کہ ادھیڑ، لیکن اس کے سر پر تھوڑے بہت بال جو تھے وہ سیاہ تھے۔ ایک گندہ، پیلا سا کرتا اور ویسا ہی آڑا پاجامہ اس کا لباس تھے۔ وہ پان بے انتہا کھاتی، اس کے منھ سے پان کی پیک مسلسل ٹپکتی رہتی تھی اور اس کا گریبان دور تک بالکل سرخ رہتا تھا۔ ایک بار میں اپنے خیالوں میں گم (اس وقت میں کوئی دس برس کا تھا لیکن خیالوں میں گم رہ کر راستہ چلنا میری عادت تھی۔ اس زمانے میں سڑکوں پر صرف پیدل راہگیر، یا سائیکل سوار، یا اکا دکا رکشے اور یکے ہوتے تھے) کہیں سے چلا آرہا تھا کہ گھر کے پاس ہی اچانک کسی چیز سے ٹکرا گیا۔ چونک کر اوپر دیکھا تو وہی مجنونہ تھی۔ بظاہر اس پر اس بات کا کوئی اثر نہ تھا کہ میں اس سے ٹکرا گیا تھا۔ وہ مجھے بالکل خالی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی لیکن راستہ اس نے پھر بھی نہ چھوڑا تھا۔ میرے منھ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور اس کا راستہ کاٹ کر اندھا دھند گھر کو بھاگا۔

میں بھی کس قدر بچکانہ مزاج کا شخص ہوں۔ اتنی عمر ہونے کو آئی لیکن چھ ساڑھے چھ دہائی پہلے کی وہ سب باتیں کہیں نہ کہیں دل میں کھبی ہوئی ہیں۔ وہ اتنی دور بھی نہیں ہیں کہ ان کو کھینچ کر ہوش کی سطح پر آجانے میں کچھ دیر لگے، یا سوچنا اور خود کو کھنگالنا پڑے۔ ایک زمانے میں مجھے بھوت پریت، مافوق العادت یا مافوق الفطرت باتوں اور واقعات، خوف اور گھناونے پن والے واقعات (مثلاً آدم خوری) پر مبنی افسانے پڑھنے کی بہت چینک تھی۔ اب بھی میرے پاس ایسے افسانوں کے مجموعوں اور ناولوں کا بڑا ذخیرہ ہے، اگرچہ ایک بار میں نے جگہ کی تنگی کے باعث ایسی بہت ساری کتابوں کو دے ڈالیں (جس کا اب تک مجھے افسوس ہے) پھر بھی، اس وقت میرے پاس اچھی خاصی لائبریری باقی رہ گئی جس میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہی ہوتا رہا ہے۔

مجھے نیند تو آرہی ہے، لیکن بہت ہی ہلکی سی۔ شاید یہ نیند نہیں ہے، میرا تھکا ہوا ذہن ہے۔ انگریز شاعر ٹامس لو پیکاک (Thomas Love Peacock) کی بہت سی نظمیں بھوتوں کے بارے میں ہیں۔ (Peacock)، بھلا یہ بھی کوئی نام ہوا، مگر انگریزوں میں ایسے، بلکہ ان سے بھی بڑھ کر عجیب نام ہوتے ہیں۔ ایک اور شاعر صاحب کا نام تھا John Drinkwater، اور Long اور Short نام تو اب بھی بہت سننے میں آتے ہیں۔ بلیک (Black, Blake)، وائٹ (White, Wight)، گرے (Gray, Gray)، ڈارک (Dark)، گرین (Green, Greene)، یہ نام بھی شاذ نہیں ہیں۔ ٹائگر (Tiger) اور اسنیک (Snake) میں نے نہیں دیکھے، لیکن اٹھارویں صدی کے مشہور ڈراما نگار Sheridan کے سب سے کامیاب ڈرامے میں ایک کردار اسنیک

(Snake) نام کا ہے،مگر خیر وہ تو طنزیہ مزاحیہ طور پر ایجاد کردہ نام تھا۔لیجیے میں تو ناموں کی کھتونی لے کر بیٹھ گیا (یا پڑ گیا)۔

تو پیکاک صاحب کی جو نظم مجھے بہت پسند تھی ،افسوس کہ اب مجھے اس کے دو ہی تین مصرعے یاد ہیں۔نظم میں ایک بھوت ہے جو ایک حسینہ پر عاشق ہے۔وہ ہر رات اس کے سرہانے آکر ایک گیت گاتا ہے کہ ''مرجا، ارے مرجا۔'' نظم کا اختتام یاد نہیں،لیکن شروع کے چند مصرعے یاد ہیں:

A ghost that loved a lady fair,

Soft by midnight at her pillow stood,

Ever singing,"Die, Oh Die."

اس وقت، بلکہ آج بھی جو بات مجھے اس نظم میں سب سے حیرت ناک لگتی ہے ،وہ یہ نہیں کہ کوئی بھوت کسی لڑکی پر عاشق ہوجائے ۔ہمارے یہاں توعورتوں پر آسیب،شیخ سدو،جن، پری،آتے ہی رہتے ہیں۔(حضرت غوثی علی شاہ صاحب کے یہاں لوگ ایسے معاملات میں تعویذ مانگنے آتے تھے۔آپ تعویذ دے تو دیتے،لیکن اکثر فرماتے کہ انگریز کی عورتوں پر کوئی جن یا آسیب کیوں نہیں آتا؟انگریز کا اقبال بلند ہے اس لیے اس کی عورتیں بھی محفوظ ہیں۔بات تو مزے دار ہے،لیکن میرے خیال میں اصل معاملہ عقیدے کا ہے۔انگریز کو جن اور پری اور شیخ سدو وغیرہ پر نہیں،لیکن بھوت اور روح پر عقیدہ ہے اور اس کا عقیدہ ہے کہ ان کا اثر عورتوں یا مردوں پر نہیں بلکہ گھروں پر ہوتا ہے۔ہمارا عقیدہ ،اسلامی عقیدے کے مطابق،بھوت پریت پر نہیں،لیکن جنات، پری وغیرہ پر ہے۔)

میرے لیے پیکاک صاحب کی نظم میں اصل حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس بھوت کو پورا یقین تھا کہ اس کی معشوقہ مرکر بھوت (یا بھوتنی؟) ہی بنے گی۔واللہ اعلم۔ان کی ایک نظم اور تھی جس میں دو بھوتوں کی ملاقات ہوتی ہے تو ایک پوچھتا ہے،کہو کیا حال ہے؟دوسرا کہتا ہے،پتہ نہیں جی، میں تو کل ہی مرا ہوں۔اردو میں یہ معاملہ اضحوکہ لگتا ہے،لیکن انگریز شاعر نے خفیف سے مزاح کے ساتھ خوف یا سنسنی کی تھرتھری بھی رکھ دی تھی (شاید اس لیے کہ انگریز قوم کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان بھی بھوتوں پر اعتقاد رکھتی ہے۔)

ابھی صبح نہیں ہونے والی۔ہمارے گھر کے پیچھے ایک خاصا بڑا تالاب تھا جسے لوگ ''گڑھی''

کہتے تھے۔ اب مجھے خیال آتا ہے کہ ''گڑھا'' کی تانیث کے اعتبار سے تو ''گڑھی'' بمعنی ''بہت چھوٹا گڑھا'' ہونا چاہیے تھا۔ اتنے بڑے تالاب کو ''گڑھی'' کہنا چہ معنی دارد؟ لیکن میری مرحومہ جنت نشین بھی اپنے آبائی تالاب کو، جس میں مچھلیاں وافر ہوتی تھیں، ''گڑھیا'' کہتی تھیں۔ زبان کے کھیل نرالے ہیں۔ بہرحال، ہماری گڑھی میں مچھلیاں نہیں، لیکن جونکیں، گھونگھے، اور پانی کے چیونٹے بے شمار تھے۔ یہ پانی کے چیونٹے بھی خوب تھے، نہایت دبلے پتلے، بالکل جیسے وہ تنگ اور پتلی اور لمبی، ہلکی بادبانی کشتیاں جنھیں Pinnace کہتے ہیں، یا جیسے کشمیری شکارے، بے حد ہلکے پھلکے۔ سیاہ بھورا رنگ، جسے Steel Grey کہئے، اور اس قدر لمبی لمبی ٹانگیں جیسے وہ سرکس کے جوکروں کی طرح پاؤں میں بانس باندھے ہوئے ہوں۔ وہ پانی کی سطح پر اس قدر تیز دوڑتے جیسے دوڑ کے میدان میں گرے ہاؤنڈ کتے دوڑتے ہیں۔ مجھے اب یہ تو نہیں یاد کہ وہ کتنی دور تک دوڑتے نکل جاتے تھے (گڑھی خاصی چوڑی تھی، یا مجھے وہ چوڑی لگتی تھی۔) مجھے یاد نہیں کہ کوئی چیونٹا کبھی اس پار سے اس پار پہنچتا ہوا دکھائی دیا ہو۔ لیکن وہ جانور بالکل ننھے منے اور ہلکے پھلکے تھے اور گڑھی کا پانی بھی کچھ بہت روشن نہ تھا، اس لیے اگر وہ اس پار نکل بھی گئے ہوتے تو مجھے نظر نہ آسکتا تھا کہ وہ اس کنارے پر پہنچ ہی گئے ہیں۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد آتا ہے ان کی دوڑ یہی کوئی دو ڈھائی فٹ کی ہوتی تھی اور مجھے ایک چھوٹے سے آبی منطقے میں دوڑتے بھاگتے نظر آتے تھے، اپنے تئیں ایک عجب اہمیت کا احساس اور خودنگری کا رنگ لیے ہوئے، گویا وہ سارا پانی انھیں کے لیے بنایا گیا تھا۔ اکثر میں دیکھتا کہ وہ ایک طرف دوڑتے ہوئے گئے، پھر دفعتہً کنّی کاٹ کر کسی اور طرف نکل گئے۔ چراگاہوں میں کلیلیاں کرتے ہوئے آہو بچوں اور الل بچھیروں کی طرح انھیں ایک دم قرار نہ تھا۔

اپنی دوڑ میں منہمک چیونٹوں کو کبھی کبھی میں فرض کرتا کہ وہ جنگی جہاز ہیں اور جنگی تیاریوں میں مشغول، یا سمندر پار کرنے والے ہلکے جہاز ہیں جنھیں کچھ گنے چنے مسافروں کو لے آنا اور واپس لے جانا ہوگا۔ ایسے مفروضے میں جہاز رانی اور مہم جوئی اور جوکھموں کو ہنستے کھیلتے انگیز کر لینے کا بھی سنسنی آمیز احساس بھی شامل ہو جاتا تھا۔ چونکہ میں نے انھیں کبھی ڈوبتے نہ دیکھا تھا، اس لیے مجھے یقین تھا کہ وہ بڑے ماہر جہازی ہیں، سند باد جہازی کی طرح نہیں ہیں کہ جس کا جہاز آئے دن طوفانی ہو جایا کرتا تھا۔

گھونگھے وہاں بہت تھے، گول، لمبے، ٹیڑھے بدنوں والے، جیسے کسی سادھو کے سر پر لپیٹی ہوئی لمبی جٹائیں۔ مجھے کبھی ان سے دلچسپی نہ ہوئی۔ کہاں وہ میرے جری اور خوبصورت اور صبارفتار

چیونٹے اور کہاں یہ بھونڈے، بھدیسل، ایک جگہ پڑے رہنے والے گھونگھے۔ کبھی کبھی میرا ہاتھ لگ جاتا تو بڑے چپچپے اور گیلے معلوم ہوتے۔ (نہیں، ان میں سے کچھ خشک بھی ہوتے تھے۔) آخر وہ تھے ہی کس مصرف کے؟ پانی میں رہنے والے (ایسا میرا خیال تھا) لیکن پانی پر تیرنے سے کترانے والے۔ دریا کے کنارے وہ لمبوترے، ہلکے پھلکے اور سفید گلابی رنگ کے گھونگھے اور ہی چیز تھے جن کے درشن مجھے بہت ہی کم ہوتے تھے کیوں کہ ہمیں دریا پر جانے کی سخت ممانعت تھی۔ اور ان دریائی گھونگھوں کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ مردہ ہوتے تھے، لہٰذا ان سے کوئی خطرہ، یا کسی چپچپاہٹ، کسی گھن کے احساس کا خطرہ نہ تھا۔

جونکیں تو میں نے شاید وہاں دیکھیں نہیں، لیکن گول، مندر نما گھونگھوں کے نیچے سے دو لمبی، سرخ، مٹ میلی بھوری پتلی زبانیں سی کبھی کبھی نکل آتی تھیں۔ میرے گاؤں والے ساتھی مجھے خبردار کرتے تھے کہ انھیں کبھی ہاتھ نہ لگانا، کیوں یہ بھی جونک کی طرح خون نکال لیتی ہیں، سرپت کی تیز پتی طرح یا چھوٹے سے دھاردار چاقو کے پھل کی طرح یہ تمھارے بازوؤں یا ہاتھ پر لمبی سی خونی لکیر چھوڑ جائیں گی۔ اب مجھے خیال آتا ہے کہ یہ سب بچوں کا جھوٹا خوف یا شرارت بھرا ڈھونگ تھا، کیوں کہ اب مجھے معلوم ہے کہ وہ لمبی سی دھاگے سے چیزیں دراصل گھونگھے کے پاؤں ہیں۔

اس گڑھی کے کنارے، ہمارے مکان کے پچھواڑے کی طرف، اور اتنا نزدیک کہ میں راتوں کو اس کی (دن کو) چمکیلی (رات کو) سیاہ پتیوں میں ہوا کو غل مچاتے، لمبی لمبی سانسیں بھرتے، بند کمرے میں اپنے پلنگ پر سے گذرتے سنتا اور محسوس کرتا تھا۔ وہ راتیں میرے لیے بڑی قیامت کی ہوتی تھیں۔ میری ماں تو دادی کے گھر میں دوسری بہوؤں کے ساتھ کھانا پکانے، کھلانے، اور کھانے میں لگی رہتیں۔ اور میرے باپ رات کی نماز (شاید عشا، شاید مغرب) کے بعد دادا کی محفل میں دیر تک بیٹھے رہتے۔ خدا معلوم کیا کیا باتیں کرتے ہوں گے۔ لڑائی کے دن تھے (میرا خیال ہے وہ سال ۱۹۴۳ یا ۱۹۴۴ رہا ہوگا)، اس لیے لڑائی میں انگریزوں کی فتح یا پسپائی کے چرچے ضرور ہوتے ہوں گے، اور چونکہ سارا گھرانہ بہت مذہبی تھا، اس لیے اللہ رسول کی باتیں بھی ہوتی ہوں گی۔ ظاہر ہے کہ سب لوگ مجھے اپنے باپ کے گھر میں پوری طرح محفوظ اور گہری نیند میں ہر خوف اور ہر وجود سے بے خبر سمجھتے ہوں گے۔ گھر، جس کے ایک سرے پر، گڑھی کی پرلی طرف ایک سنسان بیت الخلا تھا جسے کوئی استعمال نہ کرتا تھا، لیکن وہ بند بھی نہ رہتا تھا، مگر گڑھی کی جانب اس میں کوئی کھڑکی یا دروازہ نہ تھا، لہٰذا اسے ہر طرح محفوظ سمجھا جاتا تھا۔ چاروں طرف اونچی دیوار بھی

تھی، خاص کر پیپل کے درخت اور گڑھی کے رخ پر، اور جس کا دروازہ شاید کھلا رہتا ہوگا، لیکن اس گھر کی جائے وقوع ایسی تھی کہ دروازے پر آنے والا کئی لوگوں کی نگاہ میں رہتا (یا کم سے میرے باپ ماں کا یہی خیال رہا ہوگا۔) ایسی صورت میں آٹھ نو سال کے سمجھ دار، اسکول جانے والے اور انگریزی پڑھنے والے لڑکے کے لیے کسی خوف کی بات واقع ہونے کا امکان ہی کہاں تھا؟

لیکن آہ، میرے والدین کو کیا معلوم تھا کہ وہی پیپل کا درخت جو دن کو انتہائی دوستدار اور خوشگوار اور ہریالا سایہ دار پڑوسی تھا، شام پھولتے ہی دشمن، اور مجھ سے خدا جانے کس قصور کا بدلہ لینے یا خدا جانے کب کی دشمنی نکالنے پر آمادہ، خون خشک کر دینے والا آسیبی وجود بن جاتا تھا۔ اور وہ ہوائیں، جنھیں وہ بار بار مجھے دھمکانے کے لیے میرے سر کے اوپر، میری چھت کے اوپر، سرپٹ دوڑنے والے گھوڑے کی طرح دوڑاتا تھا۔ اور کیا رات کے وقت وہ سارے گھونگھے اور وہ میرے دوست چیونٹے، اور شاید پانی کی تہ میں خفیہ زندگیاں گذارنے والی مخلوق، سب اس پیپل پر چڑھ کر چڑیل اور جنات بن جاتے تھے؟ یا شاید وہ پیپل کا گھنا، لمبا، گرانڈیل پیڑ ہی کوئی جنات بن جاتا تھا؟ یا ہواؤں کے شور کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کوئی چڑیل، کوئی برم، کوئی پشاچ، چپ چاپ پیپل سے اتر کر مجھ کو دبوچنے ہی والا ہے؟

خدا جانے پیپل کے پیڑ میں اتنی قوت کہاں سے آتی تھی۔ آج بھی اس قوت کا مظاہرہ میں اس طرح دیکھتا ہوں کہ شہر میں جہاں اب میں رہتا ہوں، ایک پیپل وہاں سے کم سے کم ایک ڈیڑھ میل کی دوری پر سڑک کے اس پار کھڑا ہے۔ وہاں کئی درخت اور بھی ہیں، جیسے کہ سڑکوں پر ہوتے ہیں۔ آندھی تو ایک طرف، تیز ہوا بھی شہر کے اس حصے میں کبھی کبھی ہی بہتی ہے۔ لیکن میرے گھر کی کوئی دیوار، لان کا کوئی گوشہ، اندرونی آنگن کا کوئی بھی حصہ ایسا نہیں جہاں پیپل کے پودے تکلیف دہ اور پریشان کن تواتر سے نہ اگ آتے ہوں۔ ہزار بار اکھڑواتا ہوں، سینکڑوں بار خود نوچ کر پھینکتا ہوں، لیکن توبہ کیجیے، وہ کہاں ہار مانتے ہیں۔ میں ہار مانتے مانتے رہ جاتا ہوں۔ جانتا ہوں کہ ان پودوں کو اگر بڑھنے دیا گیا تو یہ موذی دیوار، چھت، سب کو توڑ پھوڑ ڈالیں گے۔ اس لیے ہر مہینے دو مہینے مالی کو تاکید کرتا ہوں، دوسروں کی ہمت افزائی کرتا ہوں کہ بھائی انھیں ٹھہرنے مت دینا۔ مگر وہ پھر آجاتے ہیں۔ پیپل نہ ہوا، ایڈگر ایلن پو (Edgar Allen Poe) کی نظم The Raven کا وہ کچھ شیطانی سا پریت کاگ ہو جسے نظم کا متکلم ہزار کوشش اور ترغیب کے باوجود اپنی کھڑکی، بلکہ یوں کہیں کہ اپنے سینے سے ہٹا نہ سکا تھا۔

ہر رات میری اور پیپل کے چھتنار، دشمن، بھوت جیسے سیاہ فام، غیر انسانی وجود اور پچاسوں ریل گاڑیوں کے ایک ساتھ کسی پل پر گذرنے کے شور جیسا ہنگامہ کرنے والی ہواؤں سے جنگ ہوتی۔اور ہر صبح کو وہ پیپل وہی پہلے جیسا سایہ دار ،ٹھنڈا ،اور ہلکی شیرینی لیے ہوئے گول گول چھوٹے چھوٹے پھلوں والا گھر بن جاتا۔نہ جانے کتنی دوپہریں اپنے والدین کی آنکھ بچا کر وہاں میں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ پیپل کی گوندنیاں چننے اور مزے لے لے کر کھانے میں گذاری ہیں۔ایک بار میرے ایک ساتھی نے غلطی سے بکری کی ایک مینگنی بھی گوندنی سمجھ کر منھ میں ڈال لی تھی (میں آپ کو یقین دلاتا ہوں وہ میں نہیں تھا۔) یہ واقعہ ہم لوگوں کے لیے تھوڑی بہت تفریح کا سبب بنا ضرور تھا،لیکن ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ اس کی خبر ہمارے بڑوں کو لگ گئی تو بڑی ڈانٹ (اور اغلب یہ کہ مار بھی) پڑے گی،اس لیے ہم لوگوں نے بہت جلد ہی اس موضوع کو اپنی گفتگو سے خارج کر دیا۔

آج خدا جانے کتنی مدت بعد میں گاؤں واپس آیا ہوں۔کل مجھے دادا کی زمین پر نوتعمیر اسکول کا افتتاح کرنا ہے۔دادا کے دروازے پر نیم کا پیڑ،جس کے نیچے خاندان کے لوگوں کے ساتھ گاؤں کا ہر اجنبی مسافر کھانا کھاتا تھا،اب نہیں ہے۔جس درخت کے سائے میں اس وقت میں لیٹا ہوا سونے کی کوشش کر رہا ہوں،اس کی عمر بمشکل تیس چالیس برس ہوگی۔وہ گڑھی اور وہ پیپل تو اس طرح صفحۂ وجود سے محو ہو چکے ہیں گویا کبھی تھے ہی نہیں۔ہم تو جیسے یہاں کے تھے ہی نہیں، خاک تھے آسماں کے تھے ہی نہیں، جون ایلیا نے ہجرت کے پس منظر میں کہا تھا۔ان بچاروں کو کیا معلوم کہ ہم لوگ جو یہیں کے تھے اور کہیں نہ گئے،ہم لوگوں کا سارا بچپن،سارا لڑکپن،تمام اٹھتی ہوئی جوانیاں ، تمام دوستیاں اور رقابتیں ان اشجار کے ساتھ گئیں جو کٹ گئے،ان تال تلیّوں کے ساتھ ڈوب گئیں جو سوکھ گئے،ان راہوں سے اٹھا لی گئیں جن پر گھر بن گئے۔اے تو جو شہر کے باہر کھڑا اس طرح بے تحاشا رو رہا ہے،بول تو نے اپنی جوانی کے ساتھ کیا کیا؟ مجھے ورلن کے مصرعے یاد آئے۔لیکن میں نے تو کچھ کر کے دکھا دیا ہے،میں آج دور شہر سے بلایا گیا ہوں کہ اسکول کی عمارت کا افتتاح کروں۔میں تو اب کچھ خاصا اہم آدمی ہوں،وہ چھوٹا سا لڑکا نہیں جو دل ہی دل میں اپنے باپ سے ناراض رہتا تھا کہ رات کے کھانے کے بعد مجھے آم اور خربوزوں میں سے اتنا حصہ کیوں نہیں ملتا جتنا میں چاہتا ہوں؟ لیکن اس گلی سے کسی نے نہ کہا تھا کہ جانے والے یہاں کے تھے ہی نہیں۔میں تو یہیں کا تھا،یا شاید نہیں تھا۔بھلا کون اپنے دل میں اور سر پر ان بھوت

پریتوں، چڑیلوں، جناتوں، تیز چل کر ڈراتی ہوئی ہواؤں اور بھیانک مسکراہٹ مسکرا کر دور سے اشارہ کر کے بلانے والی بلاؤں کا پیلا، گندہ، سیاہ خون لیے لیے پھر سکتا تھا؟

مگر وہ دنیا ہر طرف متحیر کرنے والی، ہر طرح سے جرأتوں کو آواز دینے والی، ہر لمحہ وسعتوں اور گہرائیوں کا احساس دلانے والی دنیا تھی۔ جس بیت الخلا کا ذکر میں نے ابھی کیا (خدا جانے کیوں ہم لوگ بھی اسے بیت الخلا کہتے تھے، پاخانہ نہیں)، اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اگر کوئی چالیس دن تک متواتر اس میں جا کر ''سلام علیکم'' کہے تو اکتالیسویں دن اس کی ملاقات ایک جنات سے ہو جائے گی جو وہیں رہتا ہے۔ میں نے سنا تھا کہ ایک بار ایک صاحب نے چالیس دن تک ''سلام علیکم'' وہاں جا کر کہا تو اکتالیسویں دن واقعی ایک شخص انھیں نظر آیا جو تھا تو انسانوں جیسا، لیکن اس کا قد آسمان کو چھوتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ بیت الخلا کی چھت بہت اونچی نہ تھی، لیکن اس وقت اتنی اونچی، اتنی اونچی ہو گئی تھی کہ ٹھیک سے نظر نہ آتی تھی۔ ''وعلیکم السلام'' ایک بڑی گونجتی ہوئی سی آواز آئی، جیسے بہت بڑا نقارہ بج اٹھا ہو، یا جیسے کوئی بہت بڑا، بہت ہی بڑا سانڈ ڈکار رہا ہو۔

اس کے بعد کیا ہوا، یہ بتانے والا کوئی نہ تھا۔ لیکن وہ پیپل اب پھر میرے سامنے ہے... نہیں، پیپل نہیں، لگتا ہے کوئی شخص کہیں بلندی سے اتر رہا ہو، شاید نیم کے اس پیڑ سے جس کے تلے میں سو رہا ہوں۔ دھندلی، لمبی صورت، نہیں بہت لمبی نہیں، لیکن کچھ گھنی گھنی سی۔ اور وہ پیپل اب اس کے پیچھے ہے اور اس پیپل سے اب کچھ نیلی، کچھ سیاہ سی روشنی پھوٹ رہی ہے۔ بہت ہلکی روشنی، لیکن وہ صورت، وہ پیپل کا پیڑ... نہیں، وہ انسانی صورت، مجھے صاف دکھائی دیتی ہے۔ کوئی انسان ہے، ڈرنے کی کیا بات ہے؟ کوئی بوڑھا، پرانا مسافر ہو گا جو یہاں رات کے لیے جگہ مانگنے آیا ہے۔ صبح کو چلا جائے گا۔ مگر، مگر اس کے کپڑے تو بہت ہی پرانے زمانے کے ہیں۔ ہم لوگ ایسے موقعے پر ''دقیانوسی'' لفظ استعمال کرتے تھے، اب بہت دن سے یہ لفظ سننے میں نہیں آیا۔

اجنبی آ کر میرے پلنگ کی پائینتی کھڑا ہو گیا ہے۔ نہیں، میں اسے اپنے پلنگ پر رونے نہ دوں گا۔ رونے؟ نہیں سونے۔ ہرگز سونے نہ دوں گا۔ میں چاہتا ہوں اٹھ کر اس سے پوچھوں، کون ہو تم؟ اور ساتھ ہی سامنے کوئی پچاس قدم دور پر دادا کی مسجد میں سوئے ہوئے موذن کو آواز دوں۔ لیکن میرا بدن کچھ اکڑ سا گیا ہے۔ آواز کے عضلات (عضلات بھی کیا فضول لفظ ہے جیسے بہت سارے موٹے پتلے تار جھنجھنا گئے ہوں) میں وہ لچک نہیں رہ گئی جس کے ذریعہ آواز بنتی ہے۔

گرمی تو کچھ خاص نہیں ہے، لیکن میرے سار۔۔، بدن میں، خاص کر ماتھے پر، گریبان اور

بغل میں عجیب طرح کی تری ہے۔ مجھے چاہیئے کہ اٹھ کر پسینہ خشک کروں، ہو سکے تو کہیں سے پنکھا جھلنے کے لیے کسی چیز کا اہتمام کروں۔

روشنی اب اس اجنبی کے پیچھے ہی نہیں، اس کے اطراف میں بھی ہے۔ اب میں اسے اچھی طرح دیکھ سکتا ہوں۔ یہ کمبخت کچھ بولتا کیوں نہیں؟ متوسط قد، گٹھا ہوا بدن، سر پر بھاری لیکن مضبوط بندھی ہوئی پگڑی، سیاہ کپڑے کی، جس میں سفید دھاریاں ہیں۔ بدن پر سوتی شلوکا، کچھ اونچا لیکن آستین دار۔ کپڑے کا رنگ اس وقت متعین کرنا مشکل ہے۔ شلوکے پر آدھی آستیوں کا انگرکھا کسی پھولدار موٹے کپڑے کا، زین کے کپڑے کا اونچا پاجامہ، پنڈلیوں پر چست لیکن کمر کے نیچے ڈھیلا۔ پاجامے کی لمبائی پنڈلیوں کے نیچے تک نہیں ہے۔ کمر میں ایک ڈوپٹہ بہت تنگ کسا ہوا، اس میں ایک خنجر یا چھرا آویزاں۔ (یہ کوئی خونی قاتل وغیرہ تو نہیں؟) لیکن خنجر میان میں ہے۔ میان بہت سادہ کسی لکڑی یا سینگ کی بنی ہوئی ہے۔ خنجر کا قبضہ بھی نقش و نگار سے عاری ہے۔ پاؤں میں جوتیاں ہیں کہ نہیں، پتہ نہیں لگتا۔ گلے میں مختصر سا ہار کسی پتھر کا، لیکن قیمتی یا چمک دار نہیں۔ مونچھیں کچھ کچھ طویل لیکن بہت گھنی نہیں، ہاں دہانے کے دونوں طرف انھیں بل دے رکھا تھا۔ داڑھی ایک مٹھی سے کم، لیکن خاصی نمایاں اور تل چاولی۔ ڈاکو تو نہیں لگتا۔ اور ڈاکو اس طرح چپکے چپکے تن تنہا تھوڑا ہی آجاتے ہیں۔

میں نے دوبارہ اٹھنا چاہا، لیکن فضول۔ آواز بھی اسی طرح بند تھی، گلا اسی طرح خشک تھا۔

''بندگی عرض کرتا ہوں حضور خان دوراں، عالی جاہ۔ مزاج سرکار کا کیسا ہے؟''

عجیب سی آواز تھی۔ کچھ کھوکھلی سی۔ لہجہ بھی ہماری طرف کا نہ تھا۔ لیکن مغربی اضلاع والوں جیسا بھی نہ تھا۔ لگتا تھا یہ شخص مدتوں فارسی بولنے والوں کے ساتھ یا آس پاس رہا ہو۔ پچھم والے ذرا ٹھہر ٹھہر کر بولتے ہیں۔ ایرانی، یعنی آج کے ایرانی، الفاظ کو تیزی سے ادا کرتے ہیں۔ اس شخص کی بھی ادائیگی ذرا تیز تھی۔ حرکات و سکنات بدن میں فدویانہ پن کے باوجود لہجے میں کچھ قوت اور سختی تھی۔

نیند کا ایک جھونکا آیا۔ میری آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں، ہوا بھی ٹھنڈی اور شیریں ہوگئی تھی۔

خداوند عالم سکندر سلطان لودی ابن سکندر سلطان لودی فرماں روا عرصہ بیس سال سے ملک ہندوستان، پنجاب، دوآبہ ہند و شرق، اور بنگالے سے بندیل کھنڈ تک کے علاقے پر نہایت شان

اور دل جمعی اور انصاف وعظم وشان کے ساتھ تھے۔ یہ آخری برس (۹۲۳) ان کی حکومت بابرکت کا تھا۔ لیکن خبر کسی کو کیا تھی کہ اقبال سکندری کا یہ آفتاب اب لب بام ہے۔ بلاد روم کے آگے مشرق میں دار الخلافۂ اسلام، شہر فرحت وقوت القیام، یعنی حضرت دہلی کو چھوڑ کر خداوند عالم نے ایک نیا شہر گوالیار سے کچھ اوپر دہلی کے جنوب میں آگرہ نام کا سنہ ۹۱۰ تعمیر کر کے اسے اپنا دار السلطنت ٹھہرایا تھا۔ خداوند عالم کا بیشتر وقت نئے شہر کی تزئین اور توسیع میں صرف ہوتا تھا۔ حکومت میں ساری دبدبۂ خداوند عالم کے بل پر امن وامان ہر طرف تھا۔ کہیں بھی، کچھ بھی، بطول وعرض سلطنت باحشمت میں واقع ہوتا، خداوند عالم کو پلک مارتے میں خبر اس کی لگ جاتی تھی۔ لوگوں میں عقیدہ عام تھا کہ خداوند عالم حضور سلطان سکندر کے قبضے میں کئی موکل ہیں، جیسا کہ کہا جاتا ہے قبضے میں سکندر ذوالقرنین کے بھی تھے۔ اور یہ موکلان سلطان سکندر کے، انھیں آگاہ و باخبر کلیۃً رکھتے تھے۔ کسی کو مجال ظلم رانی نہ تھی۔

میں گل محمد، عمر کوئی پچاس سال (صحیح عمر والدہ کو میری معلوم تھی لیکن اب وہ مدت ہوئی اس دنیا میں نہیں ہیں) اپنے آبائی گاؤں سے باپ اپنے کے ساتھ دہلی آ گیا تھا۔ اس وقت میرا لڑکپن تھا، فارغ البالی کے دن تھے۔ باپ خان جہاں لودی جو مشہور عالم مسند علی خان کے نام سے تھے، ان کی ڈیوڑھی پر تاعمر دربان رہے۔ میں اکیلی اولاد، کھیلنے کھانے سے فرصت نہ ملتی تھی۔ تاہم باپ میرے نے مجھے خان جہاں کے دوسرے نوکروں کے بچوں کے ساتھ حویلی کے مولوی کے سپرد کر دیا۔ بعد ازاں عمر ابھی گیارہ ہی برس کی تھی کہ مجھے مشہور زمانہ، شیخ عصر شاہ اللہ دیا صاحب جونپوری کے فرزند جگر بند شیخ بھکاری صاحب دہلوی کے مدرسے میں ڈال دیا گیا۔ تین چار برس تک مدرسے میں خوب کٹائی منجھائی ہوئی۔ شیخ بھکاری صاحب کو تقریر سے زیادہ تحریر سے شغف تھا، اس لیے اصل کام تعلیم کا ان کے شاگردوں کے سپرد تھا۔ میں نے جہاں تک ہو سکا پڑھائی محنت سے کی۔ تھوڑا بہت لگاؤ شعر گوئی سے تھا، اس لیے مطول اور المعجم اور بعد میں اسرار البلاغۃ اور اعجاز القران اور البیان والتبیین میں تھوڑا بہت درک حاصل کیا۔ باقی معقولات ہوں یا منقولات، ایک ذرا سے علم انجم شناسی اور علم ہیئت کے سوا کچھ میرے پلّے نہ پڑا۔

میں نے حضرت شیخ جمالی کنبوہ کی خدمت میں حاضری دینی شروع کی اور فن شعر کے کچھ نکات ان سے حاصل کیے۔ لیکن مجھ میں ملکہ شعر گوئی کا حقیقتاً نہ تھا۔ ایک دن میری غزل پر خط تنسیخ پھیر کر انھوں نے فرمایا:

''میاں صاحب، شما شاعر نہ خواہید شد۔ می بینیم کہ شما مذاق شناوری و کشتی گیری دارید۔ پیشۂ سپہ گری ہم برائے شما خوب می باشد۔''

مجھے برا تو بہت لگا۔ افسوس بھی بے حد ہوا، لیکن اس کو کیا کیجیے کہ حضرت شیخ نے مجھے متعدد بار کنار جمنا پر پتنگ اڑاتے، یا بابا سلطان جی صاحب کی باؤلی میں شناوری کرتے، یا استاد بھوپت رائے ماہر کشتی گیری کی خدمت میں حاضر ہوتے بھی دیکھا تھا۔ بسنت پھولتی یا میلاد شریف کے دن آتے یا ہولی کا تیوہار ہوتا، میں ہر اس جگہ موجود رہتا جہاں مواقع سیر اور گلچھروں کے مہیا ہوتے۔ حضرت شیخ کا آنا جانا کہاں نہ تھا، تغلق آباد سے لے کر کوٹلہ فیروز شاہ تک ان کے شاگرد پھیلے ہوئے تھے۔ از صبح تا شام وہ اپنی پالکی میں شہر کی سیر کرتے یا شاگردوں اور عقیدت مندوں کے دیوان خانوں میں شعر وسخن کی محفلوں کے صدر مجلس ہوتے۔ انھیں خوب معلوم تھا کہ بندہ بھی نہ ٹلد گل محمد جیسا تھا، اپنے شوق اور اپنے لہو ولعب کو ترک کرنے والا میں نہ تھا۔

اس طرح نہ تو میں شاعر بن سکا، نہ ہی عالم۔ بس یہ ضرور تھا کہ عربی فارسی کی شد بد، تھوڑا بہت علم الحساب، جو میں کسب کر سکا تھا، میرے بہت کام آیا۔ اپنے کھلنڈرے دوستوں میں تو میں مولانا گل محمد دہلوی کے نام سے معروف ہو گیا تھا۔ باپ کا گھر سونے اور کھانے کے لیے، اور دہلی کا شہر سیر سپاٹوں اور کھیل کود کے لیے، پھر اور کیا چاہیئے تھا۔ یہ ضرور ہے کہ باپ نے شادی میری برس اٹھارہ کے سن میں کر دی۔ بی بی اور گرہستی سے لگاؤ مجھے اتنا ہی تھا جتنا کسی ایسے جوان کو ہوتا جسے شہر کی ہوا لگ گئی ہو۔

باپ کے ہوتے فکر بال بچوں کی کسے ہوتی۔ کبھی کبھی تیج تیوہار کے زمانے میں گھر ہو لیے، گھر والی کے لیے شیرازی جوتیاں، بھاگل پوری نینو اور بنارسی کمخواب دست بقچے میں باندھے، بچوں کے لیے متھرا اور بداؤں کے پیڑے، جو دہلی میں مفرط ملتے تھے، ہانڈیوں میں رکھوائے اور چاند دکھنے کے کچھ پہلے گھر پہنچ لیے۔ میری شادی کے تیسرے سال باپ نے اچانک مرض فرنگ میں جان دی۔ فرنگی تو ہمارے یہاں دور دور تک نہ تھا۔ لیکن کہتے ہیں کہ اب سے دور ایک بار سارے ملک فرنگ میں مرض طاعون کا پھیلا اور ایسا پھیلا کہ مسافروں، یا شاید جناتوں اور شیطانوں کے توسط سے بلاد شرق میں بھی جگہ جگہ متمکن ہو گیا۔ تب سے ہر دو چار سال بعد کسی نہ کسی علاقے میں ہندوستان کے یہ موذی مرض پھوٹ پڑتا اور صدہا جانیں لے کر ہی جاتا۔ اس وقت سے لوگ طاعون کو مرض فرنگ کہنے لگے۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ دراصل مرض آتشک مرض فرنگ ہے، کیونکہ یہ بلا بھی انھیں دیار و امصار سے ہم تک پہنچی تھی۔ لیکن یہ قول قوی نہیں۔ میں نے سنا ہے کہ شیخ الرئیس اور امام رازی کی کتابوں میں بھی ذکر آتشک کا ہے۔ پس دریں صورت آتشک کو مرض فرنگ کیونکر کوئی کہوے۔

باپ کے مرنے کا غم میں نے بہت کیا۔ اور دوسرا اتنا ہی بڑا غم کسب معاش اور پرداخت خاندان کا تھا۔ بارے میرے مرحوم باپ کی نوکری اور توسلی رشتے یہاں بھی کام آئے۔ خان جہان لودی نے جب میری بدحالی سنی اور دیکھی تو مجھے خان دوراں اسد خان ابن مبارک خان کے رسالے میں احدی بحال کرادیا۔

سن رہے ہو صاحب، آپ سن رہے ہو نہ؟

''ہاں سن رہا ہوں،'' میں نے بیزاری سے کہا اور دوسری کروٹ سو گیا۔ یا شاید سونے کی کوشش کرنے لگا۔ رات کچھ ٹھنڈی سی ہو رہی تھی۔ میں نے بستر کی چادر میں خود کو لپیٹ لینے کی کوشش کی۔

احدی سے آپ کو یہ گمان نہ ہو کہ میں مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے زمانے کے احدیوں میں شامل ہو گیا۔ اکبر بادشاہ اس وقت کہاں تھا۔ اور اکبر کے احدی تو یوں سمجھئے آپ کہ وظیفہ یاب قسم کے نفر تھے، مفت کی روٹی توڑتے تھے۔ خداوند عالم سلطان سکندر ابن سلطان سکندر کے احدی فوجی ہوتے تھے، سلطان کے ہمہ وقت جاں نثار اور دن رات سینہ سپر کرنے کو تیار۔ ہمیں اپنا گھوڑا، اپنی ڈھال تلوار، خنجر، فوجی کپڑے اور اسلحہ کی دیکھ بھال کا انتظام خود کرنا پڑتا تھا۔ عوض اس کے ہمیں خداوند عالم کی بارگاہ سے درماہہ ملتا تھا اور سر چھپانے کو خیمہ یا بڑے بڑے گھر ملتے تھے جن میں دس دس یا اور بھی زیادہ احدیوں کے سونے کا اہتمام رہتا تھا۔

کہنے کو میں نوکر تھا خان دوراں اسد خان ابن مبارک خان کا، لیکن درحقیقت آقا میرا خداوند سلطان سکندر تھا۔ خان دوراں کی ذمہ داری صرف اس قدر تھی کہ بخشی فوج تک مجھے پہنچانا اور اس بات کی ضمانت روبروے کوتوال لینا کہ میں زمرۂ بدمعاشان میں نہ تھا اور نہ کبھی میں نے ساتھ کسی بھی باغیان حکومت کا دیا تھا۔ اگر مجھ سے کوئی جرم سرزد ہوتا، یا میں اداے فرض میں کوتاہ پایا جاتا تو پہلی جواب دہی انھیں کی تھی۔ مجھے جو سرچنگ ملنی تھی وہ تو ملتی ہی۔

جب میرا باپ اس دنیا سے سدھارا تو سلطان خداوند عالم ابن سلطان سکندر لودی کو تخت سلطانی پر متمکن ہوئے دس سال ہو چکے تھے۔ چار دانگ علم میں سلطان کے غلغلے تھے۔ داب سلطنت کے شہرے اور سکہ و خطبہ کا نفوذ از ہند تا سند، از پنجاب تا بنگال اور از دہلی تا دھور سمدرا تھا۔ سلطان کی حق بینی اور انصاف پرستی کا ایک واقعہ ان دنوں زبان زد خاص و عام تھا کہ علاقۂ سنبھل کے ایک غریب مزارع کو اپنے کھیت میں ایک دن ایک کانسے کا گھڑا ملا جس میں سلطان علاء الدین کے زمانے کی پانچ سو سلطانیاں، یعنی سونے کے سکے تھے۔ حاکم صوبۂ سنبھل کو پرچہ لاگا تو اس نے بفور وہ سلطانیاں ضبط کر لیں۔ بیکس مزارع سلطان کی بارگاہ میں عرض پرداز کسی نہ کسی طور ہوا تو باز پرس حاکم سنبھل سے ہوئی۔ اس بدبخت نے باب حکومت میں یہ پاسخ بھیجا کہ خداوند عالم کی خدمت اقدس میں عرض کیا جائے کہ وہ مزارع ایک مرد نامشخص ہے اور ہرگز لائق و مستحق اس خزانے کا نہیں۔

خداوند عالم نے فرمان صادر فرمایا کہ اے احمق، جس نے یہ خزانہ اس مفلس کشاورز کو ارزانی کیا ہے وہ مجھ سے اور تجھ سے زیادہ جاننے والا ہے کہ کون مستحق کس مہربانی کا ہے۔ اشرفیاں اس غریب کی فوراً پھیر دی جائیں ورنہ آتش غضب سلطانی تجھے دم کے دم میں بستر نرم سے خاکستر گرم پر سلا دے گی۔ حاکم سنبھل اتنا سراسیمہ ہوا کہ اشرفیوں کی گاگر خود لیے ہوئے اس دہقان بچے کی جھونپڑی پر پہنچ گیا اور سو ٹنکے اپنی طرف سے دے کر اس نے مزارع سے راضی نامہ لکھوایا۔

ایک بار تھانیسر کے علاقے سے اطلاع آئی کہ ہندوان نے ایک تالاب قدیم کو ازسرنو تعمیر کر کے وہاں میلہ ایک ماہ بماہ منعقد کرنا شروع کیا ہے اور پوجا پاٹھ بھی کرتے ہیں اور گھنٹ ناقوس بھی بجتے ہیں۔ پس اس باب میں حکم عالی کیا صادر ہوتا ہے؟ سلطان والا شان نے مفتی اعظم سے مشاورت کر کے فرمان لکھوایا کہ وہ اپنے مذہب پر ہیں، پس جب تک ان کے مناسک و رسوم کے باعث کوئی خطر امن و امان کے لیے نہ ہو، ان سے ہرگز کچھ تعرض نہ کیا جائے۔

انتظام سلطنت میں ہشیاری اور خبر داری غرض سے حضرت دہلی اور اس کے گرد و نواح میں اسی ہزار مسلح فوج ہر وقت تیار رہتی تھی۔ کہیں سے ذرا بھی بدامنی کی خبر آئی اور جیوش سلطانی حرکت میں آ گئے۔ تغلق آباد، غیاث پور، بیگم پورہ، سیری اور کیلوکھیڑی جو پایہ تخت کے پرانے شہر تھے، ان سب میں میدان وسیع و مرتفع و مسطح دیکھ کر فوجوں کے خیام کے لیے مقرر کر دیئے گئے تھے۔ میں جس فوج میں تھا وہ غیاث پور سے ذرا اورے کنار جمنا پر قیام کرتی تھی۔ اس ندی کو جن نے دیکھا ہے وہی

اس کے وسیع پاٹ کا قیاس کر سکتے ہیں۔ برساتوں میں ندی پر دریاے اعظم کا گمان ہونے لگتا۔ غازی آباد میں ہنڈن کے ورلے کنارے سے کچھ آگے جنوب کی طرف سے لے کر اوکھلے تک سارا علاقہ پانی سے بھر جاتا۔ اسی بنا پر اس علاقے کو خلق اللہ طنزاً پٹ پڑ گنج کہنے لگی تھی، حالانکہ وہاں مچھروں، پسوؤں، جونکوں اور دیگر لساع کیڑوں کے سوا گنج کے نام پر کچھ نہ تھا۔

واللہ وہ بھی کیا زمانے تھے۔ بارہ برس میں میرا درماہہ بارہ تنکے سے بڑھتے بڑھتے بیس ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں پانچ تنکہ ماہانہ خرچ کرنے والے اجلے خرچ سے رہتے تھے۔ سلطان بہلول لودی کو اللہ بخشے، ان کا جاری کیا ہوا تانبے کا سکہ بہلولی کہلاتا تھا۔ وہ اب بھی رائج تھا اور اس میں طاقت اس قدر تھی کہ آدمی یہاں سے کول تک کا سفر اپنے گھوڑے کے ساتھ کرتا تو ایک بہلول اس کے لیے کافی ہوتا۔ مجھے اپنے گھوڑے کے ساز و یراق، سائیس اور اسلحہ کی دیکھ بھال پر بہت صرف کرنا پڑتا تھا، پھر بھی میں ہر مہینے تین سے چار تنکے گھر بھجوا دیا کرتا تھا۔ شراب کی لت مجھے نہ تھی، لیکن بازاروں اور کنچنیوں پر کچھ خرچ تو لازم ہی آتا تھا اور ایسی محفلوں میں کچھ شراب کچھ نقل تو بہر حال ضروریات میں تھی۔ مولانا گل محمد اب ذرا پیچھے چھوٹ گئے تھے اور گل محمد اوپچی کچھ آگے آگئے تھے۔

اب سلطان سکندر کا یہ اکیسواں سنہ جلوس تھا۔ میری بیٹی بارہ برس کی ہو کر تیرہویں میں لگی تھی۔ گھر سے خبر آئی کہ اس کی سگائی اور پھر بیاہ آئندہ برساتوں سے پہلے ہو جائے تو خوب ہو۔ مجھے بلایا گیا تھا کہ جا کر سب معاملات طے کر دوں۔ ہر چند کہ خداوند عالم سلطان سکندر ابن سلطان سکندر نے شرع شریف کی پابندی پر بہت کچھ زور دیا تھا، لیکن ہم ان اطراف کے گنوار مسلمانوں میں ہندوؤں کی بو باس ابھی بہت کچھ باقی تھی۔ جمعے کے سوا ہر دن ہم لوگ ہندوانی دھوتی پہنتے تھے۔ جمعے کو البتہ دو بر کا ڈھیلا سفید پاجامہ گاڑھے کا اور محمودی کا کرتا پہنا جاتا تھا۔ ہماری عورتیں گھر سے باہر نکلتی تھیں لیکن لمبا گھونگھٹ کاڑھ کر۔ ہر گھر میں ایک صندوق تھا جس میں دیوالی اور دسہرے اور عید بقر عید شبرات کے لیے روپیہ پس انداز کیا جاتا تھا۔ شادی کی رسمیں بہت کچھ ہندوانہ تھیں۔ کنیا دان یا جہیز کی صورت نہ تھی لیکن لڑکے والے شادی سے پہلے منگنی لے کر ضرور آتے اور اس موقعے پر شادی سے کچھ ہی کم خرچ ہوتا۔ نکاح کے بعد رخصتی (جسے ہم لوگ گون یا گونا کہتے تھے) اکثر بہت دیر سے ہوتی تھی۔ ہندوؤں کی طرح ہمارے یہاں بچکانہ شادی کا رواج تو نہ تھا لیکن منگنی پھر نکاح پھر گون کی رسمیں کچھ نہ کچھ وقفے سے ادا ہوتی تھیں۔

جیٹھ نکل کر اساڑھ کی آمد آمد تھی جب میں نے گھر جانے کا ارادہ کیا۔ تین ساڑھے تین سو تنکے کا انتظام میں نے کرلیا تھا کہ مصارف شادی اس سے کم بھلا کیا ہوں گے۔ ارادہ تھا کہ شام ہونے کے پہلے لیکن عصر کے بعد چل نکلوں کہ موسم ٹھنڈا ہو چکا ہو گا۔ ایک منزل کرتے کرتے غروب آفتاب ہونے لگے گا، کہیں کوئی اچھی سرائے دیکھ کر رات گذار لوں گا اور صبح ٹھنڈے ٹھنڈے اپنے گاؤں ننگل خورد پہنچ لوں گا۔ زاد سفر بہت تھوڑا رکھا، تحفہ تحائف کی ضرورت نہ تھی کہ سارا سامان شادی اور دیگر رسوم شادی کے لحاظ سے گھر کی عورات ہی کو خرید کرنا تھا۔ سواری کے لیے گھوڑا تھا ہی، اور کچھ درکار سپاہی کو نہ تھا۔ میرا راستہ نہر فیروز شاہی کے بائیں کنارے سے لگا ہوا کئی کوس چل کر پھر نہر سے کٹ جاتا تھا۔

وزیر پور پر نہر فیروز شاہی خود ہی خم کھا کر کرنال اور حصار کی جانب رواں ہوجاتی تھی۔ دورویہ گھنے پیڑ اور آتی برسات کے بادلوں کی دھندلی روشنی نے نہر کے دونوں طرف نیم تاریکی سی پیدا کر دی تھی۔ ایک جگہ خم اس قدر سخت تھا کہ خم کے پہلے اور بعد دونوں سرے نظر نہ آتے تھے۔ خم میں داخل ہو جائیں تو گویا دونوں طرف کی راہ بند ہو جاتی تھی۔ لیکن خطر کوئی نہ تھا۔ حکومت میں سلطان والاشان کی راہیں سب محفوظ تھیں اور یہ جگہ تو حضرت دہلی سے کوئی پانچ ہی چھ کروہ تھی۔ درحقیقت میرے لیے جگہ رات کے پڑاؤ کی یہاں سے بہت دور نہ تھی۔ میں گھوڑے پر سوار گنگناتا دلکی چلتا چلا جارہا تھا۔ سامنے ایک پلیا تھی جس کے نیچے نالہ ابھی خشک تھا۔ پلیا کے ورلی طرف ایک بڑھیا، نہایت تباہ حال نظر آئی، مجھے دیکھتے ہی اس نے کچھ دعائیہ لہجے میں مگر ذرا بلند آواز میں پکارا:

اکیلے دوکیلے کا اللہ بیلی!

پھر اس نے بہت مسکین لیکن پھر بھی بلند آواز میں مجھ سے کہا:

''اللہ کی راہ میں کچھ دے دو بیٹا۔ بیوہ دکھیا پر ترس کھاؤ۔''

میں نے سوچا، سفر میں ہوں، نیک کام کے لیے جارہا ہوں، اس وقت اسے کچھ دے دوں تو نیک شگون ہوگا۔ پھر میں نے گھوڑا آہستہ کیا، راس کو بڑھیا کی طرف موڑ کر جھکا، شلوکے کی جیب میں ہاتھ ڈالا کہ کچھ نکال کر بڑھیا کو دے دوں۔ یک مرتبہ کسی نے مجھے پیچھے سے دھکا دیا۔ میں غصے میں اس کی طرف مڑ کر گالی دینے والا تھا کہ کسی اور نے ایک دھکا اور دیا۔ میں بے قابو ہوکر بائیں طرف کو لڑکھڑایا۔ گھوڑا الف ہونے لگا۔ راس میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ گھوڑا الف ہو کر کدھر گیا، یہ

میں نہ دیکھ سکا کہ کسی نے اتنی دیر میں میرے سر پر کالا کپڑا ڈال کر مجھے اندھا کر دیا تھا۔ کپڑا اتنا موٹا اور پسینے کی بدبو سے بھرا ہوا تھا کہ مجھے ابکائی آ گئی اور میری سانس رکنے لگی۔ کپڑا فوری طور پر میری گردن پر کس دیا گیا تو میں سمجھا کہ یہ بٹ مار ہیں۔ جان نہ بچے گی، میری بیٹی کا کیا ہوگا، میں نے کمر سے خنجر نکالنا چاہا کہ ایک دو کو ختم ہی کر دوں۔ یہ قرم ساق نہیں جانتے کہ کس کے گھر بیعانہ دیا ہے۔ ایک دو کو تو مار ہی کر مروں گا۔

میری سانس اب بالکل ہی رکی جا رہی تھی۔ ابکائیوں اور خنجر نکالنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے کی کوششوں میں سانس ٹوٹی جاتی تھی۔ میں نے پوری قوت سے چلا کر ان حرام زادوں کو ماں کی گالی دینی چاہی لیکن اب تک میری مشکیں بھی کس لی گئی تھیں۔ پھر ٹانگیں باندھ کر مجھے ایسا بنا دیا گیا جوں کر کہ بکرے کو ذبح کے اس کی ٹانگیں باندھ کر کہیں اور لے جاتے ہیں۔ میری کمر میں ہمیانی بندھی ہوئی تھی۔ اسے نہایت صفائی سے کاٹ کر نکال لیا گیا۔ گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی، پھر کسی نے اس کو چمکارا اور چپ کیا۔ گھوڑوں کی چوری میں بھی ظالم اس غضب کے مشاق تھے کہ بظاہر گھوڑا بھی پلک جھپکتے میں رام ہو گیا۔ سارا کام مکمل خاموشی میں ہوا تھا۔ پھر میرے سر پر کپڑا کھینچ لیا گیا لیکن اس کے پہلے کہ میں کچھ کر سکتا، میرے منھ میں ایک اور کپڑا، پہلے سے بھی بدبودار اور متعفن، ٹھونس کر ساتھ ہی ساتھ آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔ پھر کچھ دوڑتے ہوئے قدموں اور گھوڑے کی ہلکی ٹاپ کی آواز۔ دونوں آوازیں بہت جلد مدھم ہو کر غائب ہو گئیں۔ کسی کے سانس لینے کی بھی آواز نہ سنائی دی تھی، بات کرنے یا کھانسنے کھنکھارنے یا ہنسنے کی تو بات ہی کیا تھی۔ میں یہ تو سمجھ ہی گیا کہ یہ پرلے درجے کے مشاق بٹ مار ہیں اور وہ بڑھیا ان سے ملی ہوئی تھی۔ لیکن یہ بھی تھا کہ وہ مجھے جان سے مارنا نہ چاہتے تھے۔ ان کا منشا محض یہ تھا کہ مجھے بے دست و پا کر چھوڑ دیں اور اتنی دور نکل جائیں کہ میں ان کا تعاقب نہ کر سکوں اور نہ کسی کو آگاہ ان کے بارے میں کر سکوں۔

مجھے رنج سے بڑھ کر غصہ تھا کہ میں، سارے عالم میں مانے ہوئے سلطان کی سارے عالم میں مانی ہوئی فوج کا سپاہی اور یوں کسی کچھوے کی طرح پکڑ لیا جاؤں کہ مدافعت اپنی میں ایک وار بھی نہ کر سکوں۔ لعنت ہے ایسی سپہ گری پر اور تف ہے ایسی سلطانی پر کہ رعایا یوں بے کھٹکے دن دہاڑے لٹ جائے۔ میں یہاں یوں ہی مجبور پڑا رہا تو کیا پتہ رات میں کسی موذی جانور کا شکار ہو جاؤں۔ کیا خبر مجھے کوئی اور بٹ مار قتل کر کے جو کچھ میرے بدن پر کپڑے اور تھیلی میں ستو اور جلیبیاں ہیں اور شلوکے کی جیب میں چند سکے بہلولی ہیں انھیں بھی لے کر چمپت ہو جائے۔ میں

نے چیخنا چاہا، لیکن وہ متعفن کپڑا میرے حلق تک یوں ٹھنسا ہوا تھا کہ میں اگر بولنے کوشش میں منہ یا حلق پر کچھ زیادہ زور ڈالتا تو کپڑا شاید میرے حلق کے اندر ہی اتر جاتا۔ وقت کتنا گذر گیا تھا، مجھے اس کا کچھ علم نہ تھا۔ مغرب تو ہو ہی چکی تھی۔ لیکن کہیں دور سے بھی اذان کی آواز یا مندروں میں گھنٹے کی پکار، یا چراگاہ سے واپس ہوتے ہوئے کسان یا چرواہے کے ساتھ مویشیوں کے ریوڑوں کی گھنٹیوں کی آواز کچھ بھی نہ سنائی دیتی تھی۔ دانہ دنکا چن کر اپنے گھونسلوں کو لوٹنے والی چڑیوں کے جھنڈ اگر تھے تو یا تو ابھی واپس نہ ہو رہے تھے یا وہ بھی شام کی تنہا شفق میں چپ چپاتے نکل گئے تھے۔ یا اگر آواز کوئی سنائی دینے والی تھی بھی تو زور سے چلانے کی کوشش سے میرے کانوں میں سائیں سائیں اس قدر ہونے لگی تھی کہ کچھ سن لینا مشکل تھا۔

کیا بہت دیر ہو گئی تھی؟ کیا اب کوئی آنے والا نہیں ہے؟ ابھی ابھی میں شیر کی دہاڑ سنی تھی کیا؟ شیر تو اس علاقے میں تھے نہیں، ہاں گلدار بہت تھے۔ گلدار تو جمنا کے کنارے کی کچھاروں میں دہلی سے کرنال تک چھوٹے ہوئے سانڈوں کی طرح بے روک ٹوک گھومتے تھے۔ اور بھیڑیے بھی۔ گلداروں کی تو ہمتیں اس قدر کھلی ہوئی تھیں کہ دہلی کے مضافات میں جو آبادیاں بوجہ نقل مکانی کے ذرا چھدری ہو جاتیں، ان کے خالی گھروں میں گلدار آباد ہو جایا کرتے تھے۔ یہاں تو میں جمنا کے کنارے سے دور تھا۔ سلطان فیروز شاہ خلد مکانی نے یہ نہر بنوائی ہی اسی لیے تھی کہ جمنا کا پانی جن علاقوں میں پہنچتا نہیں ہے وہاں بذریعہ اس نہر کے پہنچ جائے۔ لیکن یہاں بھی اب درختوں کے گھنے اور نہر کی رطوبت نے کچھار جیسا سماں پیدا کر دیا تھا۔ سلطان فیروز کو اللہ نے جنت میں اونچا مقام ضرور دیا ہوگا۔ انھوں نے اس راہ میں، اور کول کی راہ میں جگہ جگہ شاہی سرائیں بنوائیں تھیں جہاں کوئی بھی مسافر کچھ رقم دیے بغیر ٹھہر سکتا تھا۔ اور اچھا ہی تھا کہ انھوں نے یہ حکم دے دیا تھا کہ سراؤں کا خرچ تمام خزانۂ سلطانی سے ادا ہو، ورنہ مجھ جیسے لٹے پٹے مسافر کو تو راہ میں ایک وقت کی روٹی اور سر چھپانے کے لیے چھت کے لالے پڑ جاتے۔

میں نے بہت چاہا کہ راہ کے کسی پتھر سے رگڑ کر اپنے ہاتھوں کو بندش سے آزاد کرا لوں۔ لیکن ایک تو اس اندھیرے میں پتھر کہاں ملتا پھر میری آنکھوں پر اندھیری جو چڑھی ہوئی تھی اور ہاتھ پیٹھ پر بندھے ہوئے تھے۔ پاؤں کے بند کو رگڑ رگڑ کر کاٹنے کی کوشش میں جگہ جگہ خراشوں کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگا تھا۔ کیا سب لوگوں کو خبر ہو گئی تھی کہ یہ راہ بٹ ماروں نے ہتھیا لی ہے اور شام ڈھلے آنا ادھر انھوں نے چھوڑ دیا تھا؟ کتے بھی نہ بھونکتے تھے، یا شاید گیدڑوں کا ایک غول کہیں کھیت میں

غل مچا رہا تھا۔ کبھی کبھی ملک چین کے سفیر ملک میں ہمارے آتے تھے تو ان کے سپاہیوں سے میں سنتا تھا کہ ان کے یہاں اصول حرب کے ماہرین نے کچھ فن ایسا ایجاد کیا کہ جب ہاتھوں اور پاؤں کو ان کے باندھتے ہیں تو وہ بدن کو اپنے کچھ اس طرح پھلا لیتے ہیں کہ کیسا ہی بند ہو، بندھنے کے بعد ڈھیلا ہو جاتا ہے کیونکہ بدن پھر اپنی حالت اصلی پر آجاتا ہے۔ اس طرح اگر کبھی انھیں کوئی باندھ کر بالکل بے چارہ بھی کردے تو وہ بباعث بندھنوں کے ڈھیلا ہونے کے، خود کو ذرا سی کوشش کے بعد رہا کرا لیتے ہیں۔ افسوس کہ مجھے وہ فن آتا نہ تھا اور اگر آتا بھی کیا ہوتا۔ میں تو بے خبری میں مار لیا گیا تھا۔

رات تو بے شک ہو چکی ہوگی۔ کہیں درختوں کے پیچھو کچھ کھسر پسر تو نہیں ہو رہی ہے؟ کہیں وہ حرامی واپس تو نہیں آرہے ہیں؟ یہ کچھ آواز سی کیسی ہے؟ میں نے بہت غور سے سننا چاہا، لیکن کانوں میں کچھ سائیں سائیں اب بھی ہو رہی تھی۔ ہاں یہ کچھ نئی سی آواز تھی۔ ٹھہر ٹھہر کر آرہی تھی۔ کہیں کسی مندر میں گھنٹ ناقوس تو نہیں بج رہا؟ نہیں، یہ تو گہری اور دور تک پھیلنے والی آواز تھی۔ ٹن... ٹن... ٹن... ذرا رک رک کر... کوئی فیل نشین ادھر آرہا تھا... میرا دل بلّیوں اچھلنے لاگا۔ شاید میری جان بچ ہی جائے گی۔ ہاتھی کی گھنٹیوں کی آواز نزدیک آئی، آہستہ ہوئی، ٹھہر گئی۔

''معتبر سنگھ، ذرا دیکھنا۔ یہ راہ میں کیا پڑا ہوا ہے؟'' مضبوط، ٹھہری ہوئی آواز، لیکن کسی فوجی عہدہ دار یا شاہی اہل کار کی نہیں، بلکہ کسی ایسے شخص کی تھی جو عیش و عشرت میں پلا بڑھا رئیس زادہ ہو۔ ''نہیں، ابھی اترو نہیں، پاس سے دیکھو۔''

میں نے ہاتھ پاؤں ہلانے کی سعی اور تیز کر دی کہ مہاوت سمجھ لے کہ میں زندہ ہوں۔

''عالی جاہ، لگتا ہے ڈاکوؤں نے کسی شخص کو گھائل کر کے ڈال دیا ہے۔'' نہایت مودب لیکن کچھ ڈری ڈری سی آواز آئی۔

''اچھا؟ کوئی زخمی ہے؟ ہاں شاید اس کا کوئی دشمن اسے یہاں نہر میں پھینکنے لا رہا تھا، ہم کو دیکھ کر بھاگ نکلا۔ ہاتھی ذرا اور پاس لے چلو۔''

''حضور کہیں کوئی چال اس میں نہ ہو'' آواز اب اور بھی ڈری ہوئی سی تھی۔ ''ایسا تو نہیں کہ ہمیں ہی دھوکے سے کچھ... کچھ کر ڈالنے کا چکر ہو...''

میں نے اپنی کشمکش اور تیز کر دی۔ اس بار میں کچھ غیں غیں سی آواز نکالنے میں بھی کامیاب ہو گیا۔

''چال؟ چال بھلا اس میں کیا ہوگی؟ تم بھی عجب تھڑدلے آدمی ہو معتبر سنگھ۔ ہم ہاتھی سے

اتریں گے نہیں تو ہمیں کوئی کچھ کیا کردے گا؟اور اگر تیر کا نشانہ بنانا ہوتا تو اب لگ کئی تیر چل چکے ہوتے۔چلو، نیچے اترو۔اس غریب کی کیفیت دریافت کرو۔''

''سرکار...''معتبر سنگھ کے لہجے میں کچھ شک اور بہت سارا ڈر تھا۔

میں اپنی غیں غیں اور تیز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اے میاں تم تو بالکل ہی بودے نکلے۔اچھا یوں کرو۔ہاتھی کو ذرا اور آگے لے جا کر کہو کہ سونڈ سے اس آدمی کو اٹھا کر اوپر میرے پاس لے آئے۔چلو،شاباش۔''

معتبر سنگھ نے ہاتھی کو کچھ آگے بڑھایا،لیکن کتنا،اس کا مجھے اندازہ نہ ہوسکا۔لیکن معتبر سنگھ نے ہاتھی سے سرگوشی میں کچھ کہا،اور کئی بار کہا۔پھر مجھے لگا کہ کوئی بہت ہی طاقت ور اور کئی گز لمبا موٹا اجگر مجھے بانھ کر لپیٹ کر بلوں میں اپنے اٹھائے لیے جا رہا ہے۔میں نے سہم کر خود کو چھوٹا کرنے کی کوشش کی،لیکن کہاں میں اور کہاں وہ زبردست بادلوں جیسا زور۔آن کی آن میں ہاتھی نے مجھے رئیس کے ہودے کے آگے مہاوت اور مالک کے بیچ کی جگہ میں دھانس دیا۔بلا سے جگہ تنگ تھی لیکن اب میں ضیق جان سے تو بچ نکلا تھا۔

معتبر سنگھ نے،یا شاید مالک نے بھی اس کا ہاتھ بٹایا،مجھے بآسانی اس عفونت سے بھرے اور شاید تیل اور تھوک سے بھی چکٹے ہوئے میرے حلق میں ٹھنسے ہوئے کپڑے اور آنکھ کی پٹی سے آزاد کرلیا گیا۔تاہم مجھے اپنی آواز دوبارہ حاصل کرنے میں کچھ وقت لگا۔تھوک کو بمشکل گھونٹتے ہوئے میں نے فیل نشین کے سوال کے جواب میں مختصر لفظوں میں اپنی بپتا کہہ سنائی۔

''تو سپاہی جی،تم دوہرے خوش نصیب تھے۔ان قرم ساقوں نے تمھیں زندہ چھوڑ دیا اور پھر ہم ادھر آ نکلے۔''

''بندے کا بال بال آپ کے احسان سے گندھا رہے گا۔میں تو سمجھا تھا کہ شیر بھیڑیا کوئی نہ کوئی مجھے کھا ہی لے گا۔''

خیر،رسیدہ بود بلائے...ہوا سو ہوا۔میں بہادر گڈھ جا رہا ہوں۔وہاں تک بآسانی تمھیں پہنچا دوں گا۔آگے جو تمھارا جی چاہے۔بہادر گڈھ میں بھی قیام شب کا انتظام ہوسکتا ہے۔''

''بندہ پروری ہے آپ کی۔بہادر گڈھ تک بہت ٹھیک رہے گا اگر حفاظت میں جناب کی چلا چلوں۔کل صبح دہلی واپس چلا جاؤں گا۔''میں نے ٹھنڈی سانس بھری اور دل میں ابلتے ہوئے رنج کو دباتے ہوئے کہا۔

''بہت مناسب۔ معتبر سنگھ آگے بڑھو۔ اور ہاں، سپاہی گل محمد، ایک بار خوب غور سے دیکھ لو، کچھ تمھارا یہاں چھوٹ تو نہیں رہا؟''

''چھوٹنے کو اب کیا رہا ہے جناب۔ بندگان حضور نے جان بچالی، میں اسی پر خوش ہوں۔ فیل کو آگے بڑھنے کا حکم فرمائیں۔''

اثنائے راہ میں معلوم ہوا کہ فیل نشین کا اسم سامی رگھوراج بہادر سنگھ تھا۔ وہ اپنے کسی عزیز کی شادی میں شرکت کی غرض سے بہادر گڈھ کے کہیں آگے تشریف لے جارہے تھے۔ بہادر گڈھ میں انھوں نے مجھے ایک سرائے کا سامنے اتار دیا۔ دوبارہ بندگی اور اظہار تشکر کر کے میں نے ان سے رخصت لی۔

اگلے دن میں دہلی آگیا۔ میرے شلوکے میں چار چھ بہلولی جو بچ رہ گئے تھے وہ مصارف کے لیے کافی سے زیادہ تھے۔ ایک بہلولی میں سولہ اور ایک تنکے میں چونسٹھ چھدام ہوتے تھے۔ میں نے ایک بہلولی بھنائی اور سرائے کے مصارف اور مصارف بہلی میں سفر کے بخوبی ادا کیے۔ بہلی میں میرے ساتھ چار مسافر تھے۔ خدا کا شکر بھیجتا ہوں کہ ان میں سے کسی کو عارضہ تجسس اور کرید کا بہت نہ تھا۔ نہ انھوں نے پوچھا کہ میں بہادر گڈھ کس تقریب سے آیا تھا اور نہ میں نے ظاہر کیا۔

دہلی میں کچھ بھی تو نہ بدلا تھا۔ میری ہی مت بدل گئی تھی۔ میں تین ساڑھے تین سو تنکے کا انتظام اتنی جلد کہاں سے کرتا؟ میرے ساتھی سپاہی مجھ سے زیادہ خرچیلے اور تہی دست تھے۔ خان دوراں تو ان دنوں خداوند عالم کی معیت میں آگرے میں تشریف رکھتے تھے۔ خان جہاں شاید کسی مہم پر گئے ہوئے تھے۔ انھیں دونوں سے مجھے کچھ توقع ہو سکتی تھی۔ بھکاری شاہ صاحب سے کچھ مدد مل سکتی تھی، لیکن کہتے شرم آتی تھی کہ خدمت استاد کی کرنے کی جگہ انھیں سے خدمت لوں۔ اور سپہ گری اختیار کرنے کے بعد آنا جانا بھی میرا طرف مدرسے کے بہت کم ہو گیا تھا۔ اور یہ بھی تھا کہ میں موٹا مشٹنڈا مسلح سپاہی، چار کو مار کے پھر کہیں چوٹ کھانے کا دعویٰ رکھنے والا، اور اتنی آسانی سے چند بے حقیقت ڈکیتوں کا شکار ہو جاؤں، یہ تو منھ چھپانے کی بات تھی نہ کہ ہر کسی سے بتانے کی۔

دن بہت چڑھ آیا تھا جب میں اپنی خیمہ گاہ میں پہنچا۔ حسن اتفاق سے کم ہی لوگ اس وقت باہر دکھائی دیتے تھے۔ ممکن ہے نواب کے یہاں حاضری کے لیے بلا لیے گئے ہوں۔ میں نے اپنے خیمے میں قدم رکھا تھا کہ میرے قریبی دوست محمد عالم بہاری نے پکارا کہ'' اوئے تو یہاں کیسے؟ تجھے

تو ننگل خورد میں ہونا تھا۔''

ارو نا چار میں نے اس کی طرف نگاہ کی۔ وہ اپنی چوکی پر کچھ لیٹا کچھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لمبی سی تسبیح تھی۔

''محمد عالم، تم؟ ابھی تک باہر نہیں گئے؟ جی تمھارا ماندہ ہے کیا؟''

''نہیں، سب ٹھیک ہے۔ میں نے ایک منت مانی تھی اسے ہی پوری کرنے میں لگا ہوں۔ مگر تم واپس کیسے آ گئے؟ سب خیر تو ہے؟''

''مشفق من، خیر ہوتی تو یہاں کیوں دستا۔ میں تو لٹ لٹا کر گھر کو آ گیا۔''

''اجی بجھولیں کیوں بجھاتے ہو، بتاؤ کیا گذری تم پر؟''

جبراً میں نے سارا قصہ عالم کو سنا دیا۔ مگر میری کہانی ختم ہونے کے پہلے ہی وہ بول اٹھا:

''ارے رے رے، ارے رے رے، تو تم اس شیطان بڑھیا اور اس کے تینوں ابلیس بچوں کے ہاتھ پڑ گئے۔ اجی میں سمجھے ہوئے تھا تم ان کے بارے میں جانتے ہو۔ یہاں کا تو بچہ بچہ جانے ہے...''

''اجی کیا جانے ہے؟ تم یوں ہی امیر خسرو کی طرح پہیلیاں کہو گے کہ کچھ بتاؤ گے بھی؟''

''یارا میرے، میں واللہ یہ سمجھے ہوئے تھا کہ تم جانتے ہو۔ نہیں تو میں خود تمھیں آگاہی دے دیتا کہ وزیر پور کے آگے نہر کے موڑ پر معاملات سانجھ کے پھولتے ہی مخدوش ہو جاتے ہیں۔ وہ کمبخت ڈائن، پلیا کے ایک طرف بیٹھی ہوئی بظاہر بھیک مانگا کرتی ہے۔ پرلی طرف پلیا کے نیچے اس کے تینوں حرام کے جنے پوشیدہ رہتے ہیں۔ جب تین یا زیادہ مسافر گذرتے ہیں تو وہ پکارتی ہے، ''جماعت میں سلامت ہے!'' اور جب دو یا ایک مسافر ہوتا ہے تو پکارتی ہے ''اکیلے دوکیلے کا اللہ بیلی!'' اور یہ اشارہ سن کر وہ تینوں برم راچھس کی طرح بچارے راہگیر کو آ لیتے ہیں۔ کسی کا جان وہ کبھی نہیں مارتے، لیکن لوٹ کر اسے باندھ کر وہیں مرنے کے لیے چھوڑ کر چمپت ہو جاتے ہیں۔''

''لاحول ولا قوۃ،'' میں بڑبڑایا۔ ''مجھے ہی ان کا ہدف بننا تھا۔ پر اب کیا کروں؟ اتنی رقم تنکے کہاں سے لاؤں۔ کون دے گا مجھے اور دے بھی دے تو ادا کہاں سے کروں گا؟'' میں نے کف افسوس ملتے ہوئے کہا۔

''اجی میاں جی، دینے والے تو بہتیرے ہیں۔ کسی بھی ساہوکار کے یہاں چلے جاؤ۔ مال ہی مال ہے۔ لیکن مال کے پہلے وہ کھال کھنچوا لے گا۔''

''تو پھر میں کیا کروں؟'' میں نے جھونجھل میں آ کر تیز لہجے میں کہا۔'' مار مروں تو میری بیٹی کون بیاہے گا؟''

محمد عالم کچھ چپ سا ہو گیا۔ میں بھی دل ہی دل میں خفیف ہو رہا تھا کہ بے وجہ اسے جھڑک دیا۔ وہ بچارا تو میری مدد ہی کرنا چاہے تھا۔ پر جب اللہ ہی کو منظور نہ ہو تو بندے کا کیا چارہ۔ افسوس اور رنج میں میں یوں ہی بارہ باٹ ہو رہا تھا، مجھے ایسے سنکٹ کے سمیں میں دوستوں اور نیک صلاح مشورے کی ضرورت تھی۔

تھوڑی دیر بعد عالم نے سر اٹھایا اور کچھ شرمندہ سی مسکراہٹ مسکرا کر بولا۔'' کیوں نہ ہم لوگ دوستوں سے اپنا حال کہیں۔ تھوڑا تھوڑا کر کے بہت نہ سہی، کچھ تو ہو جائے گا۔''

''نہ، نہ بابا۔ بالکل نہ۔ بیٹی کو کیا منھ دکھاؤں گا؟ بیٹی سن لے گی کہ جمعہ واری چندہ لے کر اس کا بیاہ ہو رہا ہے تو وہ کچھ کھا کر سو رہے گی۔''

''اے لو میں چندے کو کب کہہ رہا ہوں۔ میں تو کہہ رہا تھا کہ سب سے تھوڑا تھوڑا ادھار بٹور کے...''

''کون مان کے دے گا کہ ادھار بھی چندے کی طرح بٹورے جاتے ہیں؟ میں بھی نہ مانوں گا۔ اور بالفرض میں مان بھی گیا تو دنیا کو کیا سمجھاتا پھروں گا... سنو رے بھائیو، یہ خیر خیرات نہیں، چندہ ہے۔ توبہ توبہ، مجھے باتوں میں نہ اڑاؤ محمد عالم صاحب۔'' مجھے رونا سا آ گیا۔

محمد عالم نے مجھے غور سے دیکھا۔ شاید اسے بھی لگا کہ میرا پیالہ بھرنے کو ہے۔ اس نے سر جھکا لیا۔ شاید وہ مجھ سے آنکھیں چار کرنے سے کترا رہا تھا۔ میں نے غصے میں اپنی پگڑی اتار کر پٹک دی اور کہا،'' گھر جاتا ہوں۔ وہاں اپنی عورت کے مائکے والوں کے سامنے ہاتھ پھیلاؤں گا۔ پھر تا عمر اس کے سامنے نکو بنا رہوں گا... ابے حرام زادے عالم تو نے مجھے آگاہ کیوں نہ کر دیا تھا کہ وہ جگہ...''

''رسان سے کام لے بھائی،'' عالم نے سر اٹھائے بغیر کہا'' اپنی بوٹیاں نوچنے سے کیا پائے گا؟''

''تو کیا کروں تیرا خون پی جاؤں؟''

وہ ہلکی سی ہنسی ہنسا۔'' اس سے کچھ بنتا ہو تو ابھی لے میں نبض پر خنجر سے نشتر کیے دیتا ہوں۔ پی لے۔''

میں نے سر پر دو ہتڑ مارے اور کہا،'' اچھا ٹھیک ہے۔ میں بفور ننگل خورد چلا جاتا ہوں۔ ہو

سوہو۔''

عالم ایک لمحہ چپ رہا، پھر ذرا ٹھہر ٹھہر کر بولا'' استاد ایک بات ہے... پر تو خفا تو نہ ہوگا؟''

میں نے منھ بنا کر کہا'' اس سے کچھ کام بنے تو وہ بھی کر دیکھیں گے۔''

''نہیں ذرا دھیان سے سن۔تو نے...تو نے امیر جان کا نام سنا ہے؟''

''کون، وہی امیر جان جے پور والی جو رئیسوں جیسے ٹھاٹھ سے رہتی ہے؟''

''ہاں ہاں، بالکل وہی۔گل خان تم نے سنا ہے کہ وہ تم سے مصیبت زدوں کی مدد بے کھٹکے کرتی ہے؟''

''مدد؟ وہ کیا مدد کیا کرے گی، ہے تو وہی کسبن مالزادی۔وہ ہتھیاتی ہے نہ کہ مٹھی کھولتی ہے۔''میں نے جھلاّ کر کہا۔'' اس کی کوئی عزت اور آدر بھی ہے؟''

''اماں سنو تو سہی، ذرا چھری تلے دم لو،'' عالم نے شاید دیکھ لیا تھا کہ میں اس کی بات سننے کو تیار ہوں، اس لیے اب وہ بے کھٹکے بول رہا تھا۔

''سن تو رہا ہوں، کیا تمھاری بغل میں گھس جاؤں؟''

''کہا یہ جاتا ہے کہ وہ پیدائشی کسبن نہیں ہے۔کسی غریب پر غیرت دار ماں باپ کی بیٹی ہے۔صورت شکل، ہنر، سگھڑاپا، سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کوئی اس کا ہاتھ تھامنے کو تیار نہ تھا۔''

''تو پھر؟ یہ سب مجھ سے زیادہ کون جانے ہے؟ میری۔تھا مجھ سے بڑھ کر کون جانے گا۔''

''پھر یہ کہ ایک ڈھونگی شریف زادے نے اس کی نسبت بالآخر مانگی اور بہت زور دے کر مانگی۔اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں۔باپ ماں نے کچھ پوچھے سمجھے بغیر اس کے ہاتھ پیلے کر دیے۔''

وہ چپ ہو گیا، شاید اسے میرا خیال آ گیا تھا کہ کہیں ہم بھی ایسا ہی نہ کرنے والے ہوں۔ میں بھی چپ رہا۔ قصے کا انجام کچھ کچھ سمجھ میں میری آ رہا تھا۔

عالم نے سر جھکائے جھکائے کہا:

''ان ذات شریف نے اس بچی کو جی بھر کے خراب کیا، پھر یہاں لا کر ایک بالا خانے پر بیچ دیا۔گھر والوں کو خبر ہوئی تو باپ نے تو نہیں، پر ماں نے بہت بلوایا، دودھ کا واسطہ دیا، مگر اس کو نہ جانا تھا نہ گئی۔اور جلد ہی اس نے ساری دہلی جیت لی۔اب کسی کے ہاں جاتی نہیں ہے...''

میں نے اچانک بات کو سمجھا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر بولا:

''تو اسی وجہ سے امیر جان...''

''بالکل۔ یہی بات ہے۔اسے معلوم ہو جائے کہ تم پر کیا پتا پڑی ہے تو وہ بے کھٹکے تمھیں قرض دے دے گی۔''

''پر...وہاں جاؤں کیسے؟اور وہ میری بات کیا یوں ہی مان لے گی؟''

''میں ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔فیروز شاہ جنت آرام گاہ کے کوٹلے سے ذرا ادھر اس کی شاندار حویلی ہے۔دروازے پر ہاتھی جھومتے ہیں۔''

''کوئی وسیلہ،کوئی ذریعہ بھی تو ہو۔''میں نے مایوس لہجے میں کہا۔'' اس پاس مجھ جیسے بیسیوں پہنچتے ہوں گے۔اسے کیا پتہ کہ میں چور ہوں کہ ٹھگ ہوں۔''

''تمھارا باپ خان جہاں کے یہاں نوکر تھا۔خان جہاں وہاں جاتے آتے ہیں۔شاید اپنے باپ کا ذکر اور ان کا نام اور خان دوراں سے ہمارا توسل...کیا پتہ کام بن جائے۔سب لوگ ایک سان تھوڑی ہیں۔بولی بولی آنچ جدی ہوتی ہے۔''

میں سوچ میں ڈوب گیا۔میرے آگے راہ کوئی نہ تھی۔امیر جان کے یہاں خان جہاں جیسے لوگ پہنچتے ہیں تو میرے لیے کیا ذلت ہے۔میں بھی ان کوچوں سے ناآشنا نہ تھا۔البتہ میری اڑان امیر جان جیسیوں کے بام تک نہ تھی۔کام اگر بن گیا تو بہت خوب اور اگر نہ،تو میرا کچھ نہ بگڑے گا۔جتنا بگڑنا تھا سوتو بگڑ ہی چکا۔

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔''کب چلو گے؟''

''بس ابھی۔نیک کام میں استخارہ اور حیص بیص کیسا؟اپنا وظیفہ میں واپس آکر پورا کرلوں گا اور تمھارا کام بن گیا تو حضور غوث الوریٰ کو ایصال ثواب کے لیے ایک وظیفہ اور پڑھوں گا۔''

''جزاک اللہ۔یہ احسان تمھارا مجھ پر رہا۔''

''احسان کا ہے کا،کبھی تم بھی کام آؤ گے۔چلو اٹھو اب تاخیر نہ کریں۔''

امیر جان کی حویلی،یا قلعہ دیکھ کر اوسان میرے اڑ گئے۔اللہ اللہ اتنا بلند مکان بھی کسی کو بہم پہنچ سکے ہے۔بہت بڑا اونچا پھاٹک،دونوں جانب محافظ خانہ،محافظ خانے کے اپر دو منزلہ حجرے جو شاید حوالی موالیوں کے لیے ہوں گے۔محافظوں میں کوئی مرد نہ تھا،کوئی ہندی بھی نہ تھا۔لمبی تڑنگی بہت مضبوط ہاتھ پیر والی،قزاقستان یا ترکستانی نسل کی،مسلح اور مکمل بارہ عورتوں کا دستہ۔گورے لیکن گرم کیے ہوئے تانبے جیسے تمتمائے ہوئے رخسار،بادام کی طرح آنکھیں،کسی ہوئی چھاتیاں،تنگ

شلوکوں سے ابھرے ہوئے ڈنڈ اٹھتے ہوئے بلکہ اگلے پڑتے ہوئے، بر میں چست پایجامے، اس قدر چست کہ رانوں پر گویا مڑھے ہوئے ہوں، لیکن ایسے نہیں کہ جسم کی نمائش کی جھلک بھی ہو۔ شلوکے کی آستینیں کلائیوں تک، دامن پیٹ کے ذرا نیچے تک، اس طرح کہ کنارے دامن کے ڈوپٹے سے کچھ ڈھک گئے تھے۔ سروں پر زری کی ٹوپی اور کمر میں زر نگار ڈوپٹے کے سوا کوئی آرائش ان کے بدن پر نہ تھی۔ شلوکا، پاجامہ، ڈوپٹہ، سب سیاہی مائل نیلے رنگ کے تھے، تاکہ تاثر مردانہ وجاہت کا مزید تقویت پائے۔ ٹوپیاں آسمانی مخمل کی تھیں، مگر سونے سے اس قدر لپی ہوئیں کہ نیلا رنگ بہت کم دکھائی دیتا تھا۔ سب بالکل تنی ہوئی کھڑی تھیں اور آتی جاتی دنیا کو نخوت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔

دروازے پر واقعی دو ہاتھی مہیب و بالا جھوم رہے تھے۔ جھولیں ان کی زربفت اور کمخواب کی، ان پر آسمانی مخمل سے مڑھا ہوا اور چاندی کے ڈنڈوں والا ہودہ، ہاتھیوں کے لمبے لمبے دانتوں پر آٹھ آٹھ چوڑے سونے کے، بھسونڈوں پر زعفرانی نقش و نگار، مسکیں گیرو سے رنگی ہوئی، تانبے کی جگمگاتی گھنٹیاں، ہاتھی دونوں پھاٹک کے دونوں طرف جمنا کے رخ پر کھڑے ہوئے تھے۔ کوئی آدھے کوس، یا کچھ کم کے فاصلے پر دریا اور اس کے گھاٹ، اور سطح پر ندی کے تیرتی ہوئی کشتیاں اور جہاز صاف نظر آتے تھے۔

اپنی عہدہ دار کا اشارہ پا کر، یا شاید آپ ہی آپ، ایک اردا بیگنی آگے آئی اور مجھ سے بے جھجک آنکھیں ملا کر بولی:

''کہیئے؟''

میں نے اٹک اٹک کر اظہار مدعا کیا کہ میں غریب سپاہی پیشہ اور مصیبت زدہ ہوں، ملنا چاہتا ہوں۔

''اور یہ آپ کے ساتھ ہیں، کیوں؟''

میں نے محمد عالم کا تعارف کرایا تو اس نے ذرا ہمت کر کے مسکرا کر ہم لوگوں کا توسل خان جہاں اور خان دوراں سے ظاہر کیا۔

کہیں سے کوئی اشارہ پا کر ایک اردا بیگنی اندر گئی۔ ہم لوگ یوں ہی دھوپ میں کھڑے رہے۔ کسی نے ہمیں قریب آنے یا بیٹھ جانے کی دعوت نہیں دی۔ امیر جان کی حویلی جس گلی میں تھی اس میں ایک ہی دو گھر اور تھے، اس لیے لوگوں کی آمد و رفت بہت کم تھی۔ بس ایک شربت عطر کی

دوکان کی اور ایک پھولوں کے گجرے والا سامنے اپنا ٹھیہا جمائے ہوئے تھا۔میں نے سوچا،ایک موتیا اور گلاب کا ہار میں بھی خرید لوں،نذر کردوں گا۔لیکن ہیاؤ نہ کھلا۔خدا معلوم اس کا کیا مطلب نکالا جائے۔میری ہستی ہی کیا تھی،ایک مجہول سا احدی جس کا سارا تعارف اس کے مالکان تھے۔

ہم کھڑے سوکھتے رہے۔بڑی دیر بعد میں مایوس ہو کر واپس ہونے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اندر سے بلاوا آگیا۔جلد جلد ہاتھوں سے پسینہ پونچھ کر اور ہاتھوں کو چپکے چپکے ڈوپٹے پر خشک کر کے ہم اندر گئے۔

میں نے سمجھا تھا کہ محافظ خانے کے اندرونی دروازے بعد سہ رویہ بارہ دریاں ہوں گی، بیچ میں چمن ہوگا، ذرا سایہ اور خنکی کا ماحول ہوگا۔لیکن وہاں تو دائیں ہاتھ کو ایک تنگ لیکن اونچا سا زینہ تھا اور ہمارے سامنے ایک لمبا گلیارا تھا جس میں جگہ جگہ روزن تھے اور طاقوں میں چراغ روشن تھے۔

ہم چلتے چلے گئے۔خدا خدا کر کے گلیارہ ختم ہوا۔پھیر ایک دالان اور کچھ کمرے،ایک کمرے میں ہمیں ٹھہرادیا گیا۔کچھ انتظار کھینچنے کے بعد پھیر بلاوا آیا۔اب ہم ایک بڑے ایوان میں اللہ اللہ نقش و زیبائش اس ایوان کے بھلا کون بیان کر سکے ہے۔اور سچ پوچھئے تو مجھے آنکھ اٹھانے کی ہمت نہ ہورہی تھی۔بس یہی کہہ سکوں ہوں کہ ہر طرف روشنی بے شمار ہورہی تھی۔جابجا بیضے اور کنول روشن تھے۔

''تسلیمات،'' ایک بہت ہی میٹھی لیکن صاف اور جھانجھن سی بجتی ہوئی آواز میں کسی نے کہا۔ ''آپ خان جہاں لودی مسند علی خان کی سرکار میں نوکر ہیں؟''

''جی...جی نہیں۔میرا باپ ان سے متوسل تھا۔ہم دونوں دراصل خان دوراں اسد خان بن مبارک خان بہادر کے فوجی دستے میں سپاہی ہیں۔''

رک رک کر،سر جھکائے جھکائے ، میں نے اپنی رام کہانی سنائی۔اس دوران تھوڑا بہت مشاہدہ کرنے کی ہمت پڑی لیکن میں امیر جان کا حلیہ نقشہ بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ان کی پشت پر دو خواصیں پنکھا جھل رہی تھیں،دائیں بائیں باہر والیوں جیسی دو اردا بیگنیاں مودب تھیں۔کوئی سامان وہاں نشاط و غنا کا نظر نہ آتا تھا۔پیتل کے بڑے بڑے پنجڑوں میں کئی خوش نوا پرند ضرور تھے،لیکن میں ان میں سے کسی کو پہچان نہ سکا۔مجھے خیال آیا کہ حضرت عرش آرام گاہ فیروز شاہ تغلق کے بارے میں مشہور تھا کہ انھوں نے اپنے کوٹلے کے سامنے ایک الگ عمارت میں دنیا جہان کے عجائب جانور اور انسان اور لاکھوں کروڑوں برس پہلے کے وحوش وطیور کی ہڈیاں جمع کر رکھی تھیں۔

ہمارا پورا حال سن کر امیر جان نے پشت پر کھڑی ہوئی ایک خادمہ کو اشارہ کیا۔ وہ کسی بغلی دروازے سے باہر گئی اور تھوڑی دیر بھی نہ ہوئی تھی کہ چار بدرے لے کر حاضر ہوئی۔ دوسرے اشارے پر وہ بدرے اس نے میرے ہاتھ کی طرف بڑھائے۔ میں نے ایک کیفیت اضطراری سے مغلوب ہو کر ہاتھ بڑھایا اور بدروں کو لے لیا۔

''یہ چار سو تنکے ہیں۔ ساڑھے تین سو جو آپ نے گنوائے اور پچاس میری طرف سے آپ کی بیٹی کو جہیز قبول کیجیے۔''

''میں... م... مگر یہ قرض فوراً ادا نہ کر سکوں گا۔''

''پچاس تو قرض ہی نہیں، بقیہ کے لیے آپ کو اختیار ہے۔ آپ کی نیت صاف ہو، یہ شرط ہے۔''

میں کچھ اور عرض معروض کرنے والا تھا کہ امیر جان نے منھ پھیر لیا اور ان کی خادماؤں نے جھک کر ہمیں سلام کیا، یہ گویا ہماری رخصت تھی۔

میری لاڈلی بیاہی گئی اور بڑی دھوم دھام سے بیاہی گئی۔ شری رگھو راج بہادر سنگھ کو بھی میں نے اپنی ماں کی دعاؤں کے ساتھ رقعہ بھیجا۔ انھوں نے ایک دوپٹہ بنارسی، پانچ تنکے اور مٹھائی بھیجی۔ سلطان عالی مقام کے بموجب فرمان کے میں نے پورا لحاظ اس بات کا رکھا کہ کوئی رسم غیر شرعی نہ ہو، یعنی ایسی نہ ہو جو محض ہندوؤں میں رائج ہو۔ ایک بات پھر بھی ایسی تھی جو مسلمانوں میں رائج تھی، پر کم، اور وہ یہ کہ نکاح کے کئی مہینے بعد رخصتی ہوئی۔ نکاح کے دس ہی بیس روز بعد خبر اڑی کہ سلطان والا شان خداوند عالم سکندر لودی آگرے سے دہلی کی راہ میں واصل بحق ہوئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اس شان و جاہ و دبدبے کا سلطان چشم فلک اب کیا دیکھی گی۔ دہلی سے آگرے انتقال میں شاید فال نیک اس کے لیے نہ تھی۔ آگرہ اتنا کچھ نہ بن سکا جتنا میرے مرحوم سلطان کی تمنا تھی۔ اور دہلی انھیں بار بار نزول اجلال کرے ہی بنے۔ ہر چند کہ سلطان کی صحت اب گرتی جا رہی تھی، لیکن کسی کے شان گمان میں بھی نہ تھا کہ انجام زندگی اس قدر نزدیک ہے۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ دہلی نہ چھوٹتی تو شاید جان بھی نہ چھوڑنی پڑتی۔ یہ حادثہ دہلی کی راہ ہی میں وقوع پذیر ہوا تھا۔

سلطان کے جنت نشین ہونے پر ارباب حکومت میں تغیر و تبدل ہونا ہی تھا۔ نہ معلوم خان جہان اب کون بنتا اور خان دوراں کا عہدہ کسے ملتا اور اسد خان بہادر کی کیا حیثیت بندگان عالی کی بارگاہ مبارک میں ہوتی۔ میں بہانہ رخصتی کا کر کے ساری مدت گھر پر ہی رکا رہا۔ رخصتی کے بعد میں

جورو اپنی کو سمجھاتا رہا کہ سکہ خطبہ بدلا ہے، دیکھیں ابھی کیا ظہور میں آتا ہے۔خان اسد خان کا رسالہ شاید رہے نہ رہے۔ جب وہ بلوا بھیجیں گے تو چلا جاؤں گا۔ابھی مجھے کھیتی باڑی دیکھنے دو، کچھ آرام کرنے دو۔ پھر دیکھیں گے۔

ایک سال گذر گیا۔ پھر دو سال۔ کہتے ہیں داماد کی تقدیر درحقیقت بیٹی کی تقدیر ہوتی ہے۔میری بیٹی اس قدر بھاگوان نکلی کہ اس کے میاں کا کام نجاری کا بہت جلد اور بہت خوب چل نکلا۔ان کا گاؤں ننگل خورد کے پاس ہی تھا،اس لیے انھیں ہمارے یہاں آتے رہنے میں کوئی پریشانی نہ تھی۔ پھر داماد سے معرفی حاصل کر کے لوگ میرے پاس سپہ گری کے فنون، کشتی کا داؤ پیچ،تلوار اور نیزے کی دیکھ بھال اور بناوٹ کے طریقے سیکھنے آنے لگے۔ مجھے گھر بیٹھ رہنے کا اچھا بہانہ ہاتھ آیا،اور اس سے بڑھ کر یہ کہ امیر جان کا قرض ادا کر سکنے کی سبیل نکل آئی۔ میں اپنے اوپر رہتا تو یہ قرض تین کہ چار سال میں بھی ادا نہ ہو سکتا تھا۔سپہ گری کا حال میں آپ کو سنا چکا ہوں کہ آرام تھا لیکن دولت نہ تھی۔ مجھے اللہ کی ذات سے امید تھی واپس دہلی جاؤں گا تو اپنے سب شوق بند کر کے جیسے بھی ہو ماہ بہ ماہ چار تنکے بچاؤں گا۔ گھر بھیجنا بھی ایک تنکہ کم کردوں گا۔اس طرح اگر نئی مصیبت کوئی نہ آگھیرتی تو چھ سات برس میں ادائیگی کی صورت بن سکتی تھی۔ اب یہاں مجھے جو کام ملنے لگا اور گھر کی کھیتی میں اتنا پیدا ہونے لگا کہ مجھے الگ سے کچھ لگانا نہ پڑتا تھا۔ بٹی کا خرچ کچھ تھا نہیں،سوائے اس کے کہ تیج تہوار، پیدائش،شادی بیاہ پر کچھ دینا دلانا پڑتا۔ بیٹا میرا ابھی اب بڑا ہو کر بہنوئی کے پاس کام سیکھنے لگا تھا۔

تیسرا سال ختم ہونے کو تھا جب میں نے دیکھا کہ اب میں بہت جلد امیر جان کا قرض چکا سکوں گا۔ خداوند عالم ابراہیم لودی نے دارالخلافہ دہلی پھیر لیا تھا۔لیکن خان جہاں اور دوراں کے عہدے اب لگ خالی تھے۔ میں نے سنا کہ سلطان کا خیال تھا کہ ان بڑے بڑے عہدہ داروں کے بغیر ہی کارِ سلطانی چل سکتا ہے۔میرے خان نے شاید اپنا رسالہ دوبارہ ترتیب نہ دیا تھا،یا شاید ترتیب دیا تھا تو مجھے بلوایا نہ تھا۔عالم بہاری کی جانب سے بھی کچھ نامہ و پیام نہ تھا۔شاید وہ رسالہ برہم ہی ہو گیا ہو، میں نے سوچا۔

میری بیٹی کو اللہ نے ایک چاند سا بیٹا دیا تو خوشیوں کا نیا موقع ہم سب کے ہاتھ لگا۔ میں نے دل میں کہا کہ یہ دہلی واپس جانے اور امیر جان کا قرض ادا کرنے کے لیے اچھا شگون ہے۔اب کی بار مہوٹین تھیں، موسم بہت خوشگوار اور تر و تازہ کن تھا۔ میں نے اللہ کا نام لیا، امام

ضامن بازو پر بندھوایا، میری ماں نے کسی ہندوانی دیوی کا صدقہ بھی اتارا اور میں صبح کے وقت عازم دہلی ہوا۔ سنہ ۹۲۸، بکرید گذار کر ذی الحجہ کا مہینہ ختم پر تھا۔ کوار کا مہینہ لگ چکا تھا۔ دن بھی خوب چمک رہا تھا، پر آسمان پر کہیں کہیں بادلوں کی جھلک موسم کی سردی کا دھیان دلاتی تھی۔ چیل کوّے گوریاں درختوں اور آسمانوں میں شور مچاتے پھرتے کہ سردیاں اب واپس آنے والی ہیں۔ باغوں میں موروں کی کثرت تھی۔ کالے تیتر اپنے اپنے بھٹ سے نکل کر اتراوتے پھر رہے تھے۔ تنومند، بلند و بالا نیل گائیں، بارہ سنگھے، چھریرے چیتل، کانکر، لمبی پیچ دار سینگوں والے کالے، ٹھگنے چوسنگھے، سبھی طرح کے ہرن ہر موڑ پر اور ہر کھلی جگہ پر دکھائی دیتے اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاوتے۔ گھوڑا میرے پاس تھا نہیں، اور یوں بھی لمبی رقم ساتھ لے کر تنہا چلنے کا خمیازہ میں کھینچ چکا تھا۔ اب واقعی جماعت میں سلامت تھی۔

دوسرے دن میں دہلی پہنچا۔ دنیا پہلے جیسی لگ رہی تھی۔ سلطان نیا تھا تو کیا ہوا، شہر تو وہی تھا۔ فیروز شاہ جنت آشیانی کے کوٹلے کے پہلے کچھ آبادی نہ تھی۔ مٹکا شاہ صاحب کی درگاہ، پھیر قلعۂ کہنہ، اور ان کے درمیان کہیں بی بی فاطمہ سام کی درگاہ، سب کچھ یوں ہی تھا۔ مٹکا شاہ صاحب کی درگاہ پر اب بھی ہیجڑے اور زنانے حسب معمول جھاڑو لگاتے، زائرین کو پانی پلاتے، حسب معمول جھاڑو لگاتے، زائرین کو پانی پلاتے، بابا نظام الدین صاحب سلطان جی کے گن گاتے۔ سب ویسا ہی تھا۔ میرے سلطان سکندر لودی صاحب کا مزار تکمیل کے قریب تھا۔ سلطان بہلول لودی عرش آشیانی تو بہت دور خواجہ قطب صاحب کے کچھ پہلے ذرا ہٹ کر ابدی نیند سو رہے تھے لیکن ان کا سکہ ہنوز رواں تھا۔

مجھے امید تو نہ تھی، لیکن ایک خیال سا تھا کہ خان دوراں سابق کا رسالہ ابھی موجود ہوگا تو شاید میرا دوست بھی وہیں مل جائے اور رات ٹھہرنے کا سہارا ہوجائے۔ موٹی رقم میری ہمیانی میں تھی، اسے ساتھ لیے لیے پھرنا، یا کسی ان جانی سرائے میں لے جانا اور رات گذارنا، کچھ بہت دلچسپ بات نہ تھی۔ غیاث پور بھی حسب معمول وہیں تھا، لیکن رسالے کا خان دوراں کے کہیں پتہ نہ تھا۔ ادھر ادھر پوچھا تو پتہ لگا کہ خان دوراں کو بھڑائچ کسی مہم پر بھیج دیا گیا ہے لیکن ان کی فوج اور رسالے کہاں ہوں گے، اس باب میں کچھ کہنا مشکل تھا۔ مجبور ہوکر میں نے فیروز شاہی سرائے میں رات رہنے کی ٹھانی۔ سب سے قریبی سرائے تغلق آباد کی سرحد پر بدر پور میں تھی۔ وہاں سے دہلی

بہت دور تھی اور کوٹلہ فیروز شاہ، جس کے پچھواڑے والے گاؤں فیروز آباد میں جا کر مجھے امیر جان کا قرض اتارنا تھا، اور بھی دور تھا۔ پر مرتا کیا نہ کرتا، اب پرانے دوستوں کو کہاں ڈھونڈوں، سرائے کی بھٹیارن ہی کی مہمانداری پر قناعت کرلوں گا۔

صبح ہوئی تو میں نے توجہ معمول سے زیادہ اپنی تراش خراش اور درست کرنے اپنی وضع قطع میں لگائی۔ سب سے پہلے تو ہمیانی ہی کو ٹٹول کر دیکھا تھا کہ سلامت ہے کہ نہیں۔ بارے سب محفوظ تھا۔ امیر جان کا قرض چکانے یا شاید ان کو دیکھنے کا ذوق اس قدر تھا کہ میں ناشتا ہی نکل کھڑا ہوا۔ کئی فرسنگ کا فاصلہ تھا، ایک گھوڑا کرائے پر لیا اور عام فیروز آباد ہوا۔

سفر میں ایک گھنٹے سے کچھ اوپر لگا۔ جمنا پر چہل پہل ویسی ہی تھی۔ پر یہ کیا؟ وہ حویلی تو کچھ خالی خالی سی لگ رہی تھی۔ نہ وہ فیل ہائے کوہ پیکر، نہ وہ اردا بیگنیاں، نہ وہ سامنے عطر فروش اور گل فروش تھے۔ یا اللہ یہ ماجرا کیا ہے۔ کچھ دیر یوں ہی کھڑا فکر میں ڈوبا رہا۔ کیا انھوں نے حویلی چھوڑ دی، کہ دہلی ہی چھوڑ دی؟ کسی سے شادی کر کے شوہر کے پاس تو نہیں اٹھ گئیں؟ والدین نے راضی کر کے انھیں جیپور واپس بلا لیا کیا؟

ناگاہ ایک بھلے مانس سے آدمی ادھر سے گذرے اور مجھے چپ چاپ کسی فکر میں غرق دیکھ کر ٹھٹکے اور بولے:

''کیا جناب کو کہیں جانا ہے؟ راستہ بھول گئے ہیں؟''

''جی نہیں... ایسا تو کچھ نہیں۔ وہ... بات یہ ہے کہ سامنے والی حویلی میں...''

''امیر جان کو پوچھتے ہیں آپ۔ حضت وہ تو اللہ کو پیاری ہوئیں۔''

''اللہ کو پیاری... کیا بات کہتے ہیں جناب۔ میں جب ملا تھا تو وہ اچھی خاصی جوان جہان تندرست تھیں۔ یہاں حویلی پر شان اور ہی تھی۔''

''تھی صاحب من۔ مگر عرصہ کوئی ایک سال ایک کا ہوا کہ ان کا بلاوا آ گیا۔''

''کیوں... کیسے... معافی چاہتا ہوں، آپ سے جرح نہیں کر رہا ہوں۔ اطمینان اپنا چاہتا ہوں کہ کہیں کچھ...''

''جی نہیں میاں صاحب، کہیں کچھ اور نہیں۔ سب کچھ وہیں ہوا۔'' انھوں نے دریا کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''جی میں سمجھا نہیں۔''

''بات یہ ہوئی کہ انھوں نے اپنے لیے ایک مورپنکھی نئی بنوائی تھی۔اسے اتارنے کی دریا میں عجلت انھیں بہت تھی۔لوگوں نے کہا کہ چندے توقف کریں،دریا ان دنوں چڑھائی پر ہے۔پر عورت ذات ضدی تو ہوتی ہی ہے،پھیر آپ جانو ان کے ناز اٹھانے والے بے شمار۔مورپنکھی کوسازوسامان سے آراستہ کر کے اس میں کچھ اورلوگوں کے ساتھ بیٹھیں اور رسہ کھولنے کا حکم دیا۔ندی کیا تھی کہ بپھرا ہوا دیو تھی، پانی کے ریلے پر ریلے آرہے تھے۔ابھی ٹھیک سے آگے بھی نہ آئے تھے کہ ایک زور کی لہر آئی اور مورپنکھی کو منجدھار میں کھینچ لے گئی۔پھر تو یہ جا،وہ جا۔مورپنکھی کی بساط ہی کیا؟ آناًفاناً میں ہچکولے کھانے لگی اور اس کے پہلے کہ مرجئے اور ملاح پانی میں اتریں اتریں،کشتی میں سوار سب لوگوں کی کشتی حیات طوفانی ہوگئی۔سب ختم ہوگیا۔''

''انا للہ وانا الیہ راجعون۔''میں نے حزن بھرے لہجے میں کہا۔ لاالٰہ الاانت سبحانک انی کنت من الظالمین مجھے حضرت یونس کی قرآنی دعا یاد آئی۔مگر امیر جان کو کسی مچھلی نے نہیں نگلا تھا۔ انھیں تو مچھلی کے مستقر کو اپنا مستقر بنانا بدا تھا۔

''لاش نہیں ملی؟''میں ہمت کر کے پوچھا۔

''ملی۔تیسرے دن آپ ہی آپ کنارے آگی۔''

''کہاں مدفون ہوئیں؟ کیا جیپور لے جائی گئیں؟''

''نہیں،ان کی وصیت تھی کہ جب بھی میں مروں مجھے سیدی مولی صاحب کے مزار کے سامنے والے قبرستان میں دفن کیا جائے۔وہی ہوا۔''ایک لمحہ چپ رہ کر انھوں نے ٹھنڈی سانس لی۔''اللہ بخشے بڑی نیک بی بی تھیں۔''

''سنا ہے ڈوب کر مرنے والے شہید ہوتے ہیں۔''

''ان کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔''انھوں نے سنسان حویلی کی طرف سر کا ہلکا سا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہم سب کو وہیں جواب دہی کرنی ہے۔میں متشکر ہوں کہ آپ نے زحمت کی،سب حال بیان فرمایا۔ورنہ میں تو بھٹکتا ہی رہتا۔''

ہم دونوں نے مصافحہ کیا،پھر وہ اپنی راہ چل دیئے۔میں کھڑا سوچتا رہا۔اب امیر جان کا قرض تو ادا ہوگا نہیں۔ان تنکوں کا کیا کروں اور خود کہاں جاؤں؟ شاید سب سے پہلا فرض میرا تو یہ ہے کہ قبر پر ان کی جاؤں اور فاتحہ پڑھوں۔سیدی مولی صاحب کا مزار اور اس کے سامنے کا قبرستان

مجھے خوب جانا بوجھا تھا۔ نظام الدین صاحب سلطان جی کی درگاہ کے کچھ ہی ورے تو تھا، بیچ میں کھلی زمین صحرا کی طرح تھی۔ اس کے ذرا آگے غیاث پور کا گاؤں تھا۔ پھولوں اور پیڑوں کے باعث قبرستان خاصا پر فضا تھا۔ قمریاں اور کبوتر اور فاختائیں کے غول ہر طرف یا ہو اور غٹرغوں کرتے دانہ چنتے نظر آتے تھے۔ مور بھی کثرت سے تھے۔ کبھی کبھی تیتر، لومڑیاں اور خرگوش بھی دکھائی دے جاتے۔ بابا سلطان جی صاحب کے نام نامی پر لگائی ہوئی سبیل پر پانی ہر وقت موجود رہتا۔ فاتحہ پڑھنے والے ہر وقت ہی آتے جاتے رہتے تھے۔ میں ابھی چلا چلوں تو اس کام سے فراغت ہو جائے۔ پھیر حضرت سلطان جی صاحب اور امیر خسرو کے آستانے پر بھی ماتھا ٹیک لوں گا۔

گھوڑا میرے پاس تھا ہی، میں فوراً چل پڑا۔ سیدی مولا صاحب کے مزار پر رونق ان دنوں کچھ کم رہتی تھی۔ مجھے ان کے عروج کے زمانے یاد آئے۔ لوگ بتاتے ہیں کہ انھیں دست غیب تھا۔ روز ایک اشرفی سے کم نہ خرچ کرتے تھے۔ خاص موقعوں پر اور بھی داد و دہش تھی لیکن ذریعۂ آمدنی بظاہر کوئی نہ تھا۔ دوسرے پیر فقیروں کی طرح وہ فتوح، نذرانہ، ہدیہ کچھ قبول نہ کرتے تھے۔ وہ کون تھے، کہاں سے آئے تھے، یہ بھی کھلتا نہ تھا۔ سیدیوں کی نسل سے ہونے کے بسبب بہت لمبے، قوی ہیکل، سیاہ فام تھے۔ اور سیدیوں کے برخلاف داڑھی نہایت لمبی، گھن کی اور گھونگر والی تھی۔ آنکھیں ہر وقت سرخ رہتی تھیں۔ کہتے ہیں دن ہو یا رات، ہر وقت کوئی نہ کوئی ان کے پاس بیٹھا رہتا تھا اور سب دیکھتے تھے کہ وہ کسی وقت سوتے نہیں ہیں۔ بہت سے بہت خانقاہ میں کسی ستون سے ٹیک لگا کر کچھ دیر کو آنکھیں بند کر لیتے تھے لیکن کسی بھی نئے شخص کی آہٹ پر آنکھیں کھول کر اس کی جانب متوجہ ہو جاتے تھے۔ وہ خود بھی اسلحہ باندھتے تھے اور دوسروں کو بھی تلقین کرتے کہ سنت ہے۔ آدمی کے لیے بہتر ہے کہ کوئی بھی سنت نہ چھوٹے۔

وہ کسی رئیس، کسی فوجی عہدے دار، کسی سلطانی صاحب اختیار، حتیٰ کہ سلطان وقت کے وہاں بھی نہ جاتے تھے۔ دھیرے دھیرے ان کے یہاں اتنا مرجوعہ ہونے لگا اور سب کے سب اسلحہ بند، کہ کوتوال شہر کو ان پر شک ہونے لگا کہ یہ کچھ کرنے والے تو نہیں ہیں۔ سلطان جلال الدین خلجی کا زمانہ تھا، سلطان کو کوتوالی پرچہ لگا کہ سیدی مولی کے لچھن برے معلوم ہوتے ہیں۔ سلطان جلال الدین ہر چند کہ نہایت نرم دل اور صلح جو حاکم تھا، لیکن بار بار کے پرچۂ اخبار اور پھر اس کے اپنے اپنے مخبروں کی اطلاعات یہی کہتی تھی کہ سیدی مولی کے مریدان سب مسلح رہتے ہیں۔ کچھ نذر فاتحہ نہیں لاتے لیکن کھانا سب کو پیٹ بھر ملتا ہے۔ ان کی خانقاہ میں آنے والوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔

سلطان روز روز کی خبروں سے متوحش ہوا اور اس نے متعدد بار سیدی مولی کو دربار میں طلب کیا۔ لیکن وہ کہاں سننے والے تھے۔ اب سلطان کا شک یقین میں بدل گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اس نے اپنے درباری مفتی سے فتویٰ طلب کیا کہ ایسے شخص کی کیا سزا ہو جو بارہا طلبی پر بھی دادگاہ سلطانی میں حاضر نہیں ہوتا۔ مفتی صاحب کو سلطان کے عندیے کی خوب فہم تھی۔ انھوں نے اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکمکی دلیل پر فتویٰ دیا کہ ایسا شخص واجب القتل ہے۔ سلطان کو تو بس حیلۂ شرعی کی تلاش تھی۔ اس نے فوراً سیدی مولی کو بجرم حکم عدولی سلطان عادل قتل کرادیا اور ان کی خانقاہ لٹوا کر کھدوا ڈالی اور منادی کرادی کہ سیدی مولی کے مریدین فوراً توبہ کریں ورنہ عتاب سلطانی کے مستوجب ہوں گے۔

اللہ کی شان، جہاں میلہ لگا رہتا تھا اور حلوے کی دیگیں گرم ہوتی تھیں اور نان کے تندور دہکتے تھے وہاں اب پرندہ بھی پر نہ مارتا تھا۔ اصحاب دل کی آنکھیں بھر آئیں۔ کچھ نے تو کھلے بندوں کہا کہ سلطان نے اچھا نہیں کیا۔ بے گناہ خون رنگ لائے بغیر نہ رہے گا۔ اور یہی ہوا۔ کچھ ہی مدت گذری تھی کہ سلطان کے سگے بھتیجے علاء الدین نے کڑا کے مقام پر قتل اسے کرا کے لاش دریائے گنگ میں پھکوادی۔ تاج تو اس کا ایک مچھیرن کے ہاتھ لگا لیکن سر کہیں نہ ملا۔ سیدی مولی کا مزار ازسرنو بنا اور زیارت گاہ خاص و عام ہوا اور اب لگ یوں ہی ہے۔ لیکن آج ڈھائی سو برس بعد بھی مزار پر شہید کے جلال اس قدر برستا ہے کہ کوئی دیر تک وہاں ٹھہرتا نہیں۔ میں نے مزار کے سامنے سے گذرتے گذرتے سلام کیا اور نیت کی کہ امیر جان کے یہاں فاتحہ خوانی کے بعد آپ کے مزار پر فاتحہ پڑھوں گا، پھر سلطان جی کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔

قبر ڈھونڈنا امیر جان کی چنداں مشکل نہ تھا کہ قبر کے کچھ ہی فاصلے پر پانی کی سبیل تھی۔ اگرچہ وہاں اس وقت سناٹا تھا، لیکن لوح مزار دیکھ کر میں فوراً پہچان گیا۔ طاق میں کالک کا داغ بہت ہلکا تھا، گویا چراغ یہاں کبھی ہی کبھی جلتا ہو۔ مجھ پر اچانک رقت طاری ہوگئی۔ آہ زندگی میں کیا رونقیں تھیں اور اب کیا بے سروسامانی ہے۔ اول و آخر فنا ہی فنا ہے۔ مولائے کریم سب کا انجام بخیر کرے۔ لیکن یہ کیا، پرلی طرف قبر میں ایک شگاف سا نظر آرہا تھا۔ ہائے افسوس، بجو اور کفن دزد یہاں بھی باز نہیں آتے۔ میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی کہ کچھ جھاڑی جھنڈی خس و خاشاک ہو تو مٹی پتھر ملا کر شگاف کو بند کردوں۔ چشم زدن میں سب مہیا ہو گیا اور میں شگاف کے اپر آیا کہ احتیاط سے اسے پاٹنے کی سبیل کروں۔ لیکن میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔ قبر کے اندر روشنی سی تھی۔ اندر کوئی چور تھا

کیا؟ لیکن ایسا دلاور چور کہاں جو قبر کے اندر چراغ لے کر جائے۔ میں نے دور ہی دور سے آنکھیں گڑا کر دیکھا۔ کچھ سبز سے رنگ کی روشنی تھی، آنکھیں ٹھنڈی ہوئی جارہی تھیں۔ ہمت کر کے میں دوبارہ نزدیک گیا، لیکن اس کے پہلے میں چاروں جانب نگاہ دوڑائی کہ کوئی اور نظر آجا تو اس سے امداد کی التجا کروں۔ کوئی بھی نہیں تھا۔ ساری قمریاں، کبوتر، مور، سب بالکل چپ ہو گئے تھے، جوں کر سورج گرہن کے اندھیرے میں وحوش و طیور سب چپ ہوجاتے ہیں۔ مجھے اور بھی ڈر لگ رہا تھا لیکن وہ روشنی مجھے اپنی طرف کھینچتی سی لگ رہی تھی۔ اب جو غور سے دیکھا تو روشنی کچھ بڑھ سی گئی تھی اور لگتا تھا کہ شگاف میں کسی نے میرے لیے مشعل رکھ دی ہو۔ لیکن دن چڑھ کر اب نصف النہار کے قریب تھا۔ ایسے میں مشعل کی کیا لم ہو سکے ہے؟ مجھے بلانا مقصود تھا تو...لاحول ولا قوۃ یہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ قبر میں سے کوئی کسی کو بلاتا ہے اور میں ہوں بھی کون کہ مجھے بلایا جائے۔ میں امیر جان کے ساتھ سرسری جان پہچان کا بھی دعویدار نہ ہوسکتا تھا۔ تو کیا یہ آسیبی کارخانہ ہے؟ میری زبان پر بے اختیار آیت الکرسی جاری ہوگئی۔ پھر میں نے معوذتین کا ورد کیا۔ پھر آیت الکرسی کی تلاوت کی۔ معاً میرے دل میں خیال آیا کہ قرآنی آیتیں اتنی پڑھ ہی میں چکا ہوں، انھیں کو فاتحہ قرار دے کر ایصال ثواب کروں اور الٹے پاؤں...مگر اس روشنی میں عجب سی کشش ہے۔ یا پھر یہ سب میرا وہم ہے۔ کیا معلوم سیدی مولی صاحب جیسا کوئی صاحب تصرف یہاں بھی دفن ہو اور کسی بنا پر اثر ان کا مجھ پر ہو رہا ہو۔ یہاں سے چل لینا ہی...میں نے جلد جلد دل ہی دل میں امیر جان کو ایصال ثواب کیا۔ یا اللہ اگر یہ کوئی کارخانہ آسیب کا یا نعوذ باللہ عذاب قبر کا ہے تو اپنے حبیب کے صدقے تو اس اپنی ناچیز بندی کو اس مصیبت سے اس قہر سے نجات دے دے۔ میں نے منت مانی کہ اگر مجھے معلوم ہوجائے کہ امیر جان پر کوئی عذاب نہیں ہے اور یہ روشنی آسیبی نہیں ہے تو یہاں سے اٹھتے ہی سلطان جی صاحب کے مزار پر پورے ساڑھے تین سوتنکوں کی دیغ پکوا کر محتاجوں کو کھلاؤں گا۔ مگر دل میرا یہاں سے جانے کو بھی چاہ رہا ہے۔ ذرا اور جھک کر دیکھوں کہ اندر کیا ہے۔ اب جو غور کرتا ہوں تو پہلوے قبر میں کوئی شگاف نہیں بلکہ چور دروازہ سا ہے بالکل ٹھیک ٹھاک بنا ہوا۔ اور روشنی بھی کچھ ایسی ہے گویا کئی شمعیں فانوسوں میں روشن ہوں۔ اور یہ تو کچھ زینہ سا ہے اندر اترنے کا، جیسا کہ تہ خانوں میں ہوتا ہے۔ میرے قدم خودبخود اٹھتے جارہے ہیں بڑھتے جارہے ہیں۔ میں چور دروازے میں داخل ہوگیا ہوں۔ اب میں نیچے اتر رہا ہوں۔ کہیں وہ چور دروازہ بند تو نہ ہوجائے گا؟ مجھے علاء الدین کا جادوئی چراغ یاد آیا۔ جب علاء الدین نے چراغ دینے سے انکار کیا تو اس

کے ماموں نہیں... اس کے چاچا نے غار کا دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔ اگر یہ چور دروازہ بھی بند ہو گیا تو... لیکن مجھے کون سی چیز وہاں سے لا کے کس چاچا ماما کو دینی ہے مجھے کاہے کا ڈر لیکن اگر دروازہ بند نہ ہوا غائب ہو گیا؟ پھیر میں واپس کیونکے آسکوں گا؟ واپس لوٹ چلتے ہیں۔ ابھی تو چور دروازے سے آتی ہوئی باہر کی روشنی دکھائی دے رہی ہے ابھی وقت ہے۔

بہت بڑا، دور تک پھیلا ہوا، باغ۔ اس میں نہریں اور حوض اور مرمریں فوارے چھلچھلاتے ہوئے ہلکے کیوڑے کی آمیزش لیے ہوئے، معطر، پانی کی بوندوں سے روشن۔ شاخساروں میں بلبلیں اور کئی ایسے پرند جنھیں میں پہچانتا نہیں، چہچہاہٹ پوری فضا میں ٹھنڈی پھواریں چھوڑ رہی ہے۔ سرخی مائل بالوں والی گلہریاں درختوں میں آنکھ مچولی کھیل رہی ہیں۔ سامنے مرغزار کا سا سماں، سفید ہرن، چیتل، خرگوش، مور، سرخاب، آ آ کر حوض سے پانی پی رہے ہیں۔ ایک ہرن پانی پیتے پیتے ٹھٹک کر رک گیا ہے اور لمبی موہنی گردن کو موڑ کر بڑی بڑی حیرت زدہ آنکھوں سے کچھ دیکھ رہا ہے۔ دور آسمان میں بڑے بڑے پرند، عقاب اور سیمرغ جیسے، لیکن ان سے کسی کو گزند کا خوف نہیں۔ ایک دو عقاب کبھی غوطہ مار کر نیچے آجاتے ہیں تو ان کا سایہ پانی میں پڑتا ہے، ہرن شاید اسی سے بھونچکا ہو گیا ہے۔

عجب پُر بہار باغ ہے کہ بہار کو بھی اس بہار پر داغ ہے۔ نخل سرسبز و شاداب، جوبن پر گلاب، نسرین و نسترن بشکل معشوقان پُرفن، سرو و شمشاد جس سے قد محبوب کی یاد، رنگ گلہائے چمن شکل عارض محبوب گلبدن۔ ہوائے سرد چل رہی ہے، نشۂ بادۂ محبت سے لڑکھڑاتی ہے، ہر ایک شاخ شجر سے سر ٹکراتی ہے، لیکن دبے پاؤں چل رہی ہے۔ خیال ہے کہ ایسا نہ ہو پاؤں کی دھمک سے گرد اڑے اور عارض گل پر پڑے۔ نہریں بصد آب و تاب جوش زن، بہار پر ہر چمن، جام و صراحی موجود، اپنے رنگ پر ثمر ہائے امرود۔ شراب شبنم سے جام لالہ مملو ہے، اور مشک و عنبر کی اس میں خوشبو ہے۔ قمریاں نخل سرو پر بصد رعنائی و زیبائی بیٹھی ہیں۔ صدائے حق سرہٗ بلند، قلندر مشرب صدائے کو کو سے دردمند۔ صاف ثابت ہوتا ہے کہ کوئی درویش گوشہ نشیں یا ہو! یا ہو! کر رہا ہے۔ لباس خاکستری زیب جسم، ہر وقت یاد الٰہی میں مصروف ہے۔ اس کی صدائے حق سرہٗ پر ناپائداری دنیا موقوف ہے۔

(نوشیرواں نامہ، جلد اول، از شیخ تصدق حسین، ص ۹۱)

میں بڑھتا چلا گیا۔ حیرت کی بات یہ بھی دیکھی کہ سارے باغ میں باغبانیاں ہی باغبانیاں

تھیں، ایک سے بڑھ کر ایک طرح دار، اور مرد باغبان کوئی نہ تھا۔ نظر کی حد سے ذرا ادھر ایک بہت بڑی عمارت تھی۔ میں نے دو ہی چار قدم بڑھائے تھے کہ عمارت بالکل نزدیک آ گئی۔ امیر جان کی حویلی، ہو بہو جیسی میں دہلی میں ابھی دیکھ کر چلا آ رہا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ حقیقی حویلی بھورے اور سیاہی مائل سرخ پتھر کی تھی اور یہ حویلی سفید سنگ مرمر کی تھی۔ جیسے ٹھنڈے دودھ سے بھری چینی کی صراحی، اس قدر تری اور خنکی تھی کہ جی چاہتا تھا اٹھا کر منہ میں رکھ لیجئے۔ سامنے ہاتھی ویسے ہی جھوم رہے ہیں۔ تھوڑی دور پر جمنا اسی طرح بہ رہی ہے۔ گھاٹ پر نہانے والے کوئی نہیں ہیں لیکن بجرے، بادبانی کشتیاں، باربردار جہاز، سب حسب معمول رواں۔ ہم لوگ پہلی بار حویلی اصلی پر گئے تھے تو دن کا وقت تھا لیکن اس وقت شام لگتی تھی۔ اردا بیگنیوں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ میں درانہ اندر گھستا چلا گیا۔ ویسا ہی گلیارا، دائیں طرف ویسا ہی تنگ اور اونچا زینہ، لیکن اس بار ہر طرف وہی ہلکی سبز، کچھ نیلی گلابی روشنی، روشنی۔ گرمی یا حرارت کا بالکل شائبہ نہ تھا۔ اس بار جی نے کہا کہ گلیارے میں دھنسنے سے پہلے زینوں پر چڑھ کر دیکھوں وہاں سے کیا نظر آتا ہے۔

خلاف توقع اس بار زینہ بالکل روشن تھا۔ جوں کر روشنی میرے پیچھے پیچھے ہو، ساتھ ساتھ ہو کہ جہاں جاؤں وہاں روشنی پہلے ہی پہنچ جائے۔ مجھے بڑا ڈر لگا۔ یہ کیا اسرار ہے۔ جناتی کارخانہ ہے یا کچھ سحر و ساحری کا چکر ہے۔ مجھے آگے بڑھتے ہی جانا تھا، نہ جانے کیوں واپسی کا خیال اب میرے دل سے محو ہو چکا تھا۔ پیچدار زینہ لیکن تنگ نہیں، جیسے کہ قطب صاحب کی لاٹھ کے اندر جانے کے لیے زینے تھے۔ تو کیا یہ لاٹھ تھی اور بہت موٹی، چوڑی؟ میں نے سیڑھیاں گننی شروع کیں۔ مگر جلد ہی گنتی فراموش ہونے لگی۔ ہر دس بیس زینہ چڑھنے پر لگتا میں گنتی بھول گیا ہوں۔ یاد کرنے کی کوشش کرتا تو اور بھی خلجان ہوتا کہ سیڑھیاں گننا بلکہ سیڑھیاں چڑھنا درست ہے بھی نہیں۔ میں کتنی ہی سیڑھیاں طے کر لوں، انجام کچھ نہ ہوگا۔ میرا جی متلانے لگا اس خیال سے اب میں تا قیامت سیڑھیاں ہی چڑھتا جاؤں گا لیکن اب تو مراجعت کی بھی ہمت نہ تھی۔ میں نے ایک شخص کے بارے میں سنا تھا کہ اس نے شرط بدی کہ سامنے والے بہت ہی اونچے پیڑ کی پھننگ تک چڑھ جاؤں گا۔ درخت اتنا تنومند تھا کہ پھننگی بھی اس کی بہت موٹی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن جب وہ اوپر پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ پھننگی تک پہنچنے کے لیے جس ڈال پر چڑھنا ضروری تھا وہ ٹوٹی ہوئی ہے۔ آگے جانا غیر ممکن ہو گیا تھا۔ اس کا دل مایوسی سے بھر گیا لیکن اس نے گھوم کر نیچے دیکھا تو زمین بہت دور لگی، اتنی دور کہ اس کے پاؤں لرزنے لگے۔ اتنی دور نیچے کس طرح اتروں گا

میں۔اس کا دل مایوسی اور خوف سے بھر گیا اور وہ چلانے اور رونے لگا کہ بچاؤ بچاؤ میں گرا جاتا ہوں۔بالآخر اس کے دوستوں اور گاؤں والوں نے سیڑھیاں لگا کر اور رسیاں اوپر پھینک کر اسے بہزار خرابی نیچے اتارا۔

لیکن یہاں تو کوئی دوست کوئی گاؤں والا نہیں ہے۔میرا کیا ہوگا؟ اچانک زینے ختم ہو گئے، سامنے کھلی ہوئی چھت تھی جس پر وہی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔میں چار قدم آگے بڑھا۔دور قطب صاحب کی لاٹھ صاف نظر آتی تھی۔تو میں ابھی اسی قبرستان میں ہوں؟ سامنے میرے ایک بارہ دری مرمریں، دالان میں ایک دروازہ کھلا اور میں اندر چلا گیا۔

وہی منظر، قسم ہے اللہ کی بالکل وہی منظر تھا۔امیر جان کسی سلطان کی طرح صندلی پر متمکن، پیچھے دو خواصیں مورچھل لیے ہوئے، دائیں بائیں اردا بیگنیاں۔کہیں پردے کے پیچھے ارغنوں بج رہا تھا۔کوئی دھیمے سروں میں گا رہا تھا۔ہلکے سروں کی بوندیاں پڑ رہی تھیں۔ہر طرف عطر کی دھیمی دھیمی پھوار برس رہی تھی۔دور کہیں چڑیاں زفیل رہی تھیں، لیکن اس بار میں پہچانا کہ وہ لال تھے جو برسات میں خوب بولتے ہیں۔لگتا تھا زفیلیں ان کی چھت کے اپرے سے آ رہی ہیں۔

''ل...لی...لیجیے، میں آپ ک...کا ق...قرضہ و...واپس کرنے...'' بدقت میرے منھ سے نکلا۔

لیکن میری بات ختم ہونے کے پہلے ہی امیر جان گویا خواب سے چونکیں۔ان کے چہرے پر برہمی اور بیزاری کے آثار نمایاں ہوئے۔وہ ساری نرمی چہرے کی اور نزاکت بشرے کی مبدل بہ سختی ہو گئی۔

''تم یہاں کیسے آئے؟ تم یہاں کیوں آئے؟ چلو، فوراً باہر نکلو۔'' انھوں نے کچھ اس طرح کہا گویا مجھے پہچانتی ہی نہ ہوں۔

''جی...میں ...میں گل محمد ہوں، خان دوراں کے دستے میں ملازم ہوں...ملازم تھا۔آپ نے...''

اب ان کی بیزاری اور بھی نمایاں ہونے لگی تھی۔انھوں نے صرف رخ پھیر کر بلکہ پہلو میری طرف سے موڑ کر اردا بیگنیوں کیطرف دیکھا اور چیں بجبیں ہو کر حکم دیا:

''کھڑی دیکھتی کیا ہو؟ جانتی ہو نا محرم کو یہاں آنے کی اجازت نہیں۔اسے دھکے دے کر نکالو، دفع کرواسے۔''

دونوں میں سے ایک اردا بیگنی خنجر ہاتھ میں لے کر میری طرف بڑھی۔دوسری نے ہلکے سے تالی بجائی تو کئی اور بھی پردے کے پیچھو سے نکل آئیں۔پہلی اردا بیگنی چار قدم میں میرے سامنے

آ گئی تھی اور میں مارے استعجاب اور خوف کے وہیں جم کر رہ گیا تھا۔ پھر اس خنجرزن کا حسن بھی ایسا تھا کہ رئیس بھی اچھے اچھے مبہوت ہو جاویں۔

''چلو، ایوان خالی کرو ورنہ پیٹ میں خنجر اتار دوں گی۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا اور اشارہ دروازے کی طرف کیا۔

مجھ پر جیسے عالم خواب طاری تھا۔ ارادہ اور ادراک سلب ہو گئے تھے۔ قاتل اس خنجر گذار پر سے نگاہ نہ ہٹتی تھی۔ اتنے میں کئی اور اردابیگنیاں جو پردے سے باہر آئی تھیں میرے چاروں طرف حلقہ زن ہو گئی تھیں۔ ان میں سے ایک زنگن تھی، مجھ سے بہت زیادہ قد آور تھی۔ اس نے میرا شانہ ہلایا جیسے سوتے کو جگاتے ہیں اور ہلکے سے مجھے دھکا دیا۔

میں گویا آپ سے آپ چل پڑا اور آپ سے آپ ہی زینے اتر گیا۔ اس بار زینے پیچدار نہ لگتے تھے۔

وہی زنگن میرے پیچھو پیچھو آئی۔ روشنیاں پہلے ہی کی طرح میرا تعاقب کر رہی تھی۔ نیچے اندرونی دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا۔ زنگن نے دروازے کو اپنی طرف کھینچ کر کھولا اور کچھ کھلنڈرے سے انداز میں میری پیٹھ تھپتھپا کر ہلکے سے باہر دھکیلا گویا زبان حال سے کہہ رہی ہو کہ اگر وقت اور جگہ مساعد ہوتی تو...

صدر دروازے کے سامنے وہ باغ اب نہ تھا۔ یا شاید میں کسی اور دروازے سے باہر کیا گیا تھا۔ نغموں اور چہل پہل سے فضا گونج رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر پیچھے مڑ کر طرف زنگن کے دیکھا، لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ دروازہ اس طرح تیغا ہو گیا تھا گویا کبھی کھلا ہی نہ تھا۔

بازار، بہت روشن اور پر رونق بازار۔ حسن اس بازار کا کیا بیان کروں۔ جوانان رعنا، خوبصورت، حسین و جمیل، ہر طرف اینڈتے پھرتے ہیں۔ چادروں میں سے جن کی حسن کی روشنی چھوٹتی ہے ایسی زنان جمیلہ۔ پالکیوں اور محافوں کے غرفوں سے لگی ہوئی بڑی بڑی سیاہ، شربتی، جامنی آنکھیں، کبھی کبھی جھلک مار دیتی ہیں تو دل دماغ میں فرحت دوڑ جاتی ہے۔ دکانیں جنس اور مال اور سامان تجارت سے پٹی پڑی ہیں۔ ہجوم خریداروں، مول بھاؤ کرنے والوں کا، اور آزاد ٹہلتے ہوئے بے فکروں کا۔ بیچ میں بازار کے ایک نہر، تازہ خوش گوار پانی کی رواں، اس کے دو رویہ درخت پھولوں اور پھلوں سے لدے ہوئے۔ مگر کسی کو یارائے گل چینی نہیں۔ ثمر ہائے شیریں و پختہ کو ملازمانِ شاہی چن چن کر توڑتے اور موونج کی سبد میں اکٹھا کرتے ہوئے۔ نہر کا پانی خس و خاشاک سے

پاک آئینے کی مانند۔ باغبانیاں، گری ہوئی پتیوں اور پنکھڑیوں کو جال سے سمیٹتی ہوئی۔ کیا مجال جو کوئی بے خیالی میں بھی کوئی تنکا، کوئی خاش، کوئی دھجی، نہر میں ڈال دے۔ محتسبان بازار کا یہ بھی ایک کام ہے۔ سونٹے لیے ہوئے پھرتے ہیں۔ جہاں کسی نے ایک دھج بھی گرائی، سونٹا لہرا کے اس سے کہا کہ اٹھا، ورنہ پیٹھ لہولہان کردوں گا۔

دور بازار کے ایک سرے پر ایک قصر فلک جناب، سرخ پتھر کا بنا ہوا گویا کوئی جوان رعنا اور قوی ہیکل ہو جس کے گالوں سے خونِ شباب ٹپک رہا ہو۔ اس کے سامنے کھلا میدان جس میں بھانت بھانت کے لوگوں کا جم غفیر۔ ہر چند کہ بازار میں دنیا جہان کی تحفہ تحفہ چیزیں فروخت ہو رہی تھیں، میرے پاؤں خود بخود اس قصر کی طرف کھنچ گئے جس کے سامنے میلہ سا لگا ہوا تھا۔ تین طرف نہر، سامنے سے کھلا ہوا وہ چوک نہ تھا، نمونہ اور خزینۂ عجائبات تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ امیر جان کی سفید حویلی اور وہ باغ و سبزہ نظر آتے ہیں کہ نہیں۔ مگر وہاں تو دور تلک بازار ہی بازار تھا۔ سامنے نفیری اور شہنائی بج رہی تھی، ایک طرف مرغے لڑائے جا رہے تھے۔ ایک جانب ٹھیلے پر ٹھاٹر سا باندھ کر چڑیوں کے رہنے بسنے کے لیے کھوکھے اور چٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ طرح طرح کے پالتو پرند، لال، پدڑی، کوئل، بلبل، ہزار گلا، پپیلک، سفید قمری، لال قمری، فاختہ، سرخ اور کالے رنگ کی مہوکی، اور نہ جانے کتنے انھیں کی طرح کے جانور، ان چلتے پھرتے بسیروں میں اور ان کے آس پاس اڑتے پھرتے تھے۔ لگتا ہی نہ تھا کہ انھیں جنگل سے پکڑ کر سدھایا گیا ہوگا۔

تانپورے پر سر سدھ رہے ہیں۔ گھونگھرو کی چھن چھن، چھنا چھن بھی دھیرے دھیرے سنائی دے جاتی ہے۔ فارسی عربی پڑھا ہوا ہونے کے باعث مجھے شعر و شاعری سے تو تھوڑی بہت رغبت ایک زمانے میں ضرور تھی، پر گانے بجانے، رقص و غنا سے محض تماش بینوں اور شوقینوں والا رشتہ تھا۔ سریلی آواز سن کر کان متوجہ بے شک ہو جاتے تھے۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک بڑے سے لکڑی کے چبوترے پر فرش بچھا ہوا، اور اس کے اوپر پال کی چھت، چاروں طرف گجروں اور پھول ہار کا جوش۔ سارا ماحول روشنیوں سے جھل جھلا رہا تھا۔ لکڑی کے چبوترے پر ایک بارہ چودہ برس کے سن کی لعبت کافر و مومن فریب جلوہ ریزی حسن و غنا کے لیے تیار ہو رہی ہے ؎

وہ کافر حسن پر تھی اپنے مغرور	سراپا مثل برق شعلۂ طور
بھرا سینے میں جوش نوجوانی	زباں مصروف لفظ لن ترانی
قد موزوں سراپا نور میں غرق	برنگ مصرع برجستۂ برق

عیاں ہر عضو سے شان قیامت | سراپا جان و ایمان قیامت
دم رفتار گرتا ہے قدم پر | بجائے سایہ رنگ روے محشر
وہ کافر زلف یا دود جگر ہے | دل زاہد سے بھی تاریک تر ہے
غضب ہے جا کے پھر آنا | ادھر کا اثر ہے زلف میں تار نظر کا
وہ پیشانی کہ جس کا بدر مشتاق | درخشاں کوکب اقبال عشاق
ہمیشہ دیکھ کر شام و سحر کو | کہے لی ساجدیں شمس و قمر کو
ہر اک ابرو ہے تیغ خوش نظارہ | سراپا جوہر موج اشارہ
دم جنبش ادا اس فتنہ گر کی | مبارک باد ہے زخم جگر کی
خمار آلودگی آنکھوں سے پیدا | نظر سے کیف مستانہ ہویدا
نگاہ مست پھرتی ہے جدھر کو | غشی آتی ہے مایوس نظر کو
وہ مژگاں وقت آرائش کریں | گھر دل آئینہ میں مانند جوہر
کنار بام وہ رخسارۂ پر نور | نظر آتے تھے جیسے شعلۂ طور
یہی لہتا ہے ہر مشتاق مضطر | سوا نیزے پہ ہے خورشید محشر
دہن گرداب صہبائے معانی | زباں موج شراب لن ترانی
تبسم بن کے ہر لب سے ہویدا | تقاضا شوخی طبع جواں کا
زنخداں جلوہ گر مانند گرداب | برنگ آب گوہر خشک و سیراب
صفت گردن کی افزوں حوصلے سے | وہی جانے جو لگ جائے گلے سے
ہر اک شانہ برنگ دستۂ گل | زیارت گاہ صبح عید بلبل
عیاں سینے سے آغاز جوانی | نمو پستاں کی غماز جوانی
نزاکت سے عجب عالم کمر کا | گماں سب کو رگ تار نظر کا
کسی صورت نظر آتی نہیں صاف | مگر ہے خلق کو میم کمر ناف
ہر اک زانو طرب انگیز عشاق | بظاہر جفت خوبی میں مگر طاق
نمایاں پائچے سے ساق پر نور | تہ فانوس جیسے شمع کافور
بہار حسن ہے جوش صفا سے | عیاں رنگ حنا ہے پشت پا سے

(نوشیرواں نامہ، جلد اول، از شیخ تصدق حسین، ص ۲۵۸ تا ۲۵۹)

اس کے بعد مجھے خبر نہ لگی کہ اس قاتل عالم کی جلوہ گری کب تک رہی، اس نے کیا گایا اور کیا ناچا۔ اگر ننگل خورد نہ ہوتا اور میرے بیوی بچے نہ ہوتے...

مجھے جھرجھری سی آئی۔ آنکھ سی کھل گئی۔ کیا وہ صحبت خواب تھی؟ نہیں، ابھی لوگ پہلے ہی کی طرح آجا رہے تھے، تماشبین بھی کئی موجود تھے۔ ایک طرف تیغ زن اپنے فن کی نمائش کر رہے تھے، ایک طرف ریچھ والا اپنے ریچھ اور اس کے بچے کے ساتھ مجمع لگا رہا تھا۔ حسینوں اور معشوقوں کا جوش حسب دستور تھا۔ مجھے اب چلنا چاہیئے۔ کل صبح تک متعین کرنا ہے کہ دہلی میں رہوں یا گاؤں واپس جا کر زر اندوختہ کو کسی کاروبار میں لگاؤں۔

مگر واپسی کس طرح اور کدھر سے ہو؟ یہاں تو سارے کارخانے جناتی سے لگتے تھے۔ کیا مجھے قدرت خدا سے کسی نئے شہر میں پہنچا دیا گیا ہے اور مجھے اب یہیں رہنا ہے؟ پھر میرے گھر بار بیوی بچوں، بوڑھی ماں، ان سب کا کیا ہوگا؟ پر یہ شہر نیا شہر ہے کہ کچھ اور؟ اگر نیا شہر ہے تو میں امیر جان کی قبر میں داخل ہو کر یہاں کیونکر پہنچا؟ اور امیر جان کی حویلی کے بالا خانے سے جو شہر مجھے دستا تھا وہ تو دہلی ہی تھا... قطب صاحب کی لاٹھ اور کہیں تو ہے نہیں۔ مانا جو ندی میں نے دیکھی وہ جمنا نہ تھی، مگر وہ لاٹھ تو قطب صاحب ہی کی تھی۔ کیا پتہ قدرت کے کارخانے میں کہیں کوئی اور قطب صاحب بھی ہوں، ان کی لاٹھ بھی ہو، بس وہ سلاطین و حاکمان نہ ہوں جو دہلی میں ہو گذرے تھے۔ تو امیر جان مجھے کیونکے ملیں؟ اور یہاں کیونکے ملیں؟ کیا امیر جان بھی ایک سے زیادہ تھیں اور جو یہاں مریں وہ کوئی اور تھیں؟

بات سمجھ میں کچھ نہ آتی تھی۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے گھبرا ادھر ادھر نگاہ کی۔ کوئی برف والا قلفی والا یا کوئی عطار ملے تو مداوا اپنی گردش سر کا کروں۔ مگر دائیں بائیں جلد جلد سر گھمانے سے گھوم اور بھی فزوں ہوئی۔ میں چرخ کھا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

پتہ نہیں میں کب تک بے ہوش رہا۔ مجھے تو لگا کہ فوراً ہی طبیعت بحال آگئی ہے، مگر جب آنکھ کھلی تو وہ میلہ نہ تھا۔ امیر جان کی قبر کے چور دروازے کو جاتی ہوئی روش البتہ صاف دستی تھی۔ میں سرپٹ روش پر دوڑا کہ کہیں حال پھر دگرگوں نہ ہو جائے۔ بہت جلد زینے طے کر کے میں چور دروازے سے باہر آ گیا۔ میں نے دیکھا تو نہیں، مگر مجھے لگا کہ دروازہ بند ہو گیا اور وہ روشنیاں بھی غائب ہو گئیں۔ کچھ دور پر سید بھورے شاہ صاحب یا شاید بابا نظام الدین سلطان جی صاحب کی چوکھٹ پر بہت اونچائی پر ایک دیا البتہ روشن تھا۔ شام ہو رہی تھی۔

شام نہیں... بالکل نہیں... شام کا کوئی محل نہ تھا۔ میں اس قبر (جو بھی اسے کہیں) کے اندر بہت سے بہت دو یا ڈھائی ساعت رہا تھا اور جب داخل ہوا تھا تو زیادہ سے چار گھڑی دن چڑھا تھا۔ ظہر کا وقت بھی دور تھا، مغرب کا کیا سوال تھا۔ میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ سارے قبرستان میں جھاڑیوں، جھنڈیوں، خار دار جھڑ بیریوں، بڑ ووں اور مہندی کے گھنے جھنڈ سے ڈھکے ہوئے قطعات زمین کے سوا کچھ نہ نظر آتا تھا۔ قبریں سب نابود ہو چکی تھیں یا اگر تھیں تو جھاڑ اور جھاڑیوں تلے دب کر غائب ہو چکی تھیں۔ میں نے سراسیمہ ہو کر امیر جان کی قبر کی طرف دیکھا۔ مگر وہاں تو کوئی قبر نہ تھی۔ مانا کہ ان کے مزار کی لوح بہت اونچی نہ تھی لیکن دکھائی تو دیتی تھی۔ اب تو یہاں کچھ بھی نہ تھا۔ اور وہ سلطان جی کے نام پر لگائی ہوئی وہ سبیل اور اس سے ملحق کنواں کدھر تھا؟ یہیں بس یہیں تو تھا۔ اسی سبیل سے میں نے امیر جان کی قبر کی شناخت کی تھی۔

میں نے گھبرا کر اندھا دھند بھاگنا شروع کیا لیکن صاف راستہ کیا، تنگ جادہ بھی نہ دکھائی دیتا تھا۔ اور اگر کہیں افراتفری میں پاؤں میرا کنویں میں جا رہا تو... میں رک گیا، جیسے کسی نے بھاگتے گھوڑے کی راس کھینچ لی ہو۔ مگر یہاں سے باہر تو نکلنا ہی تھا۔ کیا رات یہیں گذاروں گا اور خدا جانے کن کن طرح کی بلاؤں اور عفریتوں اور جناتوں کا شکار بن جاؤں گا۔ میں نے جی کڑا کر کے پھر اپنے گرد و پیش دیکھا۔ وہ کنواں تو اب ہرگز وہاں نہ تھا۔ شاید اس کا پانی ٹوٹ گیا ہو تو کسی نے بند کرا دیا ہو۔ م... مگر... مگر اتنی جلدی کیسے... کیسے سوکھ گیا ہوگا آج صبح ہی کی تو بات ہے کہ میں کنویں میں... نہیں نہیں... قبر میں اترا تھا... نہ جانے کون سی منحوس گھڑی تھی وہ جب میں نے... میں نے ...کیا؟ میں نے تو کچھ بھی نہ کیا تھا۔ میں نہ دنیا میں پہلا احدی تھا اور نہ پہلا شخص بیٹی بیاہنی کا جو باپ ہو۔ کیا بیٹی کو بیاہنے کے لیے قرضہ لینا کچھ گناہ ہے؟

میں نے پھونک پھونک کر دیکھ بھال کر قدم رکھنا شروع کیا۔ جس اونچی روشنی کا ذکر میں نے کیا ہے کہ قبر... قبر سے باہر آ کر جسے میں نے دیکھا تھا، اسے خوب دھیان میں رکھ کر اس کی طرف چلنے لگا۔ چلنے کیا لگا، کہیں خود کو کھینچ کر آگے بڑھاتا، کہیں دونوں ہاتھوں پر پگڑی لپیٹ کر اپنے ہاتھوں سے خار زاروں میں راستہ بناتا، کہیں بلا مبالغہ چاروں ہاتھ پاؤں کے بھل، سر اور منہ کو چھپا کر بس انداز لگا کر آگے بڑھتا۔ ان خار زاروں بلکہ جہنم زاروں میں بچھو تو کیا ہوں گے لیکن زہریلے گرگٹوں اور سانپوں کا ڈر بے شک تھا۔ پر میں تو تقدیر اپنی پہلے ہی ٹھونک چکا تھا۔ سانپ سے ڈسوانا آپ کو منظور تھا مگر اس قبرستان میں بلکہ اس کے محاذ میں بھی ٹھہرنا منظور نہ تھا۔

بارے میں باہر آیا۔ اندھیرا خوب پھیل چکا تھا۔ اب جب میں مسطح زمین پر تھا تو وہ روشنی کچھ اور واضح دکھائی پڑتی تھی۔ سیدی مولیٰ صاحب کا مزار کہیں درختوں کے پیچھو چھپا ہوا تھا۔ میں نے اسی روشنی کو مشعل راہ بنا کر بڑھنا شروع کیا۔ حضرت سلطان الاولیا کی درگاہ اور سیدی مولیٰ صاحب کے مزار کے بیچ میں صرف بھورے شاہ صاحب تھے اور باقی سب جنگل تھا۔ بھورے شاہ صاحب کی بھی ایک جھلک اب دکھائی دی۔ اکادکا چراغ روشن تھے مگر وہ اونچی روشنی ابھی دور تھی۔ جنگل میں پہلے ایک پگڈنڈی ان دونوں کو ملاتی تھی پر اب کچھ سڑک سی بن گئی تھی۔ اکا دکا مزار اور دروازے بھی نظر آتے تھے۔ پہلے، پہلے کیا معنی؟ کیا میں یہاں بہت دیر کے بعد آیا ہوں؟

سلطان جی صاحب کا دروازہ سامنے تھا۔ بلند روشنی کی کرنوں نے درگاہ کی چوکھٹ کو منور کر دیا تھا۔ لوگ آجا رہے تھے۔ بہت سے لوگ مغرب کی نماز پڑھ کر حضرت امیر خسرو کی درگاہ پر قوالیاں سن رہے تھے۔ کچھ تو فارسی میں قوالیاں تھیں اور کچھ کسی ایسی زبان میں تھیں جسے میں ہندی کے طور پر سمجھ لیتا تھا لیکن مجھے لگا کہ میں اسے بول نہیں سکتا۔ مگر یہ ملک تو ہند ہی ہے، یہ شہر تو دہلی ہی ہے...اچھا ان لوگوں کے لباس بھی کچھ مختلف تھے۔ بڑی مہری کے دو بر کا پائجامہ، سر پر پگڑی، لیکن بدن پر کرتے کے اوپر کوئی لباس تھا جس کی آستینیں آدھی تھیں اور کچھ کی آستینیں پوری تو تھیں لیکن اوپر سے لمبائی میں آدھی کٹی ہوئی تھیں۔ ہم لوگوں کے برخلاف ان کے کرتے رنگین پھولدار اور پائجامے رنگین دھاریوں والے کپڑوں کے تھے۔ میں نے غور کیا تو کپڑے نہ سوتی تھے نہ ریشمی، کچھ ملواں بناوٹ کے تھے۔ مجھے وہ کپڑے خوبصورت مگر عجیب لگے کیوں کہ ہم لوگوں میں مرد ہمیشہ رنگین لیکن بھاری رنگوں والے ماشی، سیاہی مائل سبز، مونگیا، تیلیا رنگ کے کرتے پائجامے پہنتے تھے۔ ہاں پگڑیاں ہماری طرح ان لوگوں میں سے کسی کی سیاہ، کسی کی سفید، اور زیادہ تر لوگوں کی رنگین دھاری دار تھیں۔

میں ہونقوں کی طرح درگاہ فلک اشتباہ کے سامنے کھڑا ایک ایک کا منھ تک رہا تھا۔ کچھ لوگوں نے شاید میرے لباس یا میری صورت کو اجنبی جان کر کبھی کبھی کنکھیوں سے مجھے دیکھا۔ شاید ایک دو ایسے بھی تھے جو ٹھٹکے، لیکن ٹھہرا کوئی نہیں۔ آخر میں نے ہمت کر کے ایک شخص کو بھلا آدمی جان کر سلام کے اشارے سے روکا:

''اے صاحب، ذرا ایک بات بتائیے گا۔''

اجنبی شخص مجھے غور سے دیکھتا ہوا ٹھہر گیا۔ میں کوئی سائل تو ہو نہ سکتا تھا، مسافر ممکن تھا۔ اس

نے نرم لہجے میں کہا:

''جی، فرمایئے۔ کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

اس کے لہجے میں ایک لوچ اور شیرینی تھی۔ آواز کے اتار چڑھاؤ میں جلدی یا رعونت کا شائبہ تھا۔ ان کے مقابلے میں مجھے میرا ہریانی لہجہ اکھڑ اور کرخت سا لگا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں ان لوگوں کی طرح کی ہندی نہ بول سکوں گا۔ گڑبڑا کر میں نے فارسی میں کہا:

''آقاے من۔ ایں شہر دہلی می باشد، یا نہ؟'' مجھے اپنی فارسی اپنی ہندی سے بہتر لگی۔

اجنبی نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا:

''چہ خوش گفتید آقاے من سلامت۔ ایں شہر البتہ دہلی می باشد۔ گمان تاں چیست؟''

''مگر... مگر ایں ہمہ چنداں متلون است از آں دہلی کہ ما می شناختیم۔''

''قربان شما، آغا پس از چند مدت تشریف ایں جا آوردہ باشید؟''

میں اس کے جواب میں کیا کہتا۔ مجھے گھبراہٹ اور خلفشار ذہن کے باعث بڑے زور کا چکر آیا اور پھر میں دوبارہ ہوش کھو بیٹھا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے اجنبی محسن کے گھر کے باہری دالان میں لیٹا ہوا تھا۔ حکیم صاحب آ کے مجھے لخلخہ سنگھا کے اور کوئی مفرح دوا میرے منہ میں ڈال کے جاچکے تھے۔ دوا کا ذائقہ اب بھی میرے منہ میں تھا۔ تشخیص یہ تھی کہ ضعف معدہ اور ایک مدت سے بلا خورد و نوش رہنے کی وجہ سے نفخ بخارات معدے سے قلب کی جانب ہوا جس کی بنا پر فشار قلب نے دماغ کو متاثر کر دیا، ورنہ مجھے صرع یا اس جیسا کوئی موذی مرض نہ تھا۔ میں خوش ہوا کہ مجھے اپنی اصلیت بتانے کی ضرورت بھی نہ پڑی تھی۔ میرے اجنبی محسن نے، جن کا نام مجھے معلوم ہوا کہ حمید الدین تھا، گمان کیا کہ میں مسافر تھا۔ دہلی سے دور ترین جگہ جو مجھے معلوم تھی وہ ملک سند میں ایک قصبہ عیسیٰ خیل تھا۔ پس میں نے یہی بتایا کہ میں عیسیٰ خیل میں ایک رئیس کے دروازے پر سپاہی تھا۔ اپنے حالات کی بہتری کی تلاش میں دہلی کل ہی آیا تھا۔ راستہ بھول جانے کی وجہ سے اور خلفشار ذہنی کی وجہ سے میں اپنی سرائے واپس نہ جاسکتا تھا اور رہبری کی تلاش میں تھا کہ اپنے مستقر پر پہنچ جاؤں۔

حمید الدین نے گمان کیا کہ مزار سلطان جی پر میری اوٹ پٹانگ باتیں دراصل میری پریشانی اور گم کردہ راہی کے بہ سبب تھیں۔ لہجے کا اختلاف اور فارسی گفتگو میں میری روانی کی وجہ بھی یہی تھی کہ میں سند کا تھا اور پورب پہلی بار آیا تھا۔ لیکن دیر سے معدہ میرا خالی تھا، اس کا کیا مطلب

ہوسکتا تھا، اس نے تعجب کیا ہو۔ اس سے زیادہ تعجب تو مجھے تھا۔ آخر صرف آج صبح ہی میں نے کچھ نہ کھایا تھا اور امیر جان سے ملنے چل کھڑا ہوا تھا۔ ان کے مزار میں (شاید وہ مزار تھا یا کچھ اور) مجھے بمشکل دو ڈھائی ساعتیں لگی تھیں۔ ایسے شخص کو کئی دن کا تو بھوکا نہ کہہ سکے ہیں۔

میری پہلی مشکل یہ تھی کہ اس معاملے کا تصفیہ کیونکے ہو کہ میں دہلی میں تو تھا لیکن وہ دہلی اجنبی میرے لیے بڑی حد تک تھی۔ ایسا کیوں؟ یہ آسان لگا کہ حمید الدین سے سلسلۂ گفتگو یوں چھیڑوں کہ میرا راز نہ کھلے کہ میں درحقیقت کہاں کا تھا اور یہ مجھ پر کھل جائے کہ کیفیت اس وقت دہلی شہر کی کیا ہے۔ شکر اللہ کا کہ میرا یہ کہنا کہ میں عیسیٰ خیل میں دروازے کا سپاہی تھا، میرے لیے آسانی بھی پیدا کر گیا۔ حمید الدین نے جواب میں کہا:

''بہت خوب تو جناب ایک طرح سے ہم پیشہ میرے ہیں۔''

''جی وہ کیوں کر؟''

''میں بھی گھڑ سوار سپاہی ہوں، خان دوراں عبدالصمد خان صاحب کی ڈیوڑھی پر متعین ہوں۔''

''ڈیوڑھی''، یہ لفظ میرے لیے نیا تھا لیکن ''خان دوراں'' سے تو میں خوب واقف تھا۔

''تو کیا اسد خان بن مبارک خان اب خان دورانی سے ہٹ گئے؟''

''اسد خان بن مبارک خان؟ یہ خان دوراں کب تھے، مجھے نہیں معلوم۔ عبد الصمد خان تو عہد فردوس آرام گاہ محمد شاہ بادشاہ غازی کے وقتوں سے خان دوراں ہیں۔''

میرا سر پھر چکرانے لگا۔ میں نے خود کو بہت قابو میں کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا:

''تو کیا خداوند عالم ابراہیم لودی اب سلطان دہلی نہیں ہیں؟''

ایک شکن گہری حمید الدین کے ماتھے پر آئی۔ وہ کچھ توقف کے بعد بولے:

''آپ شاید کچھ بھولتے ہیں صاحب۔ ابراہیم لودی نام کا بادشاہ تو یہاں کبھی نہیں ہوا... ہاں بابر بادشاہ نے ایک سلطان ابراہیم لودی کو شکست دے کر ملک ہند اس سے بزور شمشیر لے لیا تھا۔ ابراہیم لودی پانی پت میں مدفون ہے۔''

ایک مرتبہ میری آنکھوں کے سامنے پھیر گہرا اندھیرا چھا گیا۔ ابراہیم لودی میرے خداوند عالم، میرے سلطان عالی مقام مدفون ہیں پانی پت میں؟ اور یہ شاہ و بادشاہ کا کیا مذکور ہے؟ ہمارے حاکمان خود کو سلطان ہمیشہ کہتے اور لکھتے تھے۔

میرے رنگ کو متغیر دیکھ کر حمید الدین نے کہا:

''جناب کا مزاج ابھی بھی برہم نظر آتا ہے۔میری سمجھ میں تو آپ کچھ تناول فرمالیں اور یہیں لیٹ رہیں۔کیا فرمایا تھا جناب نے،فیروز شاہی سرائے؟اس نام کی سرائے سے بندہ واقف نہیں ہے۔لیکن ایک عرب سرائے کچھ فاصلے پر خواجہ صاحب سے متصل ہے۔وہ مگر اب محلۂ اقامت ہے،سرائے نہیں۔ممکن ہے وہاں کچھ معلوم ہو جائے۔کل وہاں جا کر دیکھیں گے۔''

''جہاں ہم ہیں اس جگہ کا نام کیا فرمایا تھا آپ نے مشفق من؟''

''جی یہ بدر پور کے مضافات میں کھڑکی گاؤں ہے۔یہاں کی مسجد کا ذکر آپ نے سنا ہو شاید۔''

''کھڑکی!''میرا دل بلیوں اچھلا۔یہ جگہ تو میرے زمانے میں شہر سے بالکل باہر تھی۔اور لاٹ فیروز شاہ کی اور کوٹلہ فیروز شاہ کا یہاں سے بہت دور تھے۔اب میرا یہ بہانہ کہ میں راہ بھول گیا تھا،اور قوی معلوم ہوگا۔مگر شکر خدا کہ اس وقت کی چیزیں بہت سی باقی ہیں۔شاید فیروز شاہی سرا بھی تغلق آباد اور بدر پور کی سرحد پر ابھی باقی ہو۔مگر میرے سلطان ابراہیم سے لے کر اب تک زمانہ کتنا گذر چکا ہے یہ کیسے معلوم ہو؟جب میں گھر سے چلا تھا تو سنہ ۹۲۸ تھا،اب کس انگل سے معلوم کروں کہ یہ کون سا سنہ ہے؟ابھی چپ ہی رہنا بہتر ہے میں زبان اور ذہن پر پوری طرح قابو رکھے رہوں،اسی میں بہتری ہے۔کل تک کچھ نہ کچھ کھل جائے گا۔کیا معلوم وہ سرائے بھی اب بھی وہیں ہو؟

اللہ حمید الدین کا بھلا کرے،ان کے اصرار پر میں چند لقمے کھائے اور وہیں باہری دالان میں لیٹ رہا۔میں نے انھیں راضی کرلیا کہ کل دن چڑھتے ہی میں ایک گھوڑا کرائے پر لے کر دہلی چلا جاؤں گا(نہ جانے اس بچارے گھوڑے پر کیا بیتی جسے میں قبرستان کے باہر چھوڑا تھا۔کوئی لے ہی گیا ہوگا۔اس سرائے والے کو شکایت رہ گئی ہوگی جس سے میں نے گھوڑا کرائے پر لیا تھا۔) حمید الدین کو میں نے پوری طرح یقین دلایا کہ اب ملاقات ہوگئی ہے تو انشاء اللہ قائم رہے گی۔ میں کل تنہا ہی دہلی چلا جاؤں گا۔

گھوڑا میں نے کرائے پر لے تو لیا پر یہ خدشہ مجھے کھائے جا رہا تھا کہ بچارے اس بے زبان کا بھی وہی حشر نہ ہو جو کل والے گھوڑے کا ہوا تھا۔میں جان بوجھ کر سیدی مولٰی صاحب کے مزار اور اس قبرستان سے ہو کر گذرا جہاں کل والا واقعہ پیش آیا تھا۔مزار کے چاروں طرف کچھ آبادانی تھی،بظاہر کچھ خانہ بدوشوں نے کبھی وہاں مسکن بنایا تھا اور وہیں رہ پڑے تھے۔ساری آبادی پر خانہ

بدوشوں کے طرز حیات کے علامات تھے۔عورتیں بے پردہ،کم وبیش آدھا جسم عریاں،اونچا لہنگا اور اس پر ایک ہلکی سی چادر جس کے پیچھے بدن صاف نظر آتا تھا۔ ننگے سر، ننگے پاؤں،کانوں اور ناک میں بڑے بڑے بالے اور نتھ۔گھر کا سارا کام کاج کرتی ہوئی،مرد چارپائی پر اینڈتے ہوئے اور کسی قسم کی نالی کو ایک بند پیالے میں ڈالے ہوئے نالی کو منھ میں لے کر گڑگڑاتے اور دھواں چھوڑتے ہوئے،توبہ کیا قبیح حرکت تھی۔مگر سامنے کے قبرستان میں کوئی قبر،کوئی مزار،کوئی مجاور نہ تھا۔میرا دل کانپ اٹھا۔کل میں یہیں تھا۔یہ کون سی جگہ ہے میرے اللہ۔کیا امیر جان نامی کوئی تھی بھی کہ نہیں؟ کیا خود میں ہوں کہ نہیں؟ کیا میں کوئی بھوت یا آوارہ بے خانماں روح ہوں؟ مگر ہم مسلمانوں کو بھوت پر اعتقاد ہے نہ بے خانماں روحوں پر۔ ہمارا اعتقاد قبر پر، برزخ پر، جنت اور جہنم پر ہے اور حشر پر ہے۔ہم میں سے کوئی کبھی بھوت پریت شیطان بدروح نہیں بنتا۔لاحول ولا قوۃ۔اللہ مجھے معاف کرے۔اس وقت جو ہو رہا ہے شاید کسی بزرگ کا تصرف ہے۔ مجھے صبر کرنا اور حالات کے کھلنے کا امیدوار رہنا چاہیئے۔

غیاث پور، سیری، کیلوکھیڑی، یہ سب بڑی حد تک سنسان دکھائی دیئے۔ سلطان جی کی درگاہ کے ذرا آگے بھورے شاہ صاحب کے مزار کے قریب لیکن ایک طرف کو ہٹی ہوئی میں نے ایک بے حد بلند اور دلکش عمارت دیکھی،سنگ مرمر اور سرخ پتھر سے بنی ہوئی،اس کا گنبد کچھ بالکل نئی وضع کا تھا،ذرا سا پیاز کی شکل کا،لیکن اس قدر متناسب اور موزوں کہ بس۔چونکہ وہ عمارت ذرا مرتفع جگہ پر تھی اس لیے دور سے بھی مجھے دکھائی دے گئی۔کئی منزلیں اور چورویہ دالان تھے،بہت بلند کرسی اور ہر طرف وسیع اور پر فضا باغ۔سارے میں عجب فرحت اور ٹھنڈک برس رہی تھی۔ یہ کوئی قلعہ یا قصر تو ہو نہیں سکتا تھا،کسی کا مزار ہی ہوگا مگر مزاروں کے گرد ایسے باغ کہاں ہوتے ہیں۔ خوش نصیب ہے وہ شخص جس نے ایسی اولاد پیدا کی ۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مقبرہ اول مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر کے بیٹے ہمایوں کا تھا اور اس کے کئی اخلاف بھی وہیں مدفون ہیں۔

بی بی فاطمہ سام کے مزار سے میں نے گھوڑا دائیں جانب بڑھایا۔زیادہ تر وہی رنگ بے رونقی تھا جو پہلے دیکھ آیا تھا۔ ہر چند کہ میرے زمانے میں وہ شان پرانے شہروں کی نہ تھی جو اس وقت رہی ہوگی جب کہ سلاطین ان کے نے ان کی بناڈالی تھی۔تاہم آج جیسا صحرائی ماحول نہ تھا۔اب تو ایسا لگتا تھا کہ جنگل دھیرے دھیرے کر اپنی گذشتہ املاک واپس لے آیا ہو۔مٹکا شاہ صاحب کے مزار پر سبیل ضرور یوں ہی تھی جیسی ان وقتوں میں تھی مگر اس کے گرد جو آبادیاں اس وقت تھیں اب بہت

چھدرا گئی تھیں۔ شاید خواجہ صاحب کو جانے والوں نے یہ راہ چھوڑ کر کوئی نئی راہ بنا لی تھی۔ مگر قلعۂ کہنہ سے گذرتے وقت میں بے اختیار رو دیا۔ قلعۂ مبارک کا بڑا حصہ کھنڈر ہو گیا تھا۔ وہ باب عالی جہاں حاضری کے وقت شاہوں اور بڑے بڑے فوجی عہدہ داروں اور راجاؤں کے قدم لرزتے تھے، جہاں انھیں پانچ سو قدم پہلے ہی سواری چھوڑ کر پا پیادہ ہونا پڑتا تھا، جہاں سے وہ فرمان جاری ہوتے تھے جن کے دبدبے سے ارباب اقتدار کی حویلیوں میں رعشہ پڑ جاتا تھا اب چند جھونپڑیوں سے دبا ہوا پڑا تھا۔ جہاں محلات تھے وہاں کھلا میدان تھا اور اونچے نیچے ٹیلے تھے۔ گھانس ہر طرف اگ رہی تھی۔ اونچی گھانس میں کبھی کبھی کوئی خرگوش، کوئی لومڑی، کوئی چیتل جھلک پڑتا اور غائب ہو جاتا اور دیکھنے والے کو شک رہتا کہ وہ حیوان اس نے واقعی دیکھے بھی تھے کہ اس کی چشم خیال نے اسے بھرمایا تھا۔

میں دیر تک کھڑا آنسو بہاتا رہا، عربی شاعروں کی طرح جو اپنے قصائد میں ذکر کرتے ہیں دوبارہ گذرنے کا ان صحرائی فرودگاہوں پر سے جہاں ان کے معشوق نے کبھی رات قیام کیا تھا اور اب وہاں ایک دو ادھ جلی لکڑیوں، ٹوٹی ہوئی طنابوں، ہوا میں پھٹ پھٹاتے ہوئے بوسیدہ اور موسم خوردہ خیموں کے پھٹے ہوئے سراپردوں کے سوا اب کچھ نہ تھا۔ ہائے ہائے انسان کس قدر ضعیف البنیاد ہے۔

اب مجھے یقین آنے لگا تھا کہ میرے سلاطین، میرے مربی، میرے آقا، اب مملکت ہند کے مالک نہ تھے۔ اب وہ کہاں تھے، شاید قبروں میں آرام کرنا بھی انھیں نصیب ہوا کہ نہیں۔ میرے سامنے خداوند عالم سلطان ابن سلطان ابرہیم لودی اپنے عظیم الشان باپ کا مقبرہ مکمل کرنے کا حکم صادر فرما چکے تھے۔ کام بھی شروع ہو گیا تھا۔ یہیں کہیں سلطان جی کی درگاہ جنت نگاہ سے مغرب کو گوڑ گاؤں کی طرف جو راہ جاتی تھی، اس پر کوئی نیم فرسخ کی دوری پر وہ مقابر بن رہے تھے۔ لیکن اب تو خود سلطان ابراہیم کا مزار دور پانی پت میں کہیں تھا۔ نہ معلوم لودیوں کے مزارات پورے ہو بھی سکے تھے یا نہیں۔

قلعۂ کہنہ کے آگے آبادی بڑھنی شروع ہوئی۔ فیروز شاہ کے کوٹلے تک آئے تو شہر کا سا سماں بننے لگتا تھا۔ لیکن خود کوٹلہ پر کچھ نہ تھا۔ بس وہی لاٹ جو سلطان خلد آشیان نے کس جتن سے اور کس جر ثقیلی حکمت سے کام لیتے ہوئے دور پنجاب سے اٹھوا کر یہاں نصب کی تھی، یوں ہی اپنے اونچے چبوترے پر فخر اور وقار کے ساتھ سرافراز کھڑی تھی۔ اب اطراف کوٹلہ میں آبادی اور بھی زیادہ ہو گئی

تھی لیکن خود کوٹلہ سنسان پڑا تھا۔ میں نے کوٹلے سے کچھ آگے نکل کر گھوڑے کو دائیں جانب دریا کی طرف موڑا کہ فیروز آباد اسی طرف تھا۔

آبادی کے نام پر تو وہاں کچھ نہ تھا، چند جھونپڑے مچھیروں اور ملاحوں کے تھے۔ دریا بھی اب ذرا دور چلا گیا تھا اور اب گاؤں سے دکھائی نہ دیتا تھا۔ امیر جان کی حویلی بے وجود تھی، ہاں ایک دھنڈار سا ضرور آبادی کے سرے پر تھا، اسے ہی حویلی یا حویلی کا ماتم دار کہہ لیں تو کہہ لیں۔ اب میرا شک اور بھی پختہ ہو گیا کہ وہ زمانے اب کہیں بہت پیچھے چھوٹ گئے۔ میں نے اپنی ہمیانی کو ٹٹولا تو وہ بجنسہٖ موجود تھی، حاملہ عورت کی طرح سکوں سے بوجھل اور میری کمر سے لپٹی ہوئی، گویا اسے بھی خوف ہو کہ میں کہیں چلا جاؤں گا اور وہ دنیا میں اکیلی رہ جائے گی۔ پچھلے وہ زمانے تھے ضرور، نہیں تو یہ سکے میرے پاس کہاں سے آتے؟

میں نے گھوڑے کا رخ دریا سے متصل بائیں طرف سمت شمال میں موڑا کہ ادھر آبادی بہت نظر آتی تھی۔ ہر طرف سواریوں کی ریل پیل، بیل گاڑیاں، رتھ، دو پہیے اور ایک گھوڑے والی کھلی ہوئی گاڑیاں جن میں ایک یا دو یا تین مسافر پاؤں پھیلا کر آرام سے سفر کر رہے تھے۔ یہ سواریاں میرے وقت میں نہ تھیں اس لیے مجھے بہت دلچسپ اور انوکھی لگیں۔ کسی نے اسی وقت پکارا ''او میاں تانگے والے، او بھائی تانگے والے ہوت!'' تو اس گاڑی کو ہانکنے والے نے مڑ کر دیکھا اور رک گیا۔ اس سے میں نے جانا کہ اسے ''تانگہ'' کہتے ہیں۔ عجب بدوضع لیکن ظاہرا آرام دہ سواری تھی۔ پالکیاں، سجے ہوئے زرق برق محافے، ہاتھی، اونٹ، کیا نہیں تھا جو اس بازار میں رواں تھا جس کی سمت میں بھی رواں تھا۔ تانگے کی طرح سواریوں کی شق میں ایک نئی چیز اور دکھائی پڑی کہ جس کا نام مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ نالکی تھا۔ نالکی کیا تھی، لکڑی کا ایک منقش، رنگین اور مزین بلند گنبد تھی جس کے دروازے کے اوپر ایک اور بھی اونچا چھجا تھا کہ اندر بیٹھنے والے کو دھوپ سے بچاؤ رہے اور اگر پردہ اٹھا دیا جائے تو ہوا بھی ملتی رہے۔ اور اگر بارش ہو تو چھینٹیں اندر نہ آئیں۔

جس بازار کی طرف ان سواروں اور سواریوں اور پا پیادہ چلنے والوں کو میں رواں دیکھ رہا تھا، اس کے بارے میں مجھے خیال سا تھا کہ جو پر رونق بازار میں نے امیر جان... یا جو بھی وہ ہستی تھی، اس کے مقبرے میں دیکھا تھا، وہ اس موجودہ بازار سے کچھ مشابہ تھا۔ مگر میں نے ادھر کا رخ نہ کیا اور ندی کا کنارہ کم و بیش تھام کر شمال کی سمت چلتا گیا کہ ادھر ہجوم کم تھا۔ بازاریوں میں، خواہ وہ لوطی بے فکرے رہے ہوں یا اہل حرفت، یا شرفا، میں نے سب کو ہتھیار بند دیکھا۔ شاید ان

دنوں خلقت میں جنگجوئی کا ذوق افزوں تھا، یا شاید لوگ اس زمانے میں خود کو کم محفوظ سمجھتے تھے۔ مجھے یہ بھی اندیشہ تھا کہ کہیں ہجوم میں اگر کسی سے ٹکرا گیا یا گھوڑے کی ٹاپ کسی کو لگ گئی تو خواہی نخواہی جھگڑا ہو سکتا تھا۔ میں اجنبی اور سراسیمہ بے گھر مسافر ایسے کسی جنجال کے لیے تیار نہ تھا۔

شمال میں ذرا آگے ہی میں گیا تھا کہ ایک نہایت دلکش مسجد نظر آئی۔ اس شہر میں مسجدوں اور مزارات کی کثرت تھی۔ ہم لوگوں کے زمانے میں ایسا نہ تھا۔ مسجد کے دو مینارے قلم کے نیزوں کے مانند چھریرے اور بہت ہی بلند تھے۔ مسجد سے بالکل متصل ایک سرائے بھی تھی۔ سرائے کے دروازے پر اونٹ، گھوڑے، پالکیاں، خوانچے والے، اس طرح کے بہت سے لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ یعنی یہ سرا اب لگ آباد تھی اور میں یہاں ٹھہر سکتا تھا۔

میں مسجد کی عمارت کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ صدر دروازے پر جو کتبہ تھا اس کے مطابق اس مسجد کا نام زینت المساجد تھا اور اسے محی الدین اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی کی بیٹی زینت النسا بیگم نے ۱۱۱۹...؟۱۱۱۹ میں؟...بنوایا تھا۔ میں نے آنکھوں کو خوب رگڑ کر صاف کیا، پھر ہر طرح غور کر کے دیکھا، وہی تاریخ ۱۱۱۹ نظر آئی۔ واللہ ایسا اسرار مجھ پر نازل ہو، یہ نہیں ہو سکتا۔ ارے صاحب جب میں ننگل خورد سے چلا تھا تو سنہ ۹۲۸ تھا مجھے اچھی طرح یاد ہے اور سلطان ابرہیم لودی کو فرمانروائی کرتے چار سال ہو رہے تھے۔ تو کیا یہ مسجد اس کے کوئی دو سو برس بعد بنی تھی؟ تو کیا واقعی ابراہیم لودی ہی نہیں اور بھی بہت کچھ میرے ننگل خورد چھوڑنے سے لے کر اب تک ہو چکا تھا؟

میں لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اندر گیا۔ صحن مسجد میں ایک طرف کسی کا مزار تھا۔ میں نے قریب جا کر لوح دیکھی تو معلوم ہوا کہ یہ اسی شہزادی زینت النسا بیگم کا مزار ہے اور وہ ۱۱۲۳ میں واصل بحق ہوئی تھی۔ مسجد پرانی معلوم ہوتی تھی ۔ بے شک شہزادی زینت النسا کے وصال کو کچھ برس ہو چکے تھے۔ اس وقت بھلا کچھ نہیں تو سنہ ۱۱۴۰ ہوگا۔ شاید اور بھی زیادہ ہو۔ شاید یہ احمد شاہ بادشاہ جن کا نام حمید الدین نے لیا تھا بارہویں صدی میں نہیں تیرہویں میں ہوں۔

میں نے جوتے اتارے، حوض پر جا کر وضو کیا اور سجدے میں جا کر اللہ کے حضور میں خود کو متوجہ کر کے گڑگڑا کر کہنے لگا کہ الہ العالمین تو دانا اور بینا ہے تو رحمٰن اور رحیم ہے۔ اپنے حبیب کے صدقے ان کی پیاری بیٹی بی بی فاطمہ کے صدقے مجھے اس عذاب سے نجات دلا دے۔ میرے اللہ میری بیاہی بی بی کا میرے بیٹے کا کیا حال ہوا ہوگا میری ماں پر کیا گذری ہوگی ۔ اگر تیری مرضی نہیں ہے تو مجھے ان سے نہ ملا، لیکن مجھے یہاں سے اٹھا لے۔

میں روتے روتے نڈھال ہو گیا۔اس اثنا کئی لوگ میرے پاس سے گذرے لیکن شاید کسی کو مجھ سے دریافت حال کا ہواؤ نہ ہوا۔ایک اچھی خاصی عمر کے روتے بلکتے مرد سے کون کچھ پوچھنے کی ہمت کرتا۔بھلے لوگ ڈر گئے ہوں گے کہ خدا جانے یہ بادشاہ کا معتوب ہے یا غضب الٰہی کا شکار ہوا ہے۔

جب میرے آنسو تھمے تو دل میرا مجھے کچھ ہلکا لگا،خدا جانے کتنی دہائیوں بلکہ صدیوں کے بعد آج میں رویا تھا۔میں نے حوض پر جا کر تجدید وضو کی اور دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ سے پھر دعا مانگی کہ مجھے صحیح راستہ ملے،میرا خوف کم ہو،مجھے میرے گھر بار کی خبر ملے...مگر دو سوا دو سو برس کے بعد میرا گھر بار کہاں رہ گیا ہوگا؟ نہ صحیح۔ مجھے پتہ تو لگے کہ اب وہاں کیا ہے،کون ہے،کچھ ہے بھی کہ نہیں؟اللہ میرا جانتا ہے میں نے کچھ ایسا گناہ نہ کیا تھا کہ جس کی سزا مجھے یوں ملتی اور مسلسل ملتی...اب کے بعد میں کیا کروں...مجھے ایک طرح سے نئی زندگی ملی تھی۔ میں اس نئی زندگی کو گذارنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کروں...فقیری لے لوں کہ پھر سے گھر گرہستی جماؤں۔ ہر چند کہ میری عمر ڈھائی سو برس سے متجاوز تھی لیکن اضمحلال قویٰ میں میرے مطلق نہ تھا۔یا اگر تھا تو اتنا ہی جتنا کسی بوڑھا ہوتے ہوئے مرد کے ہاتھ پاؤں میں ہوتا ہے۔

آگے تو مجھے عبادات اور وظائف سے اتنا ہی شغف تھا جتنا کسی سپاہی پیشہ کو ہوتا ہے۔کبھی کبھی اولیاء اللہ کے دربار میں ضرور حاضر ہو جایا کرتا تھا ورنہ نماز جمعہ کا بھی اہتمام کچھ نہ کرتا تھا۔لیکن اس وقت نماز اور دعا سے میرا دل کچھ ہلکا تو ہوا ہی تھا،مگر شاید ان عفت مآب شہزادی کی نیتوں اور اعمال نیک کی برکت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں کئی ارادے ڈال دیئے جن کو قوۃ سے فعل میں لا کر میری اگلی زیست کا کچھ نقشہ مترتب ہو سکتا تھا۔سب سے پہلے تو میں نے زینت النسا بیگم کی سرائے پر جا کر بھٹیارن اور اس کے مرد کے سامنے خود کو ملک سند سے آیا ہوا مسافر ظاہر کیا اور بتایا کہ میں تلاش معاش میں دہلی آیا ہوں،جب تک کوئی صورت نوکری کی نہ نکلے،میں سرائے ہی میں مقیم رہوں گا۔انھوں نے میرا نام تو پوچھا لیکن جہاں سے آیا تھا وہاں کی تفصیل اور میرے اثاثے کے بارے میں کچھ نہ پوچھا۔میں نے خود ہی بتا دیا کہ دہلی سے باہر وزیر آباد پر نہر کے پاس میں لٹ گیا تھا اور گذشتہ رات میں نے ایک دوست کے یہاں کھڑکی گاؤں میں گذاری تھی۔اس کے آگے میں نے کچھ نہ کہا اور نہ ہی بھٹیاری نے میرا اعلام لکھوانے کے باب میں کوئی تعجیل ظاہر کی۔

میں نے کرایہ پوچھا تو معلوم ہوا کہ ڈیڑھ پیسہ روز کے حساب سے میں کئی دن قیام کر سکتا ہوں۔ کھانا جو مطلوب ہو گا پکا دیا جائے گا۔ اس کی قیمت الگ سے دینی ہو گی۔ سرائے سے کچھ دور پر دریا گنج میں کئی حمام تھے وہاں غسل وطہارت کا انتظام تھا۔

میرے پاس زر مقامی تو تھا نہیں۔ جب میں نے اپنے چھدام بھٹیاری کو دکھائے تو وہ خوف زدہ ہو کر بولی کہ میاں صاحب یہ جناتی سکے کہاں سے لائے، میں نے انھیں کبھی دیکھا نہیں اب چھونے سے ڈرتی ہوں۔ مجھے تو اس شہر اور اس زمانے کے پیسے درکار ہیں۔ میں نے بہتیری کوشش اسے سمجھانے کی کی کہ جہاں سے میں آیا ہوں وہاں یہی سکے رائج ہیں۔ لیکن جب میں نے زیادہ زور دے کر اسی بات کو کہنا چاہا تو اس کے چہرے پر شک کے آثار پیدا ہوئے۔ شاید اسے خیال آیا ہو کہ میں کوئی ڈکیت تھا اور مجھے کسی پرانی حویلی میں گڑا خزانہ ہاتھ لگ گیا تھا۔

''میاں صاحب، میری مانو تو ان پیسوں کو کوتوالی میں لے جا کر دکھاؤ۔ وہ پہچانیں گے کہ یہ کیا مال ہے اور اس کی قیمت کیا ہے۔ مجھے تو بالکل درکار نہیں۔''

اس کی آواز کچھ بلند ہوتے دیکھ کر بھٹیارا بھی ہماری طرف متوجہ ہوا تھا کہ ایک دو مسافروں کو بھی تجسس ہوا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ دہلی والے میرے زمانے میں بھی جھگڑے تماشے پر مجمع لگانے کے بہت شوقین تھے۔ اب شاید وہ ذوق اور بھی افزوں ہو گیا تھا۔ اس کے پہلے کہ میں کسی مجمعے کی توجہ میں آجاتا، میں نے اپنے گلے کا کنٹھا اتار کر بھٹیارن کو دے دیا۔ اس میں کچھ دانے چاندی کے اور ایک دانہ سونے کا تھا۔ ایک آدھ دانہ شاید مرجان کا بھی رہا ہو، باقی رنگین شیشوں کے تھے۔ میں نے کہا:

''نیک بخت، اتنے کہ میں بازار جا کر اپنا کام ڈھونڈوں، تو یہ رکھ لے اور ایک کوٹھڑی پر تالا میرے نام کا ڈال دے۔ باقی حساب ہوتا رہے گا۔''

بھٹیارن کا مزاج کچھ ٹھنڈا پڑا اور میں اپنی دادی کو دعائیں دیتا ہوا کہ ہار یہ انھیں مرحومہ کا تھا اور میرے باپ نے مجھے میری شادی پر پہنایا تھا، سرائے کے باہر آ گیا اور اسی راہ پر چل پڑا جس پر میں نے سواروں اور پیدلوں کو چلتے دیکھا تھا۔ بہت بلند اور بہت گراں جثہ دروازہ، جیسا کسی قلعے کے لیے مناسب ہوتا۔ دونوں طرف اونچی فصیل، لیکن زینت المساجد کی طرف سے آنے جانے والوں پر کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ دروازہ دہلی دروازہ کے نام سے موسوم تھا مگر اب بہت سے لوگ دہلی کے بجائے دلی کہنے لگے تھے۔ وجہ اس کی معلوم نہ ہوئی پر بعد میں میں نے سنا کہ یہاں

کے ایک شاعر بقا صاحب نے ایک اور شاعر صاحب جن کا نام میر تھا، ہجو میں ان کی کہا تھا ؎

پگڑی اپنی سنبھالیے گا میر اور بستی نہیں یہ دلی ہے

مجھے تو دہلی کی جگہ دلی نام بالکل پسند نہ آیا۔ ہمارے زمانے میں لوگ عموماً کہتے تھے دہلی جنت کی دہلیز ہے۔ کئی گنوار لوگ اور بھی اچھا کہتے کہ دہلی جنت کی دہری۔ لفظ دہری بمعنی دہلیز شاید علاقۂ بہار سے یہاں آیا تھا کہ دکن سے، مگر لوگ بولتے ضرور تھے۔ بازار کا نام معلوم ہوا کہ دریا گنج ہے۔ مساجد کے علاوہ بھی یہاں لوگوں کی آؤ جاؤ کے سامان بہت تھے۔ ایک بات میں نے یہ دیکھی کہ اس شہر میں اب تجارت اور سامان کی وہ کثرت تھی جس کا ہمارے وقتوں میں تصور محال تھا۔ ہر جگہ ہر طرح کا سامان خریدار کی آنکھ کو متوجہ کرتا تھا۔ کہتے تھے دنیا کا ہر سامان دریا گنج میں لے لو اور وہاں اگر نہ ملے تو چار قدم آگے چل کر جاؤ چاندنی چوک میں ملے گا ہی ملے گا۔ کیا شے تھی جس کے مشتری یہاں نہ تھے اور جس کے مشتری بھی یہاں نہ تھے۔ ان میں سے کئی تو گاہکوں کو متوجہ کرنے کے لیے آواز لگا لگا کر پکارتے تھے اور کئی نے اپنے نوکر باہر کھڑے کر رکھے تھے جو ہر آنے جانے والے، حتیٰ کہ پالکی سواروں کو بھی روکنے کی کوشش کر کے بتاتے کہ ان کے یہاں کون سا مال ملتا ہے۔ ہر طرح کے دکاندار نے اپنے مال کے موافق دلچسپ آوازیں وضع کر رکھی تھیں۔ مثال کے طور پر سوئی دھاگے پیچک والے یوں پکارتے تھے:

اے میاں یہ اصفہان کی سوئیاں ہیں آنکھوں میں کھبتیاں ہیں!

اے صاحب یہ لو ڈھاکے والی ململ کا دھاگا، جس کو چاہو کچے دھاگے میں باندھ لو۔ چاہو کرتا شلوار سلوا لو!

بھائی میاں ذرا دیکھتے جائیو یہ ملک یمن کے ریشمی دھاگے ہیں، ان سے بنتے حضرت سلیمان کے راگے ہیں!

اے جی صاحب ان سوئیوں میں تلواروں کا لویا ہے، ان سے ہم نے موتیوں کو پرویا ہے!

عجب لطف کا سماں تھا۔ بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے تاجر بھی اور رنگ رنگ کے لباس وضع قطع والے خریدار بھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ صراف یہاں بے شمار تھے۔ قدم قدم پر ان کی دکانیں، اور کئی تو یوں ہی سر راہ دری بچھا کر اپنی تمام ملکیت کی نمائش کرتے تھے۔ میں نے جگہ جگہ رک کر بغور لیکن خود کو نمودار کیے بغیر دیکھا کہ مال کیا ہے اور گاہک کیسے ہیں، تو معلوم ہوا کہ صرافوں کا عجب عالم ہے۔ ان کے پاس طرح کا اور ہر ملک کا سکۂ رائج الوقت موجود تھا۔ عراق کے

دینار سے لے کر ایران کا تمن اور روم کا ریال اور ملک فرنگ کا فرانک اور پیسو اور پونڈ، سب مہیا تھے۔ گاہک بھی چین و ترکستان سے لے کر دکن و روم و فرنگ کے تھے۔ جس کے پاس جو تھا اسے خرید رہا تھا یا بیچ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ گاہک ہو یا بیچنے والا ہو، کسی سے کوئی کچھ پوچھتا نہ تھا۔ لیکن میرے سکوں جیسے پرانے سکوں کا لینے والا یا بیچنے والا دکھائی نہ دیتا تھا۔

میں نے ہمت کڑی کر کے ایک ایسے صراف کی طرف رجوع کیا جس کے ہاں بہت ازدحام نہ تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے السلام علیکم کہا۔ اس نے مسکرا کر اور گرم جوشی سے کہا:

''وعلیکم السلام میاں جی صاحب، کہیے کیا خدمت کروں؟''

شاید میرے لہجے اور میرے لباس سے وہ مجھے غیر ملکی سمجھا تھا، کیوں کہ ہندی میں جواب اس نے ٹھہر ٹھہر دیا تھا۔ میں نے بھی قیافہ پہچان لیا کہ وہ مجھے یہاں کا نہیں سمجھتا۔ ایک تنکہ جو کہ میں نے پہلے ہی ہمیانی سے نکال کر شلوکے کی جیب میں ڈال رکھا تھا، میں نے اسے نکالا اور اپنی ہتھیلی پر رکھ کر اسے دکھایا اور کہا:

''اینہا را چہ بہا می دہید آغا؟''

صراف نے جھک کر تنکے کو بڑے غور سے دیکھا۔ پھر بولا:

''می توانم کہ من برایں مسکوک انگشت نہم آغا، و در دست من گیرم؟''

میں نے کچھ سوچ کر کہا، ''درست۔''

صراف نے وہ تنکہ میرے ہاتھ سے لے کر انگلیوں سے رگڑا، الٹا پلٹا، ایک اور چاندی کے سکے سے ٹکرا کر کھنکایا، پھر بولا:

''آغا ایں سکہ را از کجا آوردہ باشید؟''

مجبوراً میں نے وہی کہانی سنائی کہ ملک سند سے آیا ہوں۔ وہاں یہ سکہ چاندی کے معیاری ایک تولہ والے نصری درہم کے برابر گنا جاتا ہے۔

میری فارسی اس کے لیے بالکل قابل فہم تھی، لیکن میرا لہجہ شاید اسے کچھ بھاری پڑ رہا تھا۔ میری ہندی بہت مختلف تھی، لیکن مجھے ہندی بولنے کی مشق ضرور تھی۔ باقی گفتگو میں وہ زیادہ تر فارسی اور میں زیادہ تر ہندی بولا۔ حاصل یہ ہوا کہ پاس پڑوس کے بڑے صرافوں سے پوچھ کر اور مشورہ کر کے تصفیہ ہوا کہ ایک تنکے کے بدلے ڈھائی روپے دہلوی ملیں گے۔ اگر تنکے زیادہ ہوں اور یک مشت فروخت کرنے ہوں تو کچھ زیادہ مل سکیں گے۔

میں نے کہا کہ میں پانچ تنکے بدلواؤں گا، فی الحال یہ ایک بدل لیا جائے۔ پھر میں نے وہ چند چھدام نکالنے چاہے جو میں نے بہادر گڈھ میں بھنائے تھے اور وہ بہلولی جو ابھی میرے پاس تھے۔ لیکن میرا دل دفعۃً درد سے بھر گیا۔ آہ کیا وہ دن واقعی تھے، یا اب یہ دن واقعی ہیں، کیا بہادر گڈھ کی وہ سرائے اب بھی ہوگی، کیا بہادر گڈھ ہی ابھی ہوگا؟ میں نے خیال کیا کہ یہ سکے یادگاری رکھ لوں، مگر کس کی یادگار، اور وہ کس کے مطلب کے ہوں گے، ان سوالوں کا جواب میرے پاس نہ تھا۔ جوں کر کوئی بوڑھا اپنے زمانۂ صبا کا کوئی کھلونا یا اپنی ٹوپی یا مشق کی تختی کہیں سے پاجائے اور اس کا دل اس زمانے کی کھٹی میٹھی یادوں سے بھر جائے اور اس کی آنکھوں میں آنسو جاری ہو جائیں۔ اس کا دل بے طرح چاہے کہ میں اس یادگار کو رکھ لوں، مگر کیوں اور کس کے لیے، یہ اس کی سمجھ میں نہ آتا ہو۔

بازار میں گھومتے پھرتے، لوگوں کی باتیں سنتے اور کبھی کبھی خود بھی ایک دو سوال تجاہل عارفانہ کے ساتھ پوچھ دینے سے کئی امور مجھ پر روشن ہوئے۔

اس وقت کے بادشاہ کا نام واقعی احمد شاہ تھا۔ یہ اس کے سنہ جلوس کا دوسرا سال تھے۔ یہ لوگ سنہ ہجری اور سنہ ہندی کے ساتھ سنہ جلوس بھی گنتے تھے، یعنی بادشاہ حال کو فرمانروائی کرتے کتنے برس گذرے۔ شاہی کواغذ اور فرامین میں اور رسمی مواقع پر سنہ جلوس مندرج کرنے یا اس کا اعلان کرنے کا التزام تھا۔

یہ بادشاہ خاندان مغلیہ کے تھے اور ان کا سلف ظہیر الدین محمد بابر ہے جو کابل میں مدفون ہے اور جس نے ابرہیم لودی سے سلطنت چھینی تھی۔

سنہ ہجری کے حساب سے یہ سال ۱۱۶۱ ہے۔ اس طرح میں نے امیر جان کے مزار کے اندر ڈھائی گھنٹے نہیں، کوئی ڈھائی سو برس گذارے تھے۔

ان بادشاہوں پر کئی سال سے گاڑھا سماں تھا، پھر بھی ہاتھی لاکھ لٹے گا تو سوالاکھ کا ہوگا کے مصداق ابھی دہلی کی بادشاہت کا سکہ ہر جگہ رواں تھا۔

اب میں آہستہ آہستہ اس صدمے اور شاق اور ضعف جاں کے عہدے سے باہر آرہا تھا جس کا شکار میں اس وقت سے تھا جب میں امیر جان کے مزار سے باہر آیا تھا۔ اب مجھے اس بات کی زیادہ فکر نہ تھی کہ امیر جان کا مزار واقعی کوئی جگہ تھا جس میں مجھے وہ سب کچھ عجائب وغرائب دیکھنے کو ملے تھے۔ اتنا تو مجھے یقین کامل تھا کہ میں تھا۔ میں گل محمد سلطان سکندر ابن سلطان سکندر لودی کے

عساکر میں خان دوراں کے دامن سے متوسل احدی تھا۔امیر جان سے قرض ساڑھے تین سو تنکے میں نے لیے تھے، بالضرور لیے تھے۔میں نے اپنی بیٹی کی شادی اسی زرمقروضہ سے کی تھی۔اس میں بھی کوئی شک نہ تھا۔جب وہ واصل بحق ہوئے تھے تو سال ۹۲۴ تھا۔جب میں نے آخری بار اپنا وطن چھوڑا، وہ سال ۹۲۸ تھا۔

اس درمیان، میں یا تو مر چکا تھا، یا کہیں پڑا ہوا کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔اگر مر گیا تھا تو پھر میں یہاں زندوں کی طرح، اور گذشتہ یادوں کے ساتھ کیونکے موجود تھا؟ کیا اسی کا نام برزخ ہے، یعنی جس شہر سے میں پوری طرح مانوس تھا، اسی شہر میں لیکن کسی نامانوس زمانے میں ڈال دیا جاؤں؟ مگر اس سے اللہ کی کون سی مصلحت، کون سی مرضی پوری ہوتی تھی؟ کیا اللہ تعالیٰ کو مجھ سے کام کوئی لینا ہے؟ کیا میری تقدیر ایک محض احدی کی تقدیر نہیں ہے؟ یا ایسا ہے تو ابھی پردہ اسرار سے اٹھے گا۔شاید مجھے کچھ بشارت ہوگی۔قدرت کے کھیل نرالے ہیں۔ان معاملات میں مجھے کیا کسی کو دخل دینے یا دم مارنے کی جرأت نہیں ہوسکتی۔مجھے صبر سے انتظار کرنا چاہیئے۔

یا میں مر ضرور گیا ہوں لیکن ملک الموت کی کسی غلطی سے میری روح راستے ہی میں کہیں ملک الموت کے چنگل سے چھوٹ گئی اور پھر فرشتوں نے مجھے یوں ہی بھٹکتا ہوا دیکھ کر واپس میرے شہر میں ڈال دیا۔کیا ایسا ہوتا ہے؟ یہاں ان دنوں ایک سے بڑھ کر عارف کامل اور واصل بالحق موجود ہے۔ابھی بازار ہی میں ایک صاحب کسی شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے مدرسے کا ذکر کر رہے تھے۔یہ بے یقینی اور تلاطم ذہنی کی آندھیاں رکیں، میرے پاؤں کہیں ٹھہریں، تو میں سوچ سمجھ کر ان سے یا کسی اور بزرگ سے دریافت کروں۔

اچھا، اگر میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں تو کیا ایسا بھی ہوتا ہے کہ خواب دو ڈھائی سو برس بعد شروع ہو؟ اپنے حسابوں تو میں حد سے حد پانچ دن پہلے اپنے آبائی گاؤں میں تھا۔اب ڈھائی صدیاں سوتے سوتے پھلانگ گیا ہوں۔واہ، کیا خوب کہی۔آخر کتنا طویل المدت خواب ہے یہ۔اور کیا خوابوں میں دن رات کی گنتی بھی ہوتی ہے؟ میں تو بخوبی گن سکتا ہوں کہ میں کھڑکی گاؤں میں کب تھا اور یہاں اس سرائے زینت النسا بیگم میں کب آیا۔

پھر... ایسا تو نہیں کہ میں مر تو چکا ہوں مگر کوئی مجھے خواب میں دیکھ رہا ہے اور میں بھی وہی خواب دیکھ رہا ہوں... یعنی کوئی دیکھ رہا ہے کہ میں مر گیا، لیکن اس کے خواب میں کہیں میں موجود ہوں یا اس نے مجھے اپنے خواب میں زندہ کر کے مجھے بھی اس خواب کا ایک فرد بنا دیا ہے۔اب لگتا ہے

کہ میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں، کام کر رہا ہوں، گھوڑ سواری کر رہا ہوں، امیر جان...مگر امیر جان تو کوئی تھی نہیں ...غلط، سراسر غلط۔ امیر جان تھی۔ میری بیٹی ایک تھی اور اب بھی ہے۔ میں اسے بیاہی اور گود میں ایک پیارا سا بچّہ کھلاتے چھوڑ آیا ہوں۔تو پھر امیر جان اگر تھی تو اس کی موت بھی تھی اور اس کی موت تھی تو اس کا مزار بھی تھا اور اگر مزار تھا تو وہ سب واقعات...نہیں یہ کیا لغو اور واہی تباہی بیان ہے۔اصلیت یہی ہے کہ مجھے دوڈھائی صدیوں کے پار یہاں لا بٹھایا گیا ہے۔مگر کیوں؟ کہا نہ کہ خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ کسی کو ان باتوں میں دم مارنے کا یارا نہیں۔تو کیا یہ اور لوگوں کے ساتھ بھی ہوا ہے یا ہوتا ہے؟ ہوتا ہوگا۔ تمھیں کیا خبر یہ لوگ جن کے کھوے سے میرا کھوا چھل رہا ہے ان میں سے کتنے اس زمانے کے ہیں اور کتنے تمھارے زمانے کے یا تمھارے بھی زمانے کے پہلے کے ہیں؟

الف لیلہ میں نے نہیں لکھی، پڑھی بھی بہت نہیں۔اس طرح کی خرافات میں میرا دل لگتا نہیں ہے۔لیکن وہاں بھی تو سنا ہے شیشے کے اندر سے جنات ہزاروں ہزار سال بعد نکل آتے ہیں۔کیا معلوم میں بھی کوئی جنات ہوں۔جب میں اس قبر میں داخل ہوا تو گل محمد احدی تھا، جب باہر آیا...جب باہر آیا...تو جنات تھا۔نہیں۔ ذرا ٹھہرو۔ تمھیں کیسے معلوم کہ تم باہر واپس آگئے ہو؟ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ جس دنیا میں تم نے وہ رقاصہ دیکھی، جس بالا خانے سے تم نے قطب صاحب کی لاٹھ دیکھی، اسی دنیا میں تم ابھی یہ سب بھی دیکھ رہے ہو؟

یک مرتبہ مجھے بخار جیسی کپکپی چڑھ آئی۔ بڑے زور کا پیشاب لگا۔قریب تھا کہ میرا پیشاب نکل جائے کہ مجھے ایک مسجد نظر آگئی۔اللہ بخشے مسجدوں کے بنانے والوں کو۔میں جھپاک سے اندر گیا۔مسجد کے استنجا خانے میں گھس کر دروازہ بند کر کے بیٹھ گیا۔بڑی دیر بعد باہر نکلنے کے لیے ہمت کو مجتمع کر سکا۔مگر اب یہاں دیر کیا اور زود کیا معنی رکھتا تھا؟ مجھے ہر دن، ہر ساعت، ہر گھڑی یوں جینی تھی گویا وہ بالکل حقیقی ہو اور آخری بھی ہو۔

تعفن، تاریکی اور تنگی جا کے باوجود میرا جی نہ چاہتا تھا کہ پیشاب خانے سے باہر نکلوں۔باہر کی دنیا نامفہوم، اجنبی، پر اسرار اور بڑی حد تک تہدید سے بھری ہوئی لگتی تھی۔ایسا میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ دنیا میں کوئی بالکل اکیلا بھی ہوسکتا ہے۔بے باپ ماں کا ہوگا کوئی تو بھی اس کا گھر تو ہوگا۔نگھرا تو کوئی ہوتا نہیں۔اور اگر گھر بھی نہیں تو گاؤں گراؤں دھام کچھ تو ہوگا۔ پر مجھے تو یہ معلوم بھی نہیں کہ گھر میرا اس صفحۂ ہستی پر ہے بھی کہ نہیں۔ مجھ سا بے کس اور بے کو بھلا کوئی ہوگا۔ بالکل

ہی بے یاور اور بے یارا، اب میرا ہوگا تو کیا ہوگا... مجھے لگا کہ شاید کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ کسی کو بہت عجلت ہے یا مجھے ہی شاید دیر بہت ہوگئی ہے۔ نمازیوں کے دل میں سو طرح کے چتے آ رہے ہوں گے کہ یہ شخص مر تو نہیں گیا، بے ہوش تو نہیں ہو گیا۔

میں کچھ ہڑبڑایا سا باہر نکلا۔ دروازے پر تو کوئی نہ تھا مگر اندھیاری سے نکلنے کے باعث کچھ میں چوندھیا سا گیا تھا، یا شاید حواس ہی میرے پراں تھے۔ قدم مسجد سے باہر نکالا ہی نکالا تھا کہ ایک صاحب سے ٹکرا گیا۔ میں نے شرمندگی کی وجہ سے سر بھی نہ اٹھایا۔ شکل اور وضع قطع میری یوں ہی اجنبیوں جیسی تھی، یہ صاحب مجھے کیا گردانتے ہوں گے، کوئی ملکی گنوار سمجھ کر شاید معاف کر دیں شاید میرے ساتھ کھلی بازیاں کریں کہ نیا پکھیرو کہیں سے بھٹکا ہوا آ گرا ہے۔ مگر سر نہ اٹھا سکنے کے بوجھ میں ٹھیک سے آپ کو سنبھال نہ سکا اور دوبارہ انھیں صاحب سے ٹکرا گیا۔

''اجی حضت کیا ڈوڈا پی رکھا ہے جناب نے؟'' انھوں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''قدموں پر قابو نہ رہا تھا تو گھر ہی میں بیٹھ کر غین رہتے۔''

میں مارے خفت کے گھبرا کر وہیں دروازۂ مسجد پر بھد سے بیٹھ گیا تھا۔ ان صاحب نے بڑی شفقت سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا ''بارے اب اٹھئے، کہیں چوٹ ووٹ تو نہیں آئی؟''

''جی ....جی ....شک ...شکر ہے...شکریہ جناب کا۔ میں...میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' میں نے بدقت سر اٹھایا اور اٹک اٹک کر کہا۔ ''جناب درگذر فرمائیں۔ اچانک مجھے کچھ چکر سا آ گیا تھا۔''

''اے ہے، بچارے غریب شہر لگتے ہو۔ ڈھارس رکھیں جناب گھبرائیں نہیں۔ کیا میں جناب کو فرودگاہ تک آپ کی پہنچا دوں؟''

میں نے اب ان صاحب کو دیکھا اور بھچک رہ گیا۔ واللہ کیا نازک نقوش تھے۔ لیکن مردانہ وجاہت میں پھر بھی کمی نہ تھی۔ کشیدہ قامت، چھریرا بدن، گورا رنگ، مسکراتی ہوئی آنکھیں، گہری سیاہ۔ بہت بڑی بڑی آنکھوں سے زیادہ حیرت زا ان کی پلکیں تھیں، کیا کسی شہزادی یا پری کی ایسی پلکیں ہوں گی۔ میں نے سنا تو تھا کہ کچھ لوگوں کی پلکیں ان کی آنکھوں پر پردہ سا ڈالے رہتی ہیں، لیکن دیکھا کبھی نہ تھا۔ جب وہ مژگاں اپنی کھول کر دیکھتے تھے تو لگتا تھا منہ پر چراغ دو روشن ہو گئے ہیں۔ بہت نفیس کتری ہوئی ڈاڑھی، لمبی بالکل نہیں لیکن کم بھی نہیں۔ مونچھیں ذرا نمایاں، بل دی ہوئیں نوکدار لیکن لمبی نہیں۔ پتلے پتلے ہونٹھ، ان پر ہلکی سی سرخی، شاید تمبول کی دولت سے، یا شاید ان کا رنگ ہی سرخ گلابی تھا۔ سر پر پٹے جو شانے کے ذرا اوپر تک آئے ہوئے تھے، اوپر سنہری

دھاریوں کا آسمانی رنگ کا ریشمی چیرہ، خوب بل دیا ہوا، اس طرح کہ سر سے گویا ہم آغوش لگتا تھا۔ بہت باریک ململ کا کرتا، اسی آسمانی رنگ کا، لیکن رنگ اتنا ہلکا کہ نیچے کا بدن جھلکتا تھا۔ کرتے پر وہی لباس جس کی آستینیں اوپر سے کٹی ہوتی ہیں۔ کاشانی مخمل، جس پر ہلکی ہلکی جواہرات کی بیل ٹکی ہوئی، لیکن بہت متناسب۔ ریشمی دھاری دار کپڑے کا پاجامہ، کاکریزی یا شربتی رنگ کا، جو ان کے گورے بدن پر عجب بہار دے رہا تھا۔ کرتے کے ہلکے لطیف کپڑے کے مقابلے میں پاجامے کا کپڑا بھاری تھا، اتنا کہ پاؤں کی ٹھوکر سے کچھ بڑھا ہوا تھا۔ سیاہ چمکیلے چمڑے کی جوتیاں جن پر زری کا بھاری کام، کمر میں ڈوپٹے کے بجائے نیلے کیمخت کا پٹکا، جس پر زری کا کام اور کہیں کہیں سرخ قیمتی پتھر ٹکے ہوئے، کمر میں جڑاؤ خنجر جس کی میان بھی جڑاؤ تھی۔ گلے میں موتیوں کا سہ لڑا مالا، لگتا ہے اسی گردن کی زیب و زینت کے لیے وہ موتی بنائے گئے ہوں گے۔ ایک بھی دانہ غیر متناسب نہیں، آب و تاب میں ذرا دودھیا دھندلے، جیسے کہ سچے موتی ملک سیلان کے ہوتے ہیں۔

ان کی عمر بھی کوئی میری سی ہوگی، یعنی پچاس کے لگ بھگ۔ مگر چہرے پر ایسی نرمی اور اس قدر تازگی تھی گویا ابھی مدرسے سے اٹھ کر چلے آرہے ہوں۔ ان کے پورے شخص سے روشنی سی پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ میں نے یہ بھی خیال نہ کیا کہ کتنی بڑی بدمذاقی کر رہا ہوں کہ انھیں دیکھے جا رہا ہوں۔ ان کی بات کا جواب بھی نہیں دیا ہے۔ لیکن شاید وہ صاحب اس طرح سے دیکھے جانے کے عادی تھے۔ انگشت نمائے عالم ہونا نئی کوئی بات ان کے لیے نہ تھی۔ وہ پورے اطمینان اور دل جمعی سے سمت میری میں دیکھتے رہے۔ شاید وہ بھی محسوس کر چکے ہوں کہ میں انھیں دیکھ کر مبہوت ہو گیا ہوں، اور کوئی باعث خاموشی کا میری نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مجھ سے آنکھیں نہ چرا رہے تھے۔ بے شرمی سے چار چشم بھی نہ تھے لیکن میرے استغراق کو انھوں نے عجب خندہ پیشانی سے لیا اور شرمائے بھی بالکل نہیں، بس انتظار میں رہے کہ میں آپ میں واپس آؤں تو سلسلہ تکلم کا آگے بڑھے۔ ان کے کسی میں انداز میں اتراونے بناؤنے کا شائبہ تک نہ تھا۔

اچانک مجھے لگا کہ صرف میں ہی ان اجنبی شاہ خوباں کو نہیں دیکھ رہا ہوں، کچھ لوگ مجھے بھی دیکھ رہے ہیں اور شاید زیر لب مسکرا بھی رہے ہیں اور کچھ لوگ ان اجنبی گل خوبی کو بھی کچھ اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے انھیں بھی یہ اچھا لگتا ہو کہ لوگ انھیں رو کریں۔ میں نے چونک کر گویا نیند سے آنکھیں کھولیں اور ایک قدم آگے بڑھ کر چاہا کہ ان کا دامن تھام لوں۔ لیکن یہ کس قدر بدتہذیبی کی بات ہوتی۔ میں جھجک کر رک گیا اور بولا:

''جناب ،معافی کا خواستگار ہوں۔ میں واقعی غریب الدیار ہوں...''

ابھی میں بات پوری نہ کر پایا تھا کہ ایک صاحب مسجد کے اندر سے لپکتے ہوئے آئے اور بے تکلفی سے ان اجنبی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے چوم کر بولے:

''اے واللہ میر صاحب،کیا بھاگ ہیں میرے جو آپ یہاں توقف کر گئے،''انھوں نے میری طرف مختصر سا اشارہ کیا۔'' اور مجھے دست بوسی کا موقع مل گیا۔کئی دن سے نیت کر رہا تھا کہ ڈیرے پر جناب کے حاضر ہوں گا۔''

''السلام علیکم میاں شرف الدین پیام صاحب۔خوب ملے آپ۔ میں ابھی ان نئے دوست اپنے سے معرفی حاصل کر ہی رہا تھا...بھئی آپ کا وہ شعر تو کیا غضب کا تھا میاں شرف الدین صاحب،ٹوپی والوں نے قتل عام کیا...لیکن ذرا غم کھائیں۔''پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولے:

''میاں صاحب آیا کہیں دور سے تشریف لائے ہیں؟ جناب میں عرض کر رہا تھا مستقر جناب کا کہاں ہے؟''

واللہ کیا سریلی،کھنکتی ہوئی سی لیکن مردانہ آہنگ والی آواز تھی، اتنی صاف اور کھلی ہوئی گویا محفل میں شعر سنا رہے ہوں۔

''جی میں یہیں قریب ہی مسجد زینت النسا کے پاس والی سرا میں اترا ہوا ہوں۔ملک سند سے آیا ہوں۔گل محمد مجھے کہتے ہیں۔''

کچھ لوگوں کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ مجھے زینت المساجد کہنا چاہیے تھا۔ہوگا،میں نے دل میں اپنے بیزاری سے کہا۔کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ میں نو آمدہ ہوں۔آہ،میں نو آمدہ تھا لیکن اجنبی نہ تھا۔ہائے رے تقدیر کے تماشے۔

''تو میاں صاحب ابھی آپ نے دلی کچھ دیکھی بھی نہ ہوگی۔چلیے آپ کو چاندنی چوک کی سیر کرائیں اور کہیں بیٹھ کر قہوہ پی لیں۔''انھوں نے شرف الدین پیام صاحب کی طرف دیکھا،جیسے مستفسر ہوں کہ آپ کا کیا ارادہ ہے۔پیام صاحب تو غالباً اسی امید میں کھڑے تھے کہ میر صاحب مجھے ساتھ چلنے کو کہیں۔

''بہت درست۔بندہ بھی ادھر ہی مدرسۂ رحیمیہ کو جا رہا تھا۔میر صاحب کو امر ناگوار نہ ہو تو میں بھی مشائعت کرلوں۔''پیام صاحب کے لہجے میں مسرت اور اشتیاق ان کے دبائے بھی دب نہ رہا تھا۔میر صاحب نے مسکرا کر فرمایا:

''اجی صاحب، نیکی اور پوچھ پوچھ۔آپ کی معیت میں لطف سیر کا دوبالا ہو جائے گا۔''
''میں بسروچشم حاضر ہوں، بسم اللہ،''میں نے کہا۔

ہم لوگ مسجد کی سیڑھیاں اتر کر بازار میں آئے۔ ہر دوسرا تیسرا شخص میر صاحب کو سلام کرتا اور اکثروں کی کوشش ہوتی کہ انھیں روک کر ان سے دو باتیں کر لیں۔ میر صاحب انتہائی خوش اسلوبی اور خندہ پیشانی سے عناں گیروں کو ٹالتے ،ایک دو فقرے کہہ کر آگے بڑھتے جاتے۔ میں نہایت دلچسپی سے انھیں دیکھتا اور ان کی باتیں سنتا چل رہا تھا۔ کبھی کبھی میں جان بوجھ کر ان کے ایک دو قدم پیچھے ہو جاتا کہ ان کی چال کو بھی دیکھتا چلوں کہ ان کی صورت اور ان کی گفتار ہی کی مانند دلربا تھی۔ رفتار ان کی میانہ سے کچھ تیز تھی ، اور وہ دم رفتار اپنے دونوں ہاتھ یوں آگے پیچھے کرتے تھے گویا چپو چلا رہے ہوں، اور چال ان کی اتنی سہج تھی کہ بس لہریں سی اٹھتی ہوئی لگتی تھیں۔
باتیں ان کی نہایت دلکش، بذلہ سنجی اور ظرافت سے معمور، کبھی کبھی راہ چلتوں پر ایک آدھ فقرہ بھی چست کر دیتے۔ کوئی سنتا بھی تو برا نہ مانتا، خوش طبعی سے مسکرا دیتا۔
''ان میاں صاحب زادے کو ذری دیکھیو، کل سے مدرسے کیا بیٹھنے لگے ہیں کہ سر ہی گھٹا لیا، جیسے چھلا ہوا کسیرو۔''
''کیوں شرف الدین پیام میاں صاحب، وہ سامھنے والوں کی نگاہیں کسی سے نامہ و پیام کرتی ہیں گی یا میں ہی یک چشم ہو رہا ہوں؟''
پیام صاحب مسکرا کر بولے: ''کوئی آپ سے چشمک کرے تو سامھنے ہی کی پھوٹیں۔''
اب میر صاحب نے رعایتوں اور تلازموں کا بازار گرم کر دیا:
''جی جناب، کوئی ستارۂ آسمان سے دیدہ درائی کرے اور کسی کو چشمۂ آفتاب بھی نظر میں نہ آوے۔ ہم سے چشمکیں کر کے کوئی کیا پالے گا۔ ہم نے تماشا گاہ دنیا کی طرف سے آنکھیں موند لی ہیں صاحب۔ سامنے چشمہ ہے جا کے منہ دھو آئے پھر ہمیں آنکھیں دکھائے۔ ہم نے تو پری رخوں کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ منہ دھل جائے تو شاید دیدے تارا سے روشن ہو جائیں، ورنہ ایسا کسی کا منہ کہاں کہ ہمارے منہ آئے۔''
''مگر صاحب طفل اشک تو مچل کر منہ آ ہی جاتا ہے۔ سنئے حضرت میر سوز صاحب فرماتے ہیں اور کیا خوب فرماتے ہیں ۔

اے طفل اشک تجھ کو آنکھوں میں میں نے پالا
تس پر بھی گرم ہو کے تو منھ پہ میرے آیا''

''جی، خوب کہا۔ مگر یہ میں میں کی تکرار ایسی لگی جیسے کوئی ممیا رہا ہو۔'' یہ کہہ کر وہ ذرا سا مسکرائے، جیسے اپنی مسکراہٹ کی شیرینی سے اس تعریض کی تلخی کو ضائع کرنا چاہتے ہوں۔

انھیں خوش گفتاریوں میں راستہ کٹ گیا۔ اچانک میرے پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔ لگا، کسی نے میرے دل کو شکنجے میں کس دیا ہو اور سارے بدن کا خون کہیں اور جا کر جم گیا ہو۔ میں نے چکرا کر کسی دکان کے تختے کا سہارا لینا چاہا لیکن میرا بدن ہی لڑکھڑا گیا تھا۔ میر صاحب نے میری حالت نہ جانے کیونکر بھانپ لی تھی۔ انھوں نے میرا شانہ مضبوطی سے جکڑ لیا اور میں ثابت قدم ٹھہرا رہا۔ اتنے چھریرے اور بید مجنوں جیسے جسم میں اتنی قوت؟ میں حیرت زدہ رہ گیا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ میر صاحب تمام فنون حرب سے بخوبی آشنا تھے، اکھاڑے میں پابندی سے زور آزمائی کرتے تھے اور لکڑی کھیلنے میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ مگر اس وقت تو میں بار دیگر امیر جان کی قبر میں پہنچ گیا تھا... سامنے وہی سر بفلک، دیو آسا، سنگ سرخ کا قلعہ تھا اور اس کے آگے وہی بازار جس میں اس ناظورۂ قتالہ کا رقص میں نے دیکھا تھا۔ قلعے کے ذرا اورلی طرف سے وہی نہر لہراتی بل کھاتی چلی آتی تھی اور اسی طرح طراوت افزا کیفیت میں بازار کے وسط میں بہتی تھی۔

یہ سب میں خواب میں... نہیں، امیر جان کی گور کے اندر لیکن بہوش وحواس اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ اگرچہ مجھے پہلے ہی یقین ہو چکا تھا کہ میں اس وقت اپنے اصل زمانے سے کم از کم دو سوا دو سو برس اوپر آ گیا تھا لیکن اب تک جو میں نے دیکھا تھا ان میں سے کوئی چیز میں نے اس گور کے اندر نہ دیکھی تھی۔ اب جو نظروں کے سامنے تھا وہ پہلے بھی آ چکا تھا۔ اب مجھے یوں لگ رہا تھا گویا میں کسی نئے شہر میں ہوں بھی اور نہیں بھی ہوں۔ اب مجھے اپنے نگھرے ہونے کا پوری طرح یقین ہو گیا تھا اور ستم یہ کہ یہ ایسے وقت ہوا جب میں کچھ دوست، کچھ ملاقاتی اپنے لیے حاصل کرنے کا کچھ امکان رکھتا تھا۔

''کیا ہوا میاں صاحب؟ کیا کچھ جی ماندہ ہے آپ کا؟'' انھوں نے اس طرح پوچھا گویا وہ حقیقتاً فکر مند ہوں کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔

''نہیں، کچھ نہیں۔ بس یوں ہی چکر سا آ گیا تھا۔ آج سارا دن شہر میں آپ کے گھومتا رہا ہوں۔'' میں نے بات بنانے کی کوشش کی۔

''آیئے وہ سامنے ہی قہوہ خانہ ہے۔ وہاں بیٹھ کر تھکے ہوئے پاؤں کو آرام دیتے ہیں۔''

قہوہ خانے کی فضا میں کئی طرح کی جدید خوشبوئیں تھیں، لیکن نہایت گوارا۔ تنبول سے میں واقف تھا، اگرچہ ہمارے زمانے میں چلن اس کا بہت نہ تھا۔ لیکن یہ تنبا کو عجب شے تھی۔ لوگ اسے کٹوروں میں ڈال کر سلگاتے اور پھر ایک لمبی نے سے اس کا دم لگاتے۔ بڑا فرحت افزا اور معطر دھواں نکلتا اور ماحول کو عجب انوکھی سی خشک اور بہت لطیف، گرم، خوشبو سے بھر دیتا۔ دھواں جہاں تک پھیلتا وہاں تک خوشبو جاتی، چاہے دھواں زائل ہی کیوں نہ ہو گیا ہو۔ بظاہر قہوہ خانے میں کئی طرح کے تنبا کو بکار لائے جاتے تھے کیونکہ میں الگ الگ دھوئیں اور الگ الگ خوشبوئیں محسوس کر سکتا تھا۔

معلوم ہوا جس آلے کو یوں تنبا کو پینے کے کام میں لاتے ہیں، اسے ایرانی قلیان اور ہندی بھنڈا کہتے تھے۔ اس کے ہر حصے کے الگ الگ نام تھے: چلم، نیچہ، پیچوان، نے، مہنال، یہ نام تو اسی دن قہوہ خانے میں شنید ہو گئے تھے۔ اور تنبا کوے نوشیدنی الگ شے تھی اور تنبا کوے خوردنی الگ شے تھے۔ موخر الذکر میں بھی عطریات وافر ہوتی تھیں لیکن بڑا عیب اس میں کھا کر تھوکنے کا تھا۔ پان کے ساتھ کھائیں تو تھوکنا لازم آتا تھا۔ قہوہ خانے میں جگہ جگہ اگال دان، پیک دان، موجود تھے۔ لوگ پیک تھوکنے یا اگال الگ کرنے میں خاصے محتاط تھے لیکن اپنے کرتے پر کی چھینٹوں کا کیا کرتے۔ کئی لوگوں کے دامن میں نے کم یا زیادہ بہاری دیکھے۔ میر صاحب سے رسمی سلام و کلام کرنے والوں کے علاوہ کئی ان کے دوست یا ملاقاتی تھے۔ سب ایک گوشے میں یک جا بیٹھے، نئے دوست بھی جو آتے تو اسی کنج بے تکلف میں اپنے لیے جگہ بنا لیتے۔ لمبی، کچھ تنگ اور نیچی سی چوکیاں، ان پر صاف کھاروے کا دسترخوان یا مخمل پوشش، چاروں طرف مخملی گدے۔ بھنڈا عندالطلب حاضر کیا جاتا تھا۔ کچھ کھانے کی خواہش ہوئی تو قہوہ خانے کا ملازم لونڈا پاس کے نانبائی یا حلوائی سے مطلوبہ سامان جھپاک سے لے آتا۔

قہوہ خانے کی گفتگوؤں اور چہلوں میں خاصا وقت نکل گیا۔ میری گھبراہٹ بھی اب کم ہو چلی تھی۔ اب مجھے اپنے اجنبی کرم فرما کے بارے میں کچھ معلوم ہو گیا تھا۔ نام ان کا سید محمد علی اور تخلص حشمت تھا۔ یہ لوگ کشمیری الاصل تھے لیکن کئی پشتوں سے دہلی میں مقیم اور بادشاہ وقت یا کسی نمودار امیر کی نوکری بصیغۂ سپہ گری کرتے تھے۔ دو ان کے برادران عابد یار خان اور مراد علی خان مشہور جوہری تھے اور معاملات تیغ و تبر میں بھی ماہر ہونے کے بسبب محمد شاہ بادشاہ فردوس آرام گاہ کے جواہر خانے میں نوکر تھے۔ اس خانوادے میں زر و جواہر کی وہ ریل پیل تھی گویا لکشمی جی نے ان

کے آنگن میں نہر اپنی بہادی ہو۔

بوجہ فراوانی زر اور بوجہ ذوق فطری، میر محمد علی نے کسی کی نوکری نہ کی تھی، شعر گوئی اور دوستداری میں شب و روز ان کے گذرتے تھے۔ میر محمد علی حشمت فارسی میں زیادہ کہتے تھے، ریختہ میں کم۔ فارسی میں اپنے وقت کے مشہور فارسی گو میرزا عبد الغنی بیگ قبول کشمیری کے شاگرد ہوئے۔ ریختہ میں کسی کے آگے زانوے تلمذ تہ نہ کیا لیکن خود انھوں نے ریختہ میں کئی شاگرد بہم پہنچائے تھے جن میں میر عبدالحی تاباں کا نام ہر طرف مشہور تھا۔ استاد سے تاباں کو ایسی محبت تھی کہ اسے ضرب المثل کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ استاد کے بارے میں ان کا شعر بہت مشہور ہوا تھا ؎

نہ مانے جو کوئی حشمت کو تاباں وہ دشمن ہے محمد اور علی کا

استاد کا نام چونکہ محمد علی تھا، اور خود میر عبدالحی موصوف موسوی سید تھے، اس وجہ سے شعر اور بھی بامزہ ہو گیا تھا۔

دھیرے دھیرے میں دہلی والوں میں گھلنے ملنے لگا، لیکن بعد از خرابی بسیار۔ اس عمل میں جو تاخیر ہوئی اور جو روحانی کرب مجھے اٹھانے پڑے ان کا تذکرہ کر کے آپ کو بے مزہ نہ کروں گا۔ دہلی والوں میں میرا خلا ملا سب سے زیادہ تو اس بات کے چلتے ہوا کہ میر محمد علی حشمت نے اپنی ذمہ داری پر مجھے سوا روپے مہینے پر ایک مناسب مکان کوچہ چیلاں میں دلوا دیا تھا۔ پکانے ریندھنے کے لیے ایک شریف بڑھیا ماما بھی آٹھ آنے درماہہ اور دو وقت کے کھانے پر مجھے دلوادی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انھوں نے اپنی ذمہ داری پر مجھے اپنے مربی نواب قطب الدین خان بہادر فوجدار مرادآباد کے رسالے میں بصیغۂ سپہ گری رکھوا دیا تھا۔ آپ کو ان امور پر شگفت و حیرت نہ ہونا چاہیئے۔ ایک عالم میر حشمت کی خوبیوں کا قائل اور مداح تھا۔ یہ بات دہلی میں عام تھی کہ مردان مشاہیر دہلی میں حیا و حمیت واہلیت و آدمیت کی دولت سے بہرۂ وافر رکھنے والا، زائد الوصف اور مستغنی عن الثنا، اگر کوئی تھا تو وہ میر محمد علی حشمت تھے۔

حسن اتفاق یہ کہ چند روز پہلے میر محمد علی بھی اسی رسالے میں دنگل عہدہ داری پر متعین ہو گئے تھے۔ حسن اتفاق کہیں یا یوں کہیں کہ ان کی مدت حیات سپری ہو چکی تھی۔ قضا کو بہانے کی تلاش تھی اور وہ اس نوکری نے بآسانی مہیا کر دیا۔

میر محمد علی حشمت کی صحبت میں رہ کر مجھے جلد ہی شعر و سخن میں دلچسپی دوبارہ پیدا ہو گئی۔ میرے زمانے کے شہر دہلی میں تو مولانا جمالی کے سوا کوئی مشہور و معروف استاد فن شعر میں نہ

تھا۔اور یہ بھی ہے کہ ان وقتوں کی دہلی میں شعر وسخن کا چرچا اس قدر اور اتنا عام نہ تھا جتنا آج کی دہلی میں تھا۔کیا فارسی کیا ریختہ،کیا ہندو کیا مسلمان،ہر شخص ناظورۂ شعر کا متوالا اور شمع سخن پر مثال پروانہ جان دینے والا تھا۔دہلی کی گلیاں شاعروں،زباندانوں اور استادان فن سخن سے پٹی پڑی تھیں۔اپنے مختصر دور حیات میں مجھے ان سب سے ملنے تو کیا،ان کے ناموں سے بھی آشنا ہونے کا موقع نہ مل سکا۔

زبان و کاروبار علم ولسان و بیان کے باب میں سب سے عجب بات یہ تھی کہ یہ لوگ خود کو ایرانیوں سے بہمہ وجوہ بہتر سمجھتے تھے۔ٹیک چند بہار اور آنند رام مخلص جیسے لغت داں اور محاورۂ اہل زبان پارسی کے محققین،سراج الدین علی خان آرزو جیسے فنون شعر ونحو ولغات میں منتہی المدققین، میاں نورالعین واقف اور خواجہ میر درد اور میرزا مظہر صاحب جان جاناں نقش بندی جیسے جید فارسی گو،جدھر جاؤ نیا عالم نظر آتا تھا۔صوفی سنتوں اور اہل اللہ اور علما کی تو گنتی ہی نہ تھی۔خود میرزا مظہر صاحب مغتنمات روزگار صوفیہ میں سے تھے۔شاہ ولی اللہ صاحب محدث کے شہرے مکے مدینے تک تھے۔پھر ان کے صاحب زادگان، اور علاوہ برآں بزرگواراں حضرت سید حسن رسول نما،حضرت شاہ محمد فرہاد،قطب شہر حضرت شاہ کلیم اللہ صاحب جہان آبادی،جدھر دیکھو علم وعرفان اور معرفت کے چراغ جگمگا رہے تھے۔سوائی راجہ جے سنگھ ہیئت اور ریاضی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔استاد خیر اللہ مہندس کے شاگرد از ہند تا ایران پھیلے ہوئے تھے۔

مجھ سے کچھ زمانہ قبل میر حشمت کے استاد قبول کشمیری صاحب کے ساتھ بڑا پر لطف معاملہ گذرا تھا۔شیخ علی حزیں ایک بد دماغ ایرانی شاعر اور حق یہ ہے کہ بہت مستند شاعر وارد شاہجہاں آباد تھے۔وہ مقامی لوگوں سے عموماً نفور رہتے۔ایک بار عبد الغنی بیگ صاحب ان کی ملازمت حاصل کرنے ڈیرے پر ان کے پہنچے تو شیخ علی حزیں نے کہلا دیا کہ شیخ گھر پر نہیں ہیں، ہر چند کہ اندرون خانہ تھے۔مرزا قبول بیگ صاحب اگلے دن کئی اپنے شاگردوں کے ساتھ،کہ ان میں میر محمد علی بھی تھے،شیخ موصوف کی حویلی پر پہنچے اور کہلا دیا کہ جب تک شیخ ہم سے ملاقی نہ ہوں گے،ہم ان کی راہ دیکھیں گے۔چار وناچار شیخ علی حزیں کو دیوان اپنا کھلوا کر ان سے ملنا پڑا۔میرزا قبول بیگ صاحب اور ان کے شاگردوں نے دیر تک اپنا کلام سنایا کہ آپ کا کلام تو ہم سنتے ہی رہتے ہیں،آج ہمارا کلام آپ سماعت کریں۔شیخ بچارے جز بز ہوئے اور منھ بنائے سنتے رہے۔پھر شیخ نے زراہ تواضع کچھ اپنے کلام سنانا چاہا،مگر وہاں کون سنتا تھا۔شیخ بہت خفیف ہوئے اور شہرہ اس بات

کا شہر سارے میں پھیلا۔

لیکن بات میر عبدالحی تاباں کی ہو رہی تھی کہ استاد سے ان کی محبت کا ذکر بچے بچے کی زبان پر ان دنوں تھا۔ اور اس سے بھی بڑھ کر شہرے میر صاحب کے حسن کے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ میر عبد الحی کے سامنے بڑی بیگمات بھی اگر ہوتیں تو ماند پڑ جاتیں۔ میں نے تو یہاں تک سنا کہ بادشاہ وقت اعلیٰ حضرت احمد شاہ پادشاہ غازی بھی کبھی کبھی جب میر صاحب کے دروازے پر سے گذرتے اور میر صاحب گھر اپنے کے باہر نشست گاہ میں تشریف فرما ہوتے تو بادشاہ کسی بہانے اپنا فیل رکوا کر انھیں ایک نظر دیکھ لیا کرتے تھے۔ مجھے میر عبد الحی صاحب کو دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا، لیکن سوے اتفاق کہ میں اور وہ کبھی یکجا نہ ہو سکے تھے۔ ملنے کے لیے مواقع تو بہت تھے، لیکن میں ان کے حسن کے اذکار سے اس قدر مرعوب تھا کہ چاہتا تھا ایسی ملاقات ہو جس میں میر محمد علی صاحب بھی شریک ہوں تا کہ میں پہلے ہی ملنے میں ان سے بے تکلف ہو سکوں۔

اور پھر میر عبد الحی صاحب کی بلا نوشیوں کے چرچے، وہ تو چار دانگ عالم میں گونجنے سے لگتے تھے۔ جہاں بھی ان کا مذکور آتا، لوگ سب سے پہلے یہی پوچھتے، آنجناب عالم سکر میں ہیں کہ عالم صحو میں ہیں؟ ہر چند کہ یہ اصطلاحیں بخود تصوف کے عالم سے تھیں لیکن یہاں اس نہج سے بہت مناسب گئی تھیں کہ تاباں صاحب جب نشے میں نہ ہوتے تو بڑی عقل کی باتیں کرتے تھے۔ اور نشے کی جھونک میں وہ کسی کو کچھ بھی کہہ گذر سکتے تھے، الا اپنے استاد کے کہ وہ ان کے مرشد اور محبوب اور دوست، سب کچھ تھے۔ کسی کو آج تک یہ نہ معلوم ہو سکا تھا کہ تعلقات کی تاباں صاحب اور حشمت صاحب کے درمیان نوعیت کیا تھی۔ ان دنوں ایک اور شاعر ریختہ شیخ مبارک آبرو کی مثنوی آداب معشوق کے مضمون میں بہت ذکر میں آتی تھی۔ انھوں نے جو نصائح معشوق کو کئے تھے ان میں شہوت اور اختلاط باطنی تو کیا، اختلاط ظاہری بھی کے لیے کچھ جا نہ تھی۔ فرماتے ہیں ؎

پر خبر رکھنا کوئی خندہ نہ ہو	بوالہوس ناپاک دل گندہ نہ ہو
کوئی پاجی یا کوئی لچا نہ ہو	بات کہنا اس ستی بیجا نہ ہو
اب زمانے کے رجالے ہیں کچھ اور	سیکھ کر ہندوستاں زادوں کا طور
گھورتے ہیں خوبصورت کے تئیں	دل میں رکھتے ہیں کدورت کے تئیں
جس کو جانے یوں کہ دل میں پیار نہیں	اس کی جانب دیکھنا درکار نہیں

لیکن اندر کا حال کسے معلوم ہے۔ درست کہ محتسب را درون خانہ چہ کار، مگر کہنے والے کی

زبان کون پکڑ سکے ہے۔ ابھی کچھ مدت پہلے ایک شاعر ریختہ میر جعفر زٹلی نے امرد پرستی کی ہجو میں بہت شعر لکھے تھے۔ ان سے بڑھ کر یہ کہ اس زمانے کے ایک بہت ہی محترم شاعر فارسی کے تھے میرزا عبد القادر بیدل، انھوں نے امرد پرستی کے خلاف ایک ہجو لکھی ہے جو خود ہی نہایت فحش ہے۔ مجھے ان باتوں میں کچھ طوع نہ تھا۔ مجھے تو یہ جاننے کی فکر تھی کہ کیا کوئی بندۂ خدا میر محمد علی حشمت سے بھی بڑھ کر حسین ہو سکے ہے۔ میر محمد علی باوصف کہ میری ہی عمر کے تھے اور یہ عمر بڑھاپے کی نہیں تو جوانی کے زوال کی بے شک تھی، لیکن وہ مجھے بہت کمسن اور کبھی کبھی اپنی اداؤں کے بباعث الھڑ معلوم ہوتے تھے۔ پھر بھی ان کی آواز اس لوچ اور باریکی اور اونچے سروں سے خالی تھی جن سے امردوں کو متصف کیا جاتا ہے۔ ان کے جسمانی قویٰ کی قوت کا حال میں لکھ چکا ہوں۔ ان کی جرأت کا عالم یہ تھا کہ ایک بار انھوں نے بھرے میلے میں ایک بچرے ہوئے سانڈ کی سینگیں پکڑ کر اسے بالکل جامد کر دیا تھا۔ جب تک لوگ رسے اور کمندیں لے کر آئیں، کیا مجال کہ سانڈ کہیں ٹس سے مس ہو جاتا۔

عمدۃ الملک امیر خان انجام کے قتل کو ابھی چند ہی برس ہوئے تھے۔ لوگ اکثر انھیں یاد کرتے اور کہتے تھے کہ جس نے عمدۃ الملک امیر خان انجام کو نہ دیکھا ہو وہ میر محمد علی کو دیکھ لے، بس فرق تھا تو اتنا تھا کہ عمدۃ الملک چھوٹے قد کے تھے اور میر صاحب کا قد کشیدہ تھا۔ عمدۃ الملک کبھی کبھی زنانہ لباس بھی پہن لیتے اور وہ بھی ان پر بہت پھبتا تھا۔ میر محمد علی کو تحویل لباس کا کوئی شوق نہ تھا۔ عمدۃ الملک سے متوسل وہ بھی رہے تھے اور ان کے قتل کے بعد نواب قطب الدین خان کے یہاں ان کا آنا جانا ہو گیا تھا۔ یہیں ان کی ملاقات میر عبد الحی تاباں سے ہوئی۔ تاباں ان دنوں شاہ حاتم کے شاگرد تھے لیکن میر حشمت سے ملتے ہی ان کے گرویدہ اس قدر ہوئے کہ ان کے شاگرد ہو گئے اور انھیں کے ہو رہے۔

میر عبد الحی تاباں مدت سے قزلباش خان امید کی سرکار سے متوسل تھے۔ مشہور تھا کہ میر صاحب کے گھر پر ہر شام نو خیز خوش جمالوں کی محفل جمتی۔ تاباں ان میں سے چند کو قزلباش خان امید کی حویلی پر رقص و موسیقی کی مجلسوں اور شاید کچھ کو شب باشی کے لیے بھی لے جاتے۔ واللہ اعلم۔ میں نے اپنی تھوڑی سی مدت ملاقات میں ایسی کوئی بات نہ دیکھی، الا یہ کہ تاباں صاحب کا منظور نظر ایک نوخیز، سبزہ آغاز، معشوق صفت لڑکا سلیمان نامی تھا اور وہ اس کے بغیر کہیں نہ جاتے تھے۔ لیکن میر محمد علی صاحب کے یہاں جلسوں میں میاں سلیمان ہمیشہ حاضر نہ رہتے، یہ بھی میں نے

سنا۔ میر عبد الحی کا دوسرا آماجگاہ میرزا مظہر صاحب جانجاناں کا جماعت خانہ تھا۔ وہ وہاں تیسرے چوتھے البتہ حاضر ہوتے، شعر وسخن کی بات ہوتی، کچھ لطیفے اور مطایبے سنے سنائے جاتے، پان اور قہوے کا دور چلتا۔ گھڑی دو گھڑی بعد یہ انجمن اٹھ جاتی اور میرزا صاحب کے درس اور بیانات معرفت وتعلیم عرفان اور تلقین خیرات کا دور چلتا جو بعد عشا بھی جاری رہتا۔ ان مجلسوں میں صرف خاص خاص مریدین شامل ہو سکتے تھے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ ایسی صحبتیں اٹھانے والا اور ایسے شب و روز گذارنے والا سید زادہ، اور قزلباش خان امید، یا کسی اور کے یہاں امارد ولوطیان کو بار دلوانے کا وسیلہ بنا ہو۔ میں نے تو انھیں بہت ہی کم دیکھا لیکن ہمیشہ سنجیدہ اور بردبار دیکھا۔ ہاں ہنسی ٹھٹول اور لطیفہ بازی کی بات اور ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ہماری پہلی ہی ملاقات میں پہلی بات جو میں نے ان سے سنی وہ ایک لطیفہ تھا۔

جو کہ میں محمد علی صاحب کی حویلی کے بہت قریب تھا لہٰذا نماز عشا کے فوراً بعد وہاں پہنچ گیا۔ محمد علی صاحب نے مجھے کہا تھا کہ آج عشا بعد میرزا صاحب کی محفل سے اٹھ کر عبد الحی ادھر آویں گے۔ تم بھی آنا، کچھ خاص دوست اور ہوں گے، سب مل کر دھمال مچائیں گے۔ کچھ شعر خوانی بھی ہوگی۔ میاں تاباں نے ایک غزل مجھ پر لکھی ہے، اسے سنانے کے بے حد وہ مشتاق ہیں۔ میں نے دل میں کہا کہ میر عبد الحی اگر میرزا صاحب جیسے متدین بزرگ کے وہاں جائیں گے تو غالباً شراب پی کر نہ جائیں گے۔ میرا خیال صحیح نکلا۔ حشمت صاحب کے دیوان خانے میں قدم دھرتے ہی تاباں نے استاد کے ہاتھ چومے، قدم چھوئے، ان کے رخساروں کو بوسہ دیا، پھر ہاتھ باندھ کر مسکراتے ہوئے بولے:

''استاد کو معلوم ہے بندے نے شام کہاں گذاری۔ قسم ہے خواجہ شیرازی، حلق سوکھتا ہے، جان لبوں تک آئی ہے۔ للہ ساقی کوثر کا صدقہ اس سرخ وسفید ارمنی کو گلے لگالوں تو خدمت میں حضور کی ایک گرم لطیفہ گذرانوں۔''

میر محمد علی مسکرائے، ایک نوکر دائیں جانب مودب کھڑا تھا۔ آنکھ کا اشارہ پاتے ہی سدھا ہوا خدمت گار بغل کا پردہ ہٹا کر اندر گیا اور پل مارتے میں ایک تھالی میں دو لمبی پتلی گردنوں والے شیشے اور ایک تھالی جوڑ جام نقشین اور چند پیالوں میں کاجو، اخروٹ، بادام لے آیا اور پورا سامان اس نے نہایت ادب اور اہتمام سے تاباں صاحب کے سامنے ایک تپائی پر دھر دیا۔ ایک شیشے میں سرخ رنگ کا مشروب تھا، ایک میں بالکل بے رنگ۔ میں ان شرابوں سے بالکل ناواقف تھا۔ لفظ ارمنی

سے میں نے گمان گیا کہ یہ ارمنی یا پرتگالی شرابیں ہوں گی۔ تاباں اس درمیان قالین پر گاؤ تکیے کے سہارے حشمت صاحب کے زانو بزانو بیٹھ چکے تھے۔ حشمت صاحب نے فرمایا:

''اماں شیخ سلارو، گل محمد صاحب بھی تو شوق فرمائیں گے۔ ان کے لیے تو جام تم لائے نہیں۔''

''میاں، بھول ہو گئی۔ ابھی حاضر کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر شیخ سلارو نے معاً ایک جام اسی کے جوڑ کا لا کر میرے سامنے رکھ دیا۔ تاباں صاحب نے بھنڈے سے شوق کرنا شروع کر دیا تھا اور آئندہ لمحات میں دختِ رز سے ہم آغوشی کے رنگین تصور نے ابھی سے ان کی آنکھوں میں گلابی ڈورے لانے شروع کر دیے تھے۔ مجھے بھی موقع ملا کہ میں تاباں صاحب کو ٹھیک سے دیکھ سکوں۔

اگر محمد علی حشمت کا حسن مردانہ رنگ میں وجاہت اور نسائی رنگ میں نزاکت کا انتہائی نمونہ تھا تو عبدالحی تاباں کا حسن نسائی رنگ میں صباحت اور مردانہ رنگ میں نزاکت کا نمونہ تھا۔ عمران کی کوئی چونتیس یا پینتیس رہی ہوگی لیکن ان کے اوپر حسن اس طرح پھوٹا پڑتا تھا کہ کمسن لگتے تھے۔ اور جتنے وہ کمسن لگتے تھے اتنے ہی باوقار، تمکنت سے بھرپور اور رعب دار تھے کہ مجھے یقین تھا یہ شخص اگر لچوں، شہدوں، بازاری اچکوں میں تنہا بھی گھر جائے تو کوئی اس کے قریب آنے کی جرأت نہ کر سکے گا، چھو لینا تو بہت بڑی بات ہے۔ یہ سب تھا پر اپنے حسن اور جوانی پر اتراونے کا کہیں سے اشارہ تک نہ تھا۔

درست کہ کثرتِ شراب نے ان کے بشرے پر کچھ ایسی چونے جیسی خشکی سی پھیر دی تھی کہ دوسری نظر میں ان کے چہرے پر تھوڑی سی فرسودگی کا سا اثر جھلکتا ہوا لگا تھا۔ مگر کیا مجال کہ کوئی انھیں بیس چوبیس برس سے زیادہ کا سمجھ لے۔ سر پر ریشمی چیرہ، جس میں سنہری اور سبز نیلی دھاریاں پر طاؤس کا گمان پیدا کرتی تھیں۔ بہت گورا رنگ، ستواں ناک لیکن بیچ میں ذرا سی اٹھی ہوئی، بڑی بڑی روشن اور باخبر آنکھیں سبزی مائل نیلگوں، چہرے پر خط لیکن ہلکا اور سلیقے سے ترشا ہوا۔ مونچھیں باریک، بالکل خط کے برابر، لیکن ان پر ذرا سے بل کا گمان ہوتا تھا۔ کتابی چہرے پر کلے کی ہڈیاں ذرا نمایاں، لیکن مغل بادشاہوں جیسی نہیں۔ ڈھاکے کی ہلکی زرد ململ کا کرتا، اس پر انگرکھے (اب میں اس لباس کا نام جان گیا تھا) کی جگہ ٹخنوں تک پہنچی ہوئی قبا جس کے بند سب کھلے ہوئے تھے۔ قبا کا رنگ سنہرا سبز، تافتہ لیکن کچھ بنارسی پوت کی جھلک لیے ہوئے۔ فاختئی رنگ کا ریشمی مگر سادہ پائجامہ، کمر میں قرمزی ڈوپٹہ، لیکن قبا کے کھلے ہونے کی وجہ سے بہت ڈھیلا بندھا ہوا۔ گلے میں تسبیح کے دانوں کے برابر یاقوت اور زمرد کے بیضوی دانوں کا ہار، اور اس پر سے کلابتو

کے پر تلے سے شانہ و گردن میں تعبیہ کیا ہوا خنجر، کہ جسے دیکھئے تو تعجب بھی ہو اور لطف بھی آئے کہ کیا بہار آسا انداز ہے۔ دونوں ہاتھوں کی ایک ایک انگلی میں انگوٹھی اور داہنی کلائی میں آبنوسی ایک چوڑا، بالکل سادہ، جو گوری کلائی پر بہت بھلا لگ رہا تھا۔ سارے بدن میں ان کے کچھ آبداری سی تھی، جیسے پردے کے پیچھے شمعیں جلتی ہوں۔

اگر چند کہ لوگ کہتے تھے، اور خود شعرا بھی کہتے تھے کہ حسینوں کے منھ پر خط آجائے پر حسن زائل ہو جاتا ہے، چنانچہ خود حشمت صاحب کا یہ شعر بہت مشہور تھا ؎

خط نے ترا حسن سب اڑایا — یہ سبز قدم کہاں سے آیا

جو کہ خط کو سبزے سے تشبیہ دیتے ہیں اور منحوس شخص کو بد قدم بھی کہتے ہیں اور سبز قدم یا سبز پیرا بھی کہتے ہیں، پس دوسرے مصرعے کا لطف بیان سے باہر ہے۔ اور پھر قدم کی مناسبت سے آیا بھی بہت خوب ہے۔ میر عبدالحی تاباں نے بھی کہا تھا اور سبزی کی مناسبت دے کر بہت نئی بات کہی تھی ؎

وہ رنگ کہ تھا جس کی ملاحت کا نپٹ شور
اس رنگ پہ کس طرح سے سرسبز ہوا خط

یہاں بھی یہ لطف ہے کہ سانولے شخص کو سبزہ رنگ کہتے ہیں اور خط کو سبزہ کہتے ہی ہیں۔ لہٰذا خط کا سرسبز ہونا ایک نیا مضمون بن گیا ہے جو حسینوں کے خلاف بھی جاتا ہے اور موافقت میں بھی کہا جا سکتا ہے۔ یہ سب صحیح، پر حشمت اور تاباں صاحبان کے منھ پر خط اتنا بھلا لگتا تھا کہ واقعی جیسے سبزہ زار آنکھوں میں کھبا جا رہا ہو۔

میر محمد علی کی طرح میر عبدالحی نے بھی محسوس کیا کہ میں انھیں دیکھ رہا ہوں، اور جس طرح میر حشمت اپنے دیکھنے والوں سے باخبر لیکن بے پروا نظر آتے تھے، بالکل وہی انداز تاباں کا تھا۔ جب انھوں نے قرینہ سے سمجھ لیا کہ میں انھیں ٹھیک سے دیکھ چکا ہوں، تو میری طرف ہاتھ بڑھا کر بولے:

"واللہ حضت، آپ ہی ہیں مولوی گل محمد،" انھوں نے نیم قد اٹھ کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ "ہمارے حضرت بکثرت ذکر آپ کا کرتے رہتے تھے، اس قدر کہ مجھے بھی اشتیاق بیحد تھا کہ بالمواجہ آپ کو دیکھوں۔ بارے آج وہ ارمان پورا ہوا۔"

باوجود اس کے کہ میاں تاباں عمر میں مجھ سے بہت چھوٹے تھے میں نے سرو قد اٹھ

کر انھیں تعظیم دی اور مسکرا کر کہا:

''امید وار ہوں بارگاہ الٰہی میں کہ مجھ سے مایوس نہ ہوئے ہوں۔''

''مایوس، بھلا مایوس کیوں، میں نے تو آپ کو اس سے بھی بہتر پایا جیسا کہ اعلیٰ حضرت نے فرمایا تھا۔ لیجئے، شوق فرمایئے۔'' یہ کہتے ہوئے انھوں نے بھنڈے کی نے، اور ایک جام بھر کر میرے سامنے رکھا اور ایک خود اپنے لیے بھر کر غٹا غٹ چڑھا گئے۔ واللہ کمال ہے، میں نے دل میں کہا، بلانوشی ہو تو ایسی ہو۔ انھوں نے شاید میری نگاہوں سے کچھ بھانپ لیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولے:

''جی جناب من، ہمارے اعلیٰ حضرت کے دوست اور کرم فرما حضرت خواجہ ناصر عندلیب کے صاحب زادے میر درد اطال اللہ عمرہم کا ایک مطلع ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں ؎

نشہ کیا جانے وہ کہنے کو ے آشام ہے شیشہ

جہاں میں دختر رز سے عبث بد نام ہے شیشہ

کیوں مولوی صاحب، سچ کہنا۔ میر درد صاحب ابھی نام خدا جوان بلکہ کمسن ہیں کہ ناچیز سے چھوٹے عمر میں ہیں، بھلا ایسا شعر اعجاز نہیں تو اور کیا کہا جائے گا؟''

میں نے دل ہی دل میں شعر پر وجد کیا اور اس سے زیادہ اس بات پر کہ تاباں نے کس خوبصورتی سے بلانوشی کے اعتراض سے بری اپنے کو کرلیا تھا اور اس کی دلیل بھی یوں پیش کی تھی کہ خود کو انسان نہیں بلکہ شیشۂ شراب قرار دیا تھا۔ اللہ اللہ میرے زمانے میں ایسے شعر گو فارسی میں بھی نہ تھے، ہندی تو بچاری ابھی گھٹنیوں چلنا سیکھ رہی تھی۔ لیکن یہ بات میں کسی سے کہہ نہ سکتا تھا۔ میرے دل میں گھٹن ہونے لگی۔ پر یہ تو دھندا روز ہی کا تھا، کن کن امور پر اپنا کلیجا میں پانی کرتا۔

''سبحان اللہ،'' میں کہا۔ ''میر صاحب کی روشن ضمیری کی داد دوں کہ دوسرے میر صاحب یعنی خواجہ میر صاحب کے کلام بلاغت التیام پر سر دھنوں۔ واللہ مجھے تو یوں ہی سرور ہو گیا۔''

عبدالحی تاباں مسکرائے۔ اس بیچ وہ پہلا جام خالی کر کے دوسرے کو نصف حلق میں اپنے اتار چکے تھے اور میں نے دو ہی جرعے ابھی نذر دل و جگر کئے تھے۔ میر محمد علی حشمت نے میری جانب ہمت افزایانہ دیکھا، گویا کہہ رہے ہوں، مولوی صاحب اپنی چال آپ چلیں، میر عبدالحی کو اپنے حال پر چھوڑیں۔ ان کے لچھن ہی اور ہیں ان کے طور ہی دیگر ہیں۔

میں یہ پوچھنے کی ہمت کرنے والا تھا کہ خود محمد علی صاحب کے ہاتھ میں جام کیوں نہیں ہے کہ ان کے ملازم نے افیون کی پیالی اور ایک فنجان میں قہوہ، اور ایک بڑی پیالی میں چائے کشتی میں

لگا کر ان کے سامنے رکھ دی۔ حشمت صاحب نے گھولوے سے ایک چسکی لی، گرم میٹھی چائے کا ایک گھونٹ پیا اور کچھ لطف کے سے عالم میں آنکھیں بند کر کے ایک بار جھوم گئے۔ پھر جو آنکھیں انھوں نے کھولیں تو وہ کچھ اور بھی دلآویز لگ رہی تھیں۔ میں نے دیکھا تھا کہ افیونیوں کی آنکھیں چندھیائی ہوئی سی ہوتی ہیں اور افیون کے سرور کے ساتھ ساتھ ان کی چوندھ افزوں ہوتی جاتی تھی۔ مگر وہ محمد علی حشمت ہی کیا جو ہر بات میں دنیا سے نرالا نہ ہو۔

عبدالحی صاحب دوسرا جام خالی کر کے تیسرے کی تیاری کر رہے تھے کہ ملازم نے اندر آکر سکھ راج سبقت کے ورود کی خبر دی۔

''اہلاً وسہلاً۔ فوراً تشریف لے آئیں۔'' میر حشمت نے کہا۔ ''میاں سلارو، لالہ صاحب کے لیے بھی جام کا بندوبست کرو۔''

''بہت بہتر جناب،'' کہہ کر سلارو میاں باہر گئے اور فوراً ہی سبقت صاحب کو لے کر اندر آئے۔ میر حشمت نے نیم قد کھڑے ہو کر اور ہم دونوں نے سرو قد ہو کر تعظیم دی۔ سبقت صاحب جھک کر حشمت صاحب سے بغل گیر ہوئے اور ہم لوگوں سے مصافحہ کر کے اپنا داہنا ہاتھ بائیں طرف سینے پر رکھا، گویا کہہ رہے ہوں آپ کی جگہ ہمارے دل میں ہے۔

میرزا عبدالقادر بیدل کے شاگرد سکھراج سبقت کو دہلی کا بچہ بچہ جانتا تھا۔ وہ لاجواب فارسی گو اور علم مجلسی کے ماہر تھے۔ اعتماد الدولہ معین الدین خان عرف میر منو سے متوسل تھے اور ان کی شہادت کے بعد اب وہ اپنا خاندانی کام دیکھنے لگے تھے۔ ان کا یہ شعر ساری دہلی میں ضرب المثل تھا ؎

او بفکر منت و من فارغ
بندگی ہا خدائے دارد

عبدالحی تاباں صاحب سے ان کی پرانی دوستی تھی، ہر چند کہ وہ عمر میں ان سے بڑے تھے۔ یہی بات کشن چند اخلاص صاحب کے ساتھ بھی عبدالحی تاباں کی تھی کہ عمر میں بڑے ہونے کے باوجود وہ اخلاص صاحب کے زمرۂ دوستاں میں شامل تھے، چنانچہ ان کا شعر ہے ؎

سخن میں ان کے محبت کی بو ہے اے تاباں
رکھیں ہیں تب تو کشن چند جی سے ہم اخلاص

اخلاص صاحب کو گذرے ہوئے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا۔ سبھی لوگوں کے دلوں میں ان کی جگہ باقی تھی اور پھر ان کا تذکرۂ شعرا موسوم بہ گلشن ہمیشہ بہار اکثر گفتگو کا موضوع بنتا تھا۔ سکھراج سبقت نے بعد مصافحے اور معانقے کے کہا:

''اجی میاں عبد الحی، کئی دن سے دل تمھارے لیے ہوک رہا تھا۔آج ادھر سے گذارا تو ہر چند کہ ساعت بے ساعت ہوتی تھی،،جی نہ مانا کہ یہاں میر صاحب کی ملازمت کو حاضر نہ ہوں۔ اور دل سے میں نے کہا کہ تمھاری بھی خیر خبر مل جائے تو سونے پر سہاگا سمجھیو۔پس یوں ہی ہوا۔اللہ بڑا کارساز ہے۔''

''اعلیٰ حضرت کی بارگاہ کو اپنا ہی دربار سمجھئے جناب۔میں ہمیشہ یہی عرض کرتا تھا۔'' تاباں نے کہا۔''بارے آج آپ کو اللہ نے توفیق دی۔لیجئے شوق فرمایئے،''انھوں نے شراب کی صراحی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

اس بار جو شراب تھی وہ شیشے میں نہ ہو کر صراحی میں تھی۔اغلبًا وہ فرنگی نہ رہی ہو۔میرے زمانے میں فرنگی شراب اور شراب ہی کیوں،تمامی اہل فرنگ کو کوئی جانتا پوچھتا نہ تھا۔لیکن اب ان کی شرابیں اور کہیں کہیں ان کی فوجیں بھی متداول ہو رہی تھیں۔میں پرانے وقت کا سپہگری پیشہ،مجھے ان سب اعلیٰ شرابوں کے لیے کہاں ظرف تھا۔فرنگی سرخ شراب کا ایک جام جو میں چڑھا چکا تھا وہی مجھے بڑی تلخ اور سخت نشہ آور لگ رہی تھی۔خدا جانے جو لوگ انھیں پیتے تھے ان کے کام و دہن عادی ہو جاتے ہوں گے۔

سکھراج سبقت کی تشریف آوری سے مجھے ایک موقع گفتگو میں براہ راست حصہ لینے کا ملا۔میں نے تاباں کو یاد دلایا کہ وہ لطیفہ ابھی باقی ہے۔میر حشمت نے بھی کہا کہ ہاں ان کا تو دماغ سرور شراب سے گرم ہو چکا ہوگا،میر عبد الحی وہ لطیفہ تو سناؤ جو موعود تھا۔

تاباں کے چہرے پر شراب نے کچھ نئی ہی شگفتگی پیدا کر دی تھی۔گورے چہرے پر سرخی کی بہار عجب پھبن دے رہی تھی۔منھ تمتما گیا تھا اور آنکھوں میں سرور کے ڈورے اس طرح لہرا رہے تھے جیسے غروب آفتاب کے فوراً بعد شفق کے لہریئے سیاہ آسمان پر دوڑتے چلے جا رہے ہوں۔پتلے پتلے ہونٹوں سے خون سا ٹپک رہا تھا۔لیکن نہ ان کی آواز میں لرزش تھی اور نہ زبان میں کسی بھی قسم کی رکاوٹ۔بالکل پہلے ہی کی طرح تن کر بیٹھے تھے گویا ابھی ابھی آئے ہوں۔میری زبان پر بے ساختہ میرزا جلال اسیر کا مصرع آ گیا ع

شراب روغن گل شد چراغ رنگ ترا

میر محمد علی کہاں تو افیون کے ہلکے سرور میں تھے اور کہاں دفعتہً اٹھ کر بیٹھ گئے۔

''ہائے ظالم کیا مصرع پڑھا۔محفل کا سرور دوبالا بلکہ سہ بالا کر دیا۔خدا خوش رکھے۔کس کا

ہے؟'' یہ کہہ کر انھوں نے عجب شیریں لحن سے مصرع پھر دہرایا۔ میں نے پہلی بار انھیں شعر پڑھتے سنا تھا کہ کلام اپنا وہ سناتے نہ تھے۔ ان کی آواز میں ایسی جادوگرانہ لرزش تھی کہ اس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ ادھر سکھراج سبقت اور عبدالحی تاباں بھی اسی مصرعے کی کیفیت سے مغلوب تھے۔ تاباں کے چہرے پر اب بھی کسی حیا کا تاثر نہ تھا، گویا وہ ایسی توصیف کو اپنا حق فطری سمجھتے ہوں۔ خوش وہ بہت تھے، لیکن انکسار اپنے حسن کے باب میں انھیں بالکل نہ آتا تھا۔

''میرزا جلال اسیر کا مطلع ہے جناب۔'' اب میں نے پورا شعر پڑھ دیا ؎

پیالہ رنگ دگر زد رخ فرنگ ترا
شراب روغن گل شد چراغ رنگ ترا

''ہائے ہائے،'' میر محمد علی نے زانو پر ہاتھ پٹک کر کہا۔ ''سبقت صاحب ذری دیکھیو، بے چارہ ملک ہند کبھی نہ آیا لیکن ہمارے رنگ کا شعر کہتا تھا۔''

''درست فرمایا۔ یہ ہماری طرز ہے، ہماری ادا ہے۔ اہل ایران بچارے اسے کیا جانیں اور کیا سمجھیں۔'' سبقت صاحب نے کہا۔

تاباں نے بڑی بڑی روشن آنکھیں کھولیں۔ ''ہمارے خان آرزو صاحب غلط تھوڑا ہی کہتے ہیں۔ ان روزوں اہل ہند ہی اہل زبان ہیں۔''

میں ذرا مشوش ہوا کہ اب زبان اور شاعری کی باریک بحثیں چھڑ جائیں گی تو میرا کیا ہوگا۔ گذشتہ دو صدیوں میں جو ہوا تھا میں اس سے بیگانۂ محض تھا۔ جلال اسیر صاحب کا یہ شعر تو مجھے اس لیے یاد تھا کہ کل ہی پرسوں کہیں قوالی ہو رہی تھی۔ میں ذرا کی ذرا ٹھہر گیا تھا کہ سنوں کیا پڑھا جا رہا ہے۔ بس یہ شعر میرے ذہن میں چپک کر رہ گیا تھا۔ میں نے فوراً عرض کیا:

''بجا اور درست۔ مگر صاحب وہ لطیفہ...؟''

''ہاں صاحب، وہ لطیفہ تو سنوائیے میر عبدالحی۔'' میر حشمت نے فرمایا۔

''جی، عرض کرتا ہوں۔ وہ جو ایک صاحب ہیں، نئے نئے منصب دار بنے ہیں۔ پہلے ان کے یہاں پھلوں کی آڑھت ہوتی تھی...''

''بس ٹھیک ہے میر عبدالحی،'' حشمت نے کہا۔ ''ان کا نام زبان پر نہ آئے تو انسب ہے۔''

''بہت درست پیر و مرشد۔ تو ان صاحب نے سن رکھا تھا کہ عمدۃ الملک شہید جب نور بائی صاحب کے وہاں تشریف لے جاتے تو دونوں میں چوٹیں چلتی تھیں۔ اب ان بچاروں میں نہ وہ

سلیقہ، نہ وہ بذلہ سنجی، انھیں مگر شوق پیدا ہوا کہ نور بائی نہ سہی شمشاد بائی تو ہے، اور عمدۃ الملک امیر خان نہ سہی، ہم تو ہیں۔''

''چہ خوش، کہاں راجا بھوج کہاں گنگوا تیلی،'' حشمت نے کہا۔ ''خیر، تو پھر؟''

''جی، وہ تشریف لے گئے۔ شمشاد بائی نے ان کی تواضع نچلی منزل میں نہ کی، بالا خانے میں انھیں بار دی، گویا بڑا خیال کیا۔ اب اس گاؤدی احمق زماں کو دیکھئے کہ وقت رخصت کہتا ہے، بائی صاحب، بالا خانہ اپنا تو آپ نے بہت خوب دکھایا۔ لیکن وہ آپ کی نچلی منزل کہاں ہے، اس کا راستہ کہاں سے ہے؟''

''لاحول ولاقوۃ کیا بد مذاقی ہے۔'' سبقت صاحب نے کہا۔

''جی ہاں۔ تو بائی صاحب بولیں، سرکار اسی منزل سے تو ہو کر تشریف لائے ہیں۔''

بڑے زور کا قہقہہ پڑا۔ اس اثنا میں کئی لوگ اور بھی آتے گئے تھے۔ شرف الدین پیام صاحب کو تو میں پہچانتا تھا۔ اوروں میں سے کچھ کے نام سے آشنا تھا اور کچھ کو بالکل نہ جانتا تھا۔ دیر تک محفل رہی۔ میں نے دیکھا کہ بظاہر تو ان لوگوں کو شعر و شاعری اور عاشق و معشوق کے سوا کچھ کام نہ تھا، مگر درحقیقت یہ لوگ زمانے کے سرد و گرم سے آشنا اور وقت کے بدلتے ہوئے طوروں سے خوب واقف تھے۔ اس رات بھی جو باتیں اکثر ذکر میں آئیں ان میں نادر گردی تھی جسے کوئی دس بارہ برس ہو چکے تھے لیکن ان زمانوں میں دہلی پر جو بیتی تھی اسے کوئی بھلا نہ سکا تھا۔ اس وقت کی آفت اور قتل اور غارت اور تاراجی کے اذکار سے زیادہ جو بات سب لوگوں کی زبان پر تھی وہ محمد شاہ بادشاہ غازی فردوس آرام گاہ کے امرا اور عمائد اور سردارن مملکت کی آپسی رقابتیں، عداوتیں اور خود غرضیاں تھیں۔ سب کو اس بات کا رنج تھا کہ دلی کی شان اور رونق بھلے ہی واپس آگئی ہو لیکن حکومت اب اس طرح کی اور اس نہج پر نہ ہوگی جب تک بادشاہ اور اس کے امرا مل کر سر جوڑ کر نہ بیٹھیں اور اتحاد کو قائم رکھیں۔ دہلی اب مرکز عالم نہ رہے گا اگر یہی لیل و نہار رہے۔

محفل ختم ہونے کو تھی، کچھ لوگ اٹھنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ تاباں نے کہا:

''پیر و مرشد، ایک بات تو رہی جاتی ہے۔ وہ جو غزل میں آپ کی مدح میں لکھی تھی...''

محمد علی حشمت مسکرائے۔ ''میں امید کر رہا تھا کہ تم وہ بات بھول گئے ہو گے۔ چلو خیر سناؤ۔ حضرات سماعت فرمائیں، میاں تاباں نے مجھ ہیچمداں کے ذکر میں کچھ شعر کہے ہیں۔''

سب لوگ پھر سے متوجہ ہو گئے۔ تاباں دو زانو بیٹھ گئے اور انھوں نے غزل شروع کی۔

ہوا ہوں اس جہاں میں دل سے تیرا آشنا حشمت
کروں میں دولت دنیا کے تیں اب لے کے کیا حشمت
جو تیرا آشنا ہو اس کو سیم وزر سے کیا حاجت
میں تیرے ربط کے تیں جانتا ہوں کیمیا حشمت
نہ ہوں محتاج دنیا میں کسی شاہ و گدا کا میں
رہے لطف و کرم ایسا ہی گر مجھ پر ترا حشمت
تری باتوں میں اپنا دردِ غم سب بھول جاتا ہوں
کروں کس طرح تجھ کو آپ سے اک دم جدا حشمت
ہے سب کو آرزو ظلِ ہما کی مجھ کو کیا پروا
قیامت تک رہے سر پر مرے سایہ ترا حشمت
سخن کے بحر میں آ کے مری کشتی تباہی تھی
کنارے آ لگی جب سے ہوا تو نا خدا حشمت
پرستش کیوں نہ دنیا میں کریں ہم اس کی اے تاباں
ہمارا قبلہ حشمت دین حشمت رہنما حشمت

سایہ ترا حشمت والا شعر بہت پسند کیا گیا اور بار بار پڑھوایا گیا۔ اس میں یہ بھی کنایہ تھا کہ اگر حشمت کا سایہ مجھ پر تا قیامت رہے گا تو میں بھی تا قیامت رہوں گا۔ کسی کو کیا خبر تھی کہ قیامت بہت دور اور موت بہت نزدیک تھی اور یہ سارا پکھنا دم کے دم میں اٹھ جاوے گا۔ مجھے یہ بات اس غزل میں بہت لحاظ کے لائق لگی کہ کسی بھی شعر، بلکہ کسی بھی لفظ سے عشق اور ہوس اور معشوقی کی خفیف ترین بو بھی نہ تھی۔

محفل اٹھی تو میں بھی کوچہ چیلاں اپنے گھر کو چلا، سکھراج سبقت صاحب بھی میرے ساتھ چلے کہ ان کا ڈیرہ حوض قاضی میں معین الملک کی حویلی کے پاس ہی تھا۔ راستے میں وہ بار بار جلال اسیر کا مطلع پڑھتے اور داد دیتے رہے۔

چند مہینے یوں ہی گذرے۔ تاباں، حشمت، اور دوسرے کئی شعرا سے بھی ملنا ملانا ہوتا رہا۔ ایک آدھ بار میں نے میرزا رفیع، شاہ حاتم اور صرف ایک بار میاں میر تقی میر کو دیکھا اور سنا۔ شعر

گوئی مجھ سے پھر بھی ہمیشہ کی طرح روٹھی ہی رہی، ہاں دہلی کی شعر سے معطر اور تر فضا میں مجھے شعر شناسی البتہ آ گئی۔ مزید علیہ، خود کو دہلی کے گلی کوچوں سے آشنا کرنے اور یہاں اپنا دل پوری طرح لگانے کے سب جتن میں نے کیے۔ اور اس میں مجھے یک گونہ کامیابی ہونے لگی تھی کہ ایک بات ایسی ہوئی جس نے مجھے یقین دلا دیا کہ اس دنیا میں انصاف نہیں ہے اور میرے مقدر میں یوں ہی محروم رہنا اور تنہا بھٹکنا لکھا ہے۔ کبھی کبھی جی میں آتی، شادی کرلوں۔ گھر بسالوں گا تو زندگی میں اور ذہنی حالت میں اعتدال آئے گا۔ لیکن دوسری شادی کے خیال سے وحشت اور آشفتگی پیدا ہوتی تھی۔ جیسے میں اپنی بیاہی بی بی کو چھوڑ کر اس پر سوت لا رہا ہوں۔ ہر چند کہ دو سے زیادہ صدیوں کے بعد میری بی بی کیا میرا خاندان بھی شاید کہیں نہ ہوگا، مگر پھر بھی یہ مجھے بڑی بے وفائی لگتی تھی۔

پایان کار میں نے خود کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ ننگل خورد کسی کو بھیج کر معلوم کراؤں کہ وہاں میرے لوگ کوئی ہیں کہ نہیں اور ہیں تو کس حال میں ہیں۔ کئی دن انتظار کیا۔ راتوں کو برے خواب دیکھتا اور دن کو سب کی سلامتی دعا کرتا۔ میں اس قدر وارفتہ ہو رہا تھا کہ یہ بھی نہ سمجھا کہ اب ڈھائی صدی بعد میں کس کی سلامتی کے لیے دست بدعا ہو سکوں گا۔ بالآخر میرا ہرکارہ واپس آیا۔

میر گھر تو کیا، وہاں میرا گاؤں بھی اب نہ تھا۔ بہت پوچھ گچھ کے بعد پتہ لگا کہ بہت دن پہلے، کوئی ہزروں برس پہلے، ننگل ندی، جس کے کنارے میرا گاؤں آباد تھا، بری طرح چڑھ آئی تھی۔ اسی زمانے میں جمنا میں بھی زبردست باڑھ آئی اور جمنا کا بہت سارا پانی نہر کے بند توڑ کر نہر کو ہڑپ کر کے چاروں جانب پھیل گیا۔ اس دو طرفہ یلغار نے میرے گاؤں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر نیست و نابود کر دیا۔ اب وہاں کچھ ویران زمینیں ہیں اور زیادہ تر جنگل ہیں۔

ہزاروں برس؟ ہزاروں نہیں، صدیوں برس تو ہو ہی گئے تھے۔ کیا عجب میرے دوسری بار دہلی جانے کے فوراً بعد یہ قیامت ٹوٹی ہو۔ لیکن مجھ پر تو آج ٹوٹ رہی تھی۔

میں کئی دن گھر سے باہر نہ نکلا۔ اکثر راتوں کو چراغ بھی نہ جلنے دیتا، ماما کے گھر چلے جانے کے بعد چراغ بجھا کر کھانا کھائے بغیر منھ لپیٹ کر پڑ جاتا۔ صبح کو ماما کے آنے سے پہلے زیادہ تر کھانا محلے کے کتوں، آوارہ گایوں، سانڈوں، بلیوں کو جلد جلد کھلا کر پھر آ کر پڑ رہتا۔ ماما آتی تو یوں آنکھیں ملتا ہوا اٹھتا گویا ابھی آنکھ کھلی ہو۔

مانا کہ یہ سب بے فائدہ، بے مزہ، بے صرفہ تھا۔ یہ بات تو مجھے شروع ہی سے معلوم تھی کہ میرا کوئی نہیں ہے، گھر بھی نہیں ہے، اقارب بھی نہیں ہیں، سنگی ساتھی بھی نہیں ہیں۔ میں در حقیقت

ایک جنات ہوں جو انسان کی جون میں زبردستی ڈال دیا گیا ہوں۔ لیکن پھر بھی میرے دل میں امید کا ایک تار سا معلق تھا کہ شاید...

اس شاید کی جھونک ایسی تھی جو مجھے امید کے پالنے میں جھلائے جاتی تھی۔ چلو میری بی بی بٹی بیٹا وہاں نہ ہوں گے، ان کے اعقاب تو ہوں گے۔ سگے نہ ہوں گے رشتے کے تو ہوں گے۔ کچھ نہ ہوگا تو میرا گاؤں تو ہوگا۔ کوئی تو میری زمینوں کی کاشت کر رہا ہوگا۔ میرا پرانا باغ سوکھ گیا ہوگا، دیمک کھا گئے ہوں گے لیکن اس کی جگہ نیا باغ تو کسی نے لگالیا ہوگا۔ اس میں پپیہے اور کوئلیں تو کوکتی ہوں گی۔ اس پر بارش کی پہلی پھوار سے گرد آلود آم کے پھلوں کا منھ تو اب بھی دھل جاتا ہوگا؟

لیکن عینی شاہد اور عقلی شاہد سب میرے خلاف تھے۔ تو اب میں جی کر کیا کروں گا؟ خودکشی بھی تو کوئی بات ہے۔ میر محمد علی اور میر عبدالحی میرے لیے گور و کفن تو مہیا کر ہی دیں گے۔ مگر خودکشی تو حرام ہے۔ میری دادی کہتی تھیں خودکشی کرنے والا بدروح بن جاتا ہے...تو میں کیا کسی بدروح سے کم ہوں...؟

کئی دن اور گذرے۔ اب میری ماما کو بھی شک ہونے لگا تھا کہ شاید میاں کے حواس بجا نہیں ہیں۔ مجھ سے تو اس نے کچھ نہ کہا مگر محلے والوں تک دبی زبان سے بات پہنچا دی۔ دلی والوں کو تو ایک تماشا درکار ہے، چاہے وہ گھر ہی پھونک کیوں نہ ہو۔ جہاندیدہ لوگوں نے قیاس کیا کہ میرا دل کہیں آیا ہوا ہے۔ ایک آدھ بار انھوں نے کٹنیاں بھیجیں کہ جاؤ کیفیت معلوم کرو اور پرانے سلسلے کو دوبارہ باندھو اور وہ ممکن نہ ہو تو نیا سلسلہ جنباں کرو۔ لیکن میں نے انھیں کچھ انعام دے کر رخصت کیا۔ قصہ یہ بتایا کہ مجھے خبر ملی ہے کہ گھر پر میرے لوگ بے حد مقروض ہو گئے ہیں۔ میں اسی ادھیڑ بن میں رہتا ہوں کہ تدارک کیا اس کا کروں۔ کئی جگہ سے مجھے کچھ قرض ملنے کی امید ہے لیکن سود بہت زیادہ ہے اور واپسی جلد ہونی ہے۔ بس انھیں فکروں میں دن رات کا جینا حرام ہو گیا ہے۔

وہ کٹنیاں ہزار بلائے بے درماں سہی لیکن جہاں دیدہ، ہزاروں دروازے دیکھے ہوئے اور بیسیوں کنوؤں کا پانی پئے ہوئے تھیں، سمجھ گئیں کہ ان تلوں میں تیل نہیں اور یہ معاملہ نہ زن کا ہے نہ زر کا، یہ تو کچھ جناتی کارخانے ہیں۔ پھر سب نے میرا پیچھا چھوڑ دیا۔

لیکن کٹنیوں کے دفان ہونے کے دو ہی چار دن بعد محمد علی حشمت کا ہرکارہ آیا کہ فوری معاملہ ہے، بستر باندھو اور میرے ہاں پہنچو۔ مجھے تھوڑا سا تعجب تو ہوا لیکن ایک امید سی بھی ہوئی کہ شاید یہاں کچھ بہتری کا آثار ہو۔ یوں کچھ نہ ہو لیکن تبدیل حال میں ایک امید تو ہوتی ہے۔ میں نے بستر باندھا، گھر

کی کلید پاس کی مسجد کے امام صاحب کے حوالے کی، ماما کو کہا کہ نیک بخت تو میری راہ دیکھ لیجو میں چند دن میں واپس آجاؤں گا۔ دو چار گھڑی کے بعد میں میر حشمت صاحب کی حویلی پر حاضر تھا۔

میں پُر امید تھا تو دل میں ڈرا بھی ہوا تھا۔ میرے زمانے سے اب تک طریق جنگ اور اسلحہ سب بہت بدل چکا تھا۔ یہاں گولہ، بارود، بندوق، توپ سے جنگ ہوتی تھی اور ہمارے لوگوں کو بندوق کی ہوا بھی نہ لگی تھی۔ ہم نے بارود کی بو بھی نہ سونگھی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ میرے خداوند عالم سلطان ابرہیم لودی شہید کی افواج کو مکمل ہزیمت چند ہی ساعتوں میں اس سبب سے ہو گئی تھی کہ ان کے ہاتھی گولہ بارود کا سامنا نہ کر سکے تھے اور فوج میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ میں نے جب یہ سامان یہاں دیکھے تو بہت متوحش ہوا تھا کہ ان چیزوں کو میں کیا سنبھال پاؤں گا۔ بہت کچھ مشق کر کے اب میں تھوڑا بہت عادی سلاح آتش کا تو ہو گیا تھا لیکن معرکے کی گرمی میں کہاں تک میں بندوق یا توپ کا ساتھ دے سکوں گا، یہ تو وقت ہی بتائے گا۔

''خوب آئے میاں صاحب،'' انھوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ مراد آباد کے لیے رخت سفر باندھ لو، ابھی اور اسی وقت چل دیجئے۔ میں اور بقیہ رسالہ بھی ساتھ ہوگا۔''

میرا دل دھڑکا۔ یہ تو کچھ فوجی کارروائی جیسا رنگ لگتا تھا۔ ''بہت مناسب۔ میں حاضر ہوں، پر معاملہ کیا ہے؟''

میر حشمت کے مفصل اظہار کا ماحصل یہ تھا کہ روہیلہ نواب علی محمد خان کی اچانک موت کے بعد علاقہ رُوہیل کھنڈ میں بد امنی کا خدشہ پھیل گیا تھا۔ علی محمد خان کے دونوں بڑے بیٹے عبداللہ خان اور فیض اللہ خان قندہار میں جلاوطن تھے۔ تیسرا بیٹا سعد اللہ خان کم عمر تھا۔ کسی بنا پر نواب قطب الدین علی خان، فوجدار مراد آباد کو گمان تھا کہ جب تک بڑے بھائیوں کی جلاوطنی کی منسوخی کا فرمان قلعۂ معلیٰ سے نہ صادر ہو، خطۂ روہیل کھنڈ میں عملداری براہ راست شاہ جمجاہ کی رہے گی۔ اور سعد اللہ خان کو دہلی بلا کر زیر نگین دارالخلافت رکھا جائے گا۔ جہاں تک میر محمد علی کو معلوم تھا، ان مضامین کو محتوی کوئی فرمان قضا شیم بارگاہ بادشاہ جمجاہ سے جاری نہ ہوا تھا لیکن خیال تھا کہ نواب قطب الدین خان نے مہابلی کو حالات سے آگاہ رکھا ہوگا۔ بہر طور، روہیلوں کو یہ گوارا نہ تھا کہ نوعمر نواب زادہ اپنے وطن اور اپنے لوگوں سے جدا کر دیا جائے اور پورے خطے پر شاہی اہلکار قابض ہو جائیں۔ فلہٰذا وہ بڑی جمعیت اکٹھا کر کے سعد اللہ خان کا تحفظ اور اس کو ہر قیمت پر اپنے ہی پاس رکھنا چاہتے تھے۔

ان حالات کے پیش نظر فوجدار مراد آباد نے حکم دیا کہ رسالۂ فوجداری کے سب سپاہی بفور

مراد آباد پہنچ مقابلہ روہیلوں کا کریں اور ان کو عتاب شاہی اور خفگی جناب عالم پناہی کا مزہ چشید کرائیں۔فوجدار بنفس نفیس مراد آباد پہنچ چکے تھے۔پس ہم لوگوں کو بھی وہیں پہنچ جانا چاہیئے۔

شام ہوتے ہوتے رسالے کی جمعیت پانچ سو کے قریب ہو گئی تھی۔دوسری صبح ہم عازم مراد آباد ہوئے اور دھاوے کے طور پر سفر کرتے ہوئے چوتھے دن وہاں وارد ہوئے تو معلوم ہوا کہ یہاں سے کئی کوس پر دھام پور کوئی مقام ہے،نواب قطب الدین خان وہاں فروکش ہیں۔روہیلوں کا بھی مجمع وہیں قریب میں ہے۔نواب منتظر ہمارے ہیں کہ ہم پہنچیں تو معرکہ گرم ہو۔

کمریں کھولے بغیر ہم نے دھاوے کے طور پر دھام پور کا رخ کیا۔فوجدار صاحب دھام پور سے دو کوس ادھر ایک اجاڑسی گڑھی میں خیمہ زن تھے۔ان کے جاسوسوں نے خبر دی تھی کہ روہیلے کنار دریاے رام گنگا مجتمع اور جیش شاہی سے محاربے کے منتظر ہیں۔نواب نے پوری فوج کے ساتھ قلعے سے باہر نکل کر ایک مناسب عرصۂ مصاف دیکھ کر قیام کیا اور ایک ٹکڑی مقدمۃ الجیش کے طور پر آگے روانہ کی۔نواب نے اپنی فوج کی پشت پر گھنے خار دار جنگل کا وسیع قطعہ رکھا تھا،اس خیال سے کہ اگر بالفرض محال پیچھے ہٹنا پڑا تو ہم جنگل میں چھپ جائیں گے۔وہاں غنیم کا داخلہ محال ہوگا کیونکہ جب وہ جنگل میں داخل ہوگا تو ہمیں اس کی نقل و حرکت کی خبر از خود مل جائے گی اور ہم اسے گولیوں کی باڑھ پر رکھ لیں گے۔

فوجداری جمعیت میں بڑی یا چھوٹی توپیں نہ تھیں،حتیٰ کہ دمامۂ شتری اور فیلی تو کیا شتر نال بھی نہ تھے۔نواب قطب الدین خاں صاحب کا خیال تھا کہ مٹھی بھر تو روہیلے ہوں گے،ہزار دو ہزار بھی ہوئے تو ہم انھیں جنگ دو بدو میں مار لیں گے۔توپ کے لیے میدان درکار ہے،ہمیں ان کی ضرورت کچھ نہ ہوگی۔

نواب کی تجویز بظاہر صائب تھی۔لیکن ان کے مخبروں نے ان کے ساتھ دغا کی تھی۔روہیلوں کا ایک بڑا جتھا اس جنگل میں پہلے ہی سے موجود تھا۔ایک طرف دریاے رام گنگا،دوسری طرف دھام پور کا قصبہ،پیچھے خارستان۔فوجدار کے مقدمۃ الجیش سے کچھ تو بے خبری میں وہیں مار دیے گئے۔کچھ بچے کھچے جو تھے وہ حواس باختہ یہ خبر لے کر آئے کہ ہم ہر طرف سے گھر گئے ہیں۔روہیلے کم سے کم دس ہزار ہیں اور ہر طرف،حتیٰ کہ دریا کے ورلی طرف بھی ہیں۔

ابھی ان کا اظہار تمام نہ ہوا تھا کہ روہیلوں کے رسالوں نے ہم پر گولہ باری شروع کردی،ہر چند کہ وہ ابھی کچھ دور تھے۔پاس آتے ہی آتے انھوں نے گولیاں چلانی شروع کردیں۔

کوئی دس ہزار رہے ہوں گے۔نواب نے جم غفیر دیکھ کر جنگل کو مراجعت کا حکم دیا۔لیکن وہاں تو کوئی بیشہ،کوئی جھاڑی،کوئی جھنڈی ایسی نہ تھی جس کے پیچھے روہیلے مسلح اور مکمل جے ہوئے نہ ہوں۔

قطب الدین علی خان بڑی بے جگری سے لڑے۔ان سے بڑھ کر محمد علی حشمت کی جگر داری تھی۔لگتا تھا انھوں نے ملک الموت سے کہہ رکھا تھا کہ میرے کنے نہ آنا۔میں ان کے ساتھ تھا لیکن نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والا معاملہ تھا۔سردیوں کے دن تھے،کنار دریا اور جنگل کے متصل ہونے کی وجہ سے سردی اور بھی کڑاکے کی پڑ رہی تھی۔ہم لوگوں کا خون بہنے بھی نہ پاتا تھا کہ وہیں جم رہتا۔زوال کے پہلے پہلے ہم سب مار لیے گئے۔کوئی متنفس زندہ نہ بچا۔

جیسے زلزلے کے جھٹکے نے میرا پلنگ زور سے ہلا دیا ہو،میں ہڑبڑا کر اٹھا اور پلنگ سے گرتے گرتے بچا۔

''کیا کہا؟سب مار لیے گئے؟کوئی بھی نہ بچا؟''

''نہیں جناب۔کوئی بھی نہیں۔''اس نے پست اور افسردہ آواز میں کہا۔

''تو کیا...تو کیا تم مردہ ہو؟''

''یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا جناب۔شاید آپ یہ معاملہ بہتر طے کر سکتے ہیں۔''

افسردہ آواز اور بھی دھیمی پڑتی جا رہی تھی۔پھر جیسے بولنے والا دور ہوتا جا رہا ہو۔پھر شہنائی پر بھیروی کی نفیر دھیرے دھیرے اٹھی۔وہ بھی دور ہوتی چلی گئی۔

عبدالحی تاباں نے جب محمد علی حشمت کی سناونی سنی تو دستار اتار کر پھینک دی اور گریباں چاک ہو کر محمد علی حشمت کا شعر پڑھا ؎

جب آ خزاں چمن میں ہوئی آشنائے گل
تب عندلیب رو کے پکاری کہ ہائے گل

اس دن سے عبدالحی تاباں جامۂ آبی پہن کر گوشہ نشین ہو گئے۔ساری محفل آرائیاں چھوڑ دیں،حتیٰ کہ میرزا مظہر جانجاناں صاحب کے یہاں بھی جانا چھوڑ دیا۔انھوں نے بلوا بھی بھیجا لیکن انھوں نے کہلا دیا کہ میرزا صاحب کی خدمت میں ہاتھ جوڑ کر کہہ دیجو کہ تاباں اب وہاں نہیں ہے۔

پھر انھوں نے شراب چھوڑ دی۔ہر چند کہ اطبا نے سختی سے منع کیا،کہا کہ شراب تمھارے

رگ و ریشے میں بجائے لہو جاری ہے۔شراب تمھارے لیے اخلاط میں سے ایک خلط بن گئی ہے تمھارے مزاج میں جاگزیں ہوگئی ہے۔شراب چھٹے گی تو مر جاؤ گے۔لیکن تاباں نے ایک نہ سنی۔ انھوں نے بس یہی کہا کہ میں نے توبہ کر لی ہے۔اب دوبارہ پینے لگوں تو خدا کو کیا منھ دکھاؤں گا۔ میر حشمت کو کیا منھ دکھاؤں گا۔

شراب چھوڑتے ہی تاباں نے تمام دوستوں کو رقعے لکھے کہ اب میرا وقت آخر ہے۔آ کر منھ دکھا جاؤ۔ میرا منھ بھی دیکھ لو۔کوئی تقصیر مجھ سے ہوئی ہو تو معاف کر دو کہ میں جس طرح ہلکا آیا تھا اسی طرح ہلکا جاؤں۔لوگ ہر روز آتے رہے، کچھ تو ان کا منھ دیکھ کر رو پڑتے اور فوراً واپس چلے جاتے۔کچھ وہیں ان کی طرح پلنگ کی پٹی پکڑ کر بیٹھ جاتے لطیفوں اور مطائبوں سے ان کا دل بہلاتے۔

دوستوں کو مراسلے بھیجنے کے آٹھویں دن میر عبدالحی تاباں نے دنیا سے منھ موڑ لیا ؎

داغ ہے تاباں علیہ الرحمہ کا چھاتی پہ میر
ہو نجات اس کو بچارا ہم سے بھی تھا آشنا

☆☆☆

عرض مصنف:

قطب الدین خان اوران کے ساتھ محمد علی حشمت اور ان کے سارے فوجیوں کی موت کا واقعہ دھام پور(اب ضلع بجنور) کے پاس جنوری ۱۷۴۹ میں پیش آیا. روہیلوں میں سے کتنے مرے،یہ نہیں معلوم،لیکن قطب الدین خان کی فوج کا کوئی شخص نہ بچا.

عبد الحی تاباں کی صحیح تاریخ وفات نہیں معلوم ،لیکن وہ محمد علی حشمت کے بعد بہت دن نہ جئے اغلب ہے کہ ان کا انتقال ۱۷۴۹ ہی میں ہوا.اس وقت ان کی عمر پینتیس (۳۵)سال کی تھی.

مولانا حامد حسن قادریؒ اپنے رسالے ''کنز الکرامات'' (ص۸تا۱۰) میں لکھتے ہیں:

قبض زماں کا ایک واقعہ شاہ عبد العزیز صاحبؒ محدث دہلوی نے لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کے لیے طویل زمانے کو مختصر کر دیتا ہے جب کہ وہ دوسروں کے لیے طویل ہی رہتا ہے.شاہ صاحب

فرماتے ہیں کہ دہلی میں ایک سپاہی تھا۔اس کے اہل و عیال جیپور کی طرف کسی گائوں میں تھے۔وہ اپنی لڑکی کی شادی کے لیے رخصت اور روپئے کا بندوبست کر کے اپنے وطن کو روانہ ہوا۔راستے میں ڈاکوئوں نے لوٹ لیا۔خالی ہاتھ جے پور شہر میں پہنچا،لوگوں سے حال بیان کیا تو کسی نے کہا کہ یہاں فلاں طوائف بہت سخی اور فیاض ہے۔محتاجوں،مسافروں کی مدد کرتی ہے۔سپاہی اس کے پاس گیا اور اس سے تین سو روپئے قرض لیے کہ وطن سے واپسی میں قرض ادا کردوں گا۔روپیہ لے کر وطن گیا،لڑکی کا نکاح کیا۔کئی مہینے رہ کر واپس چلا تو پہلے جیپور آیا۔معلوم ہوا،اس طوائف کا انتقال ہو گیا اور کوئی والی وارث نہیں۔بہت افسوس کیا کہ اس کا قرض گردن پر رہ گیا۔پھر سوچا کہ اس کی قبر پر فاتحہ پڑھتا چلوں۔دریافت کر کے قبر پر گیا۔دیکھا کہ قبر شق ہے۔اندر جھانکا تو کچھ روشنی اور دروازہ سا معلوم ہوا۔یہ دروازے میں داخل ہوا تو بڑا میدان اور باغ نظر آیا۔اس میں ایک محل بنا ہواتھا۔یہ محل کے اندر چلا گیا۔دیکھا کہ ایک تخت پر وہی طوائف عمدہ لباس میں بیٹھی ہے۔سپاہی دوڑ کر اس کے پاس گیا اور روپئے کی تھیلی اس کے سامنے رکھ دی کہ لو اپنے روپئے۔شکر ہے تمھارے قرضے سے سبک دوشی ہوئی۔طوائف اس کو دیکھتے ہی گھبر اکر بولی کہ تو یہاں کیونکر چلا آیا؟فوراً نکل جا،یہ تیرے آنے کی جگہ نہیں ہے۔اور سپاہی کو دھکے دیتے ہوئے زبردستی محل سے باہر کردیا۔سپاہی بڑ احیران ہوا،لیکن سوچا اب تو آہی گیا ہوں،لائو باغ کی سیر تو کرتا چلوں۔کچھ دیر سیر کر کے دروازے سے ہو کر قبر سے باہر نکل آیا۔اس کا بیان ہے کہ بہت سے بہت تین گھنٹے اس میں صرف ہوئے ہوں گے۔اب باہر نکلا تودیکھا کہ سارا عالم بدلا ہو ا ہے۔شہر،بازار،سڑکیں، آدمی،سب نئے سے ہیں۔لوگوں سے پوچھا کہ دہلی میں کون بادشاہ ہے؟معلوم ہوا مغلیہ سلطنت کا زمانہ ہے۔شاہ عالم بادشاہ ہے۔اور سپاہی لودھی سلطنت کے زمانے میں دہلی میں نوکر تھا، اور وہاں سے اس نے یہ سفر کیا تھا۔تین سو سال کا عرصہ گذر گیا۔سپاہی کے تین گھنٹے دوسروں کی تین صدیوں کے برابر ہو گئے۔

الٰہ آباد، ۲۸ اپریل ۲۰۱۱

حسن منظر

پُرسا

خاتون خبر لانے والے سے بس اتنا پتہ چلا سکی کہ فیروزہ کا سسر چل بسا ہے۔ یعنی اس کا سمدھی۔ کب؟ پیر کے دن۔ اور آج کون دن تھا؟ بدھ کا، بلکہ بدھ کی شام۔ لیکن کب سے بیمار تھا یا اچانک یہ حادثہ ہوا؟ یہ سب خبر لانے والا نہیں بتا سکا۔

تھی پریشانی کی بات جانا بھی ضروری تھا۔ سمدھیانے کا معاملہ تھا اور فیروزہ کی ساس وہ عورت تھی کہ ذرا سی بات کو بیر بنا کر دل میں پالتی تھی۔ سو کام چھوڑ کر اگر کل پہنچ بھی جائے تو وہ چوتھا دن ہوگا۔ 'بس اللہ ہی رحم کرے۔'

وہاں سے کوئی سمدھی کی بیماری کی اطلاع نہ دے پایا یہ بات سمجھ میں آتی تھی لیکن مرنے پر تار بھی نہ بھیجنا اس کا مطلب خاتون ایک ہی لے سکتی تھی: اب کئیز سال سے پہلے فیروزہ کو ہفتے بھر کے لیے بھی میکے نہیں بھیجتی ہے، میں اگر اس موقعے پر نہ گئی تو ہوسکتا ہے عمر بھر کے لیے بہو کو روک لے کہ جب تیری ماں مرنے جینے میں شریک نہیں ہے تو تیرا وہاں جانے کا کیا کام!

دونوں میں خط پتر کا سلوک سدا سے نہیں تھا اور فیروزہ ماں سے کہہ چکی تھی، تم بھی خط مت بھیجا کرو۔ پڑھوا کر سننا تو دور رہا اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی ہے۔ بچے پاس آکر اگر پوچھنا چاہیں کہ نانی کیسی ہیں تو انہیں ڈانٹ کر پاس بٹھا لیتی ہے کہ 'کوئی ضرورت نہیں ہے حال پوچھنے کی۔ بس میرا حال صبح شام پوچھو۔ دنیا میں تمہاری بس ایک میں ہوں۔' دادا اس پر ہنس پڑتا ہے: 'ہاں میں بھی نہیں ہوں۔' پھر میں منتیں کروں، ہاتھ جوڑوں کہ خط انہوں نے بھیجا اس میں میرا قصور نہیں ہے۔ ماما تو ہے جو ایسا کراتی ہے۔ اس پر وہ جلبلا کر کہتی ہے: ہاں بس اُس میں ماما ہے۔ ہمارے تو بچے ہیں ہی نہیں، اب میں کیا کہوں تمہاری دونوں بیٹیاں شہر کی شہر میں بیٹھی ہیں۔ نہ تم ان

کے لیے بڑکتی ہو، نہ وہ تمہارے لیے۔ میرا معاملہ بیٹی کی ماں سے دوری کا ہے۔'

خاتون روتے ہوئے یہ باتیں کئی دفعہ سن چکی تھی اور یہ بھی کہ 'خط نہ آنے کا مطلب سدا برا ہی نہیں ہوتا ہے میا میری۔ سمجھ لیا کر بیٹی ٹھیک ہوگی اور تیرے نواسا نواسی بھی۔'

اس پر خاتون نے پہلی بار کہا تھا 'قصور میرا ہے کیوں تجھے پردیس بیاہا۔'

اور اس موقعے پر فیروزہ نے چھیڑ خانی سے کہا تھا: 'اور کیوں بیٹے کو کلکتے روزی کمانے کے لیے جانے دیا۔ اُسے بلالو۔'

'اور کولیے سے لگا کر کہوں: بیٹا گھر بیٹھا رہ، مانگ تانگ کے گزارہ کرلیں گے۔'

'اور کیا، بیاہ کر تمہارے لیے بہو لائے گا۔'

'اور میں کھٹیا پر بیٹھی اسے کام کرتے دیکھا کروں گی، پیسہ اللہ چھپر سے برسائے گا۔'

چند دن کے لیے جب فیروزہ سسرے کے گھر سے پیہر آتی تھی ماں بیٹی میں بس اتنی چھیڑ چھاڑ ہوجاتی تھی اور دونوں گھڑی بھر کو ہنس لیتی تھیں ورنہ میکے میں آدھے پیٹ پر سونے کے سوا کیا تھا! ساس کے کرگھے پر گاڑھے کی دو چار لائنیں بُن لیں، محلے کی عورتوں کا ملے تو کوئی کام کردینا، چٹیلے، کمر بند بُن دیے، موسم میں جو بلائے اس کے گھر جاکر آم سروتے سے کاٹ دیے، اچار ڈال دیا۔ یا جاڑوں میں تل کے لڈو اور پنڈلیاں کسی نے بنوائیں تو بنا دیں۔ اس سب سے کبھی ایک وقت کا پکا یا دو وقت کو ہوجاتا تھا، کبھی نہیں۔

ٹرین میں بیٹھے ہوئے ان میں سے ایک بھی بات خاتون کے ذہن میں نہیں تھی۔ وہ سوچ رہی تھی تو اتنا کیسی تعجب کی بات ہے میرے ساتھ کی کھیلی ہوئی ہے اور مجھ پر یہ ظلم کر رہی ہے، اور مجھ سے بڑھ کر میری بیٹی پر جو شادی سے پہلے اُسے خالہ کہتی تھی اور خود اسی نے فیروزہ کا رشتہ مانگا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی بیٹیوں کی شادی کے بعد اُسے میری بیٹی میں گھر کا کام کرنے والی چاہیے تھی۔'

وہ بات اس کے دماغ کے کسی پچھلے حصے میں چھپی تھی کہ فیروزہ کو بہو بنا کر لے جانے کے سال بھر ہی کے اندر وہ کئی ایک سے کہہ چکی تھی کہ ایسے بھک منگے گھرانے کی لڑکی لاکر میں نے اپنے بیٹے پر ظلم کیا ہے۔ اُسے تو کئی امیر گھرانے والے اپنی لڑکی دینے کو تیار تھے۔

وہ زمانہ بڑی تنگی کا تھا۔ خاتون کا شوہر بے وقت دنیا سے رخصت ہوا تھا۔ شادی کے بس تیرہ چودہ سال بعد یہ وہ جانتی تھی اگر دس بیس سال اور جی جاتا تو بھی بیوی بچوں اور ماں کے لیے اتنی رقم نہ چھوڑ جاتا کہ وہ باقی عمر گھر بیٹھ کر کھائیں، اتنی بھی نہیں کہ لڑکا بڑا ہولے تو گھر سنبھال لے

گا۔ وہ گیا، ساس کھیس بُن لیتی تھی کر گھے پر تو چار پیسے مل جاتے تھے۔ وہ بھی سال بھر ہی میں چل بسی۔ کنیز نے کہا 'فیروزہ کو مجھے دے دو تمہارا خرچہ کم ہوجائے گا'۔

'بات تو مجھے بہت بُری لگی تھی، بھلا یہ بھی کوئی طریقہ تھا لڑکی کا ہاتھ مانگنے کا! مگر کیا کرتی۔ گھر کا خرچہ میرے سامنے تھا اور یہ بھی کہ کنیز کے گھر جا کر بیٹی میری طرح محتاج تو نہیں رہے گی۔ خیر اُسے پیسے کا دکھ تو اس گھر میں جا کر نہیں ہوا لیکن اپنے آدمی کے پیار کے سوا اور کیا ملا؟ مجھے کیا معلوم تھا کنیز ایسی کڑی ساس نکلے گی۔ بات بات پہ جھڑکنے والی۔ مجھے بتایا تو نہیں پر کیا خبر اس پر ہاتھ بھی اٹھاتی ہو۔ یا بیٹے سے پٹواتی ہو۔ مگر وہ ایسا ہے نہیں، نہ اللہ بخشے وہ اچانک چلے جانے والا ایسا تھا'۔

'میاں کی موت کی خبر تار سے دے سکتی تھی، کسی کو بھیج کر کہلوا سکتی تھی۔ میں اُڑ کر پہنچ جاتی۔ اب تیسرا دن تو ہے ہی، ہفتہ بھر دیر سے جاتی تو دروازہ اور دن پاٹوں پاٹ کھلا رہے میرے لیے نہ کھلتا۔ اب بھی سات پشتوں کو پُن ڈالے گی کہ کیا ضرورت تھی آنے کی'۔ کاش کلکتہ اتنا ہی پاس ہوتا کہ وہ کسی سے کہلواتی اور رمضان آ کر اُسے بہن کی سسرال لے جاتا!

تھرڈ کلاس کے فرش پر اس کے پاس بیٹھی ہوئی عورت نے کہا: 'کیا بات ہے اپنے گھر تو جاتے نہیں دِکھتی ہو'۔ خاتون کی آنکھوں میں آنسو اُبھر آئے۔ بولی 'نہیں کوئی بات نہیں ہے، بیٹی کے گھر جا رہی ہوں'۔

'وہ تو کُشل ہے نا؟'

خاتون نے سر کی معمولی جنبش سے ہاں کہا۔

'اُس کا پتی؟'

خاتون نے پھر جواب اُسی جنبش سے دیا۔

'اور بیٹی کے بچے؟'

'سب ٹھیک ہیں' خاتون نے سانس چھوڑتے ہوئے کہا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

سوال کرنے والی عورت نے سامان میں سے ویسی بوتل نکالی جس میں لوگ گھروں میں مٹی کا تیل رکھتے ہیں، اس کے مُنھ سے کاغذ کی ڈاٹ کھینچی، سر پیچھے جھکا کر پانی کی دھار مُنھ میں ڈالی، ڈاٹ لگا کر اُسے جتنا ممکن تھا کسا، ایک نظر اُس پریشان چہرے والی ہم سفر پر ڈالی اور دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

جس وقت خاتون بیٹی کے گھر پہنچی — زندگی میں پہلی بار اکیلی، ورنہ کوئی نہ کوئی ساتھ ہوتا تھا — سورج آدھا پونا ڈوب چکا تھا۔ دروازے کا ٹاٹ کا پردہ ایک طرف کر کے اس نے صحن میں جھانکا۔ وہاں فیروزہ دروازے کی طرف پیٹھ کیے پھنکنی سے سلگتی ہوئی لکڑیوں کو پھونک رہی تھی اور گاڑھا نیلا سفید دھواں چولہے سے اٹھ رہا تھا۔

دالان میں کوئی نہیں تھا نہ پیچھے کے کمروں میں کوئی نظر آ رہا تھا۔ اسی وقت جیسے دھواں فیروزہ کی آنکھوں اور حلق میں گھس گیا اور وہ زور سے کھانستی ہوئی پیڑھی پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ پھر آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے اس کی نظر دروازے پر پڑی اور اس کے مُنھ سے نکلا 'اماں تم!'

خاتون بھاگ کر اندر آئی اور بیٹی کو سینے سے چپٹاتے ہوئے بولی 'تو ایک طرف ہو میں آگ سلگا دوں۔ سب کہاں گئے ہیں؟'

فیروزہ نے کہا 'بچے تمھیں باہر نظر نہیں آئے؟ باقی سب جنے ٹھیک ہیں۔ تمھیں کیسے پتہ چلا؟'

'ڈھلن کا بیٹا جمیل ادھر دوپہر کو آیا تھا اپنے کسی کام سے۔ بدھ کو اس نے لوٹ کر پہلا کام یہ کیا کہ مجھے بتانے آ گیا: 'خالہ تمھیں کچھ خبر بھی ہے فیروزہ کا توسرا گزر گیا۔'

میں نے کہا: اچھا بھلا تھا کیا ہوا تھا اُسے؟ سانپ نے کاٹا تھا؟ اس نے کہا 'پتہ نہیں'

میں نے کہا 'کیا بیمار پڑا تھا؟' اس نے کہا 'پتہ نہیں۔'

میں نے کہا 'اپنے دل سے تو نہیں بنا رہا ہے؟ پر اس کے پاس بس پتہ نہیں کی رَٹ تھی۔'

اندر سے کنیز کی اونچی آواز آئی 'اپنے کھانے کو نہ ہو پر مہمانوں کا آنا نہیں رکتا ہے۔ بس آنے کا بہانہ چاہیے۔ آ جاتے ہیں کھانے چاٹنے کو۔'

لگتا تھا کمرے میں وہ کسی کو ڈانٹ رہی ہے۔

ماں سے مُنھ چرانے کے لیے فیروزہ دوبارہ پھنکنی سے لکڑیوں میں پھونکنے لگی۔ خاتون خاموشی سے سنتی رہی جو کچھ کنیز کہہ رہی تھی اور جب اس کا کافی دیر کسی اَن دیکھے کو پھٹکارنا تھما تو خاتون نے اونچی آواز میں بیٹی سے کہا:

'فیروزہ جب تو پکا چکے تو آگ مت بجھیو۔ میں بھی اپنے لیے ایک روٹی ڈال لوں۔' اچانک دونوں محاذوں پر خاموشی ہو گئی۔

پھر فیروزہ نے اونچی آواز میں ماں سے کہا 'اماں تم تھکی ہوئی ہو اور بگڑ کی روٹی پکانے چلی ہو۔ لاؤ پہلے میں تمہاری روٹی ڈال دوں، بھوکی ہوگی۔'

اندر اب بھی خاموشی تھی۔

پھر کنیز نے اندر سے کہا 'بہو بچے ابھی تک نہیں لوٹے۔ آواز دے لے۔'

فیروزہ نے ٹھوڑی سے ایک طرف کو جھٹکا دیا جیسے کہا ہو اُنھ۔

جب خاتون کی روٹی پک چکی تھی اور وہ پہلا ٹکڑا روٹیاں پکاتی ہوئی بیٹی کے منھ میں دے رہی تھی بچے شور مچاتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے اور نانی کو دیکھتے ہی اس سے لپٹ گئے۔

کنیز دروازے کی دہلیز پر آ کھڑی ہوئی اور تصنع بھرے تعجب سے اس سین کو دیکھنے لگی۔ پھر اس نے کہا 'خاتون تو کب آئی؟'

'دیر ہوئی۔ بس خبر ملتے ہی دوڑ پڑی۔'

پھر بچوں کے مُنھ میں روٹی کے ٹکڑے دیتے ہوئے خاتون نے کہا 'آ تو بھی کھا لے۔ ایسی خستہ روٹی تو نے کبھی کاہے کو کھائی ہوگی۔'

کنیز شرمندہ سی پاس آ کر کھڑی ہوگئی اور بولی 'بچوں کو مت دے۔ ان کا پیٹ خراب ہوجائے گا موٹے آٹے کی روٹی سے۔'

خاتون نے سمدھن کی طرف سرخ روٹی کا ایک بڑا ٹکڑا بڑھاتے ہوئے کہا 'تیرا خراب ہو تو بتیو، ابھی تو بچوں کو کھا لینے دے۔'

کھانے کے بعد تھوڑی دیر کو تینوں عورتوں کا رونا دھونا ہوا، پھر کنیز اندر چلی گئی، بچے کھیل میں لگ گئے اور فیروزہ برتن سنگوانے میں۔ خاتون نے صحن میں کھڑی کھاٹ کو لٹایا اور اس پر پڑ کر کچھ دیر بے دھیانی میں آسمان کو دیکھتی رہی۔ پھر بچوں کے نام لے کر انہیں پکارتے ہوئے اونچی آواز میں بولی: 'ارے کہانی سننا ہے تو ابھی سن لو، صبح سویرے اٹھ کر نانی کو ریل گاڑی پکڑنی ہے، اپنے گھر جائے گی۔'

خالدہ حسین

معدن

جمیل سے اچانک مل جانا انتہائی متوقع طور پر غیر متوقع تھا۔

یہاں کوئی کتابت (آج کل کمپوزنگ) کی غلطی نہیں۔ آپ بھی کبھی عمر کے اس حصے میں پہنچ جائیں گے (ہوسکتا ہے کہ پہنچ چکے ہوں) جب سب کچھ انتہائی متوقع طور پر غیر متوقع ہوتا ہے۔ یعنی کسی بھی وقت کچھ بھی ہوجانا ہر وقت ممکن رہتا ہے۔ اس کی وجہ کچھ بھی رہی ہو۔ شاید اس لیے کہ جواں سالی اور توانائی کے موسموں میں سب کچھ اختیار میں ہوتا ہے۔ جب ہاتھ باگ پر ہوتا ہے اور پاؤں بھی رکاب میں۔ مگر پھر سب کچھ ڈھیلا پڑتا جاتا ہے اور گرفت گرفت نہیں رہتی ایک خواب آلودہ تشنج ہوجاتی ہے۔ میں بھی اب اس دشتِ عمر کی سیاحی میں وہ پانچویں درویش بن چکی تھی جو ایک منفعل فراغت کے ساتھ منتظر رہتی کہ دیکھیے اب پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ پردۂ غیب اب کہیں تصور کے آخری کناروں سے سرک کر شعور کے عین مرکز تک تن چکا تھا۔ چنانچہ ایک انتہائی غیر اہم نجی سی محفل میں اچانک جمیل میرے سامنے کھڑا تھا۔

اب یہ تفصیل انتہائی غیر ضروری ہے کہ وہ کتنا بدل چکا تھا اور میں کس حلیہ میں تھی۔ مگر پہچان بھی عجب چیز ہے۔ ہمارے چہرے پر کوئی نہ کوئی ایسی پرچھائیں رہ جاتی ہے جو ہماری شناخت کروا دیتی ہے۔ اس وقت جمیل نے حسب عادت ایک شعر صادر کیا وہی جس میں کہا گیا ہے کہ کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا ملاقاتِ مسیحا و خضر پر بھاری ہے۔ میں اس کی ہمدمِ دیرینہ کیسے ہوگئی یہ بھی ایک بہت غیر منطقی بات ہے۔ یہ تو محض اتفاق تھا کہ یونیورسٹی کے زمانے میں وہ میری طرح ذرا پٹری سے اتری باتیں کرتا تھا اور یہی ہمارے درمیان رابطہ کا سبب تھا۔ اب اس میں کوئی خوش فہمی یا تکبر کا مسئلہ نہیں کہ عام ڈگر سے ہٹ کر بات کی جائے کیونکہ بھی دیوانے اور فریکس اس قسم کی گفتگو کے اسیر ہوتے ہیں عام ڈگر سے ہٹ کر سے مراد غیر منطقی ہونا ہے۔ باتوں کی بھی اپنی سرزمین ہوتی ہے کبھی یوں بھی

ہوتا ہے کہ ٹھوس زمین سے اوپر اٹھ کر آپ کسی غیر مرئی علاقے میں داخل ہو جاتے ہیں۔

ایک غلط یا خوش فہمی میں اس کہانی کے آغاز ہی میں دور کر دینا چاہتی ہوں۔ جمیل اور میرے درمیان کسی قسم کا جذباتی اور رومانوی رابطہ نہ تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ہم کبھی کبھی ایسے خواب دیکھتے جو اگلے روز دن کی روشنی میں بالکل حقیقت بن جاتے۔ یہ خواب انتہائی غیر اہم، معمولی بلکہ ناقابلِ توجہ چیزوں کے بارے میں ہوتے مثلاً یہی کہ ایک بار میں نے ایک شوخ رنگوں والی بس دیکھی جو میرے گھر کے سامنے والے بس اسٹاپ پر رکی۔ ایک چھوٹی سی لڑکی دو چوٹیوں میں سفید ربن جھلاتی، نیلے فراک میں ملبوس بھاگتی بھاگتی آ کر اس میں سوار ہوگئی۔ یہ ایک علیحدہ مکمل ٹکڑا تھا اور اس کا کوئی بھی سیاق وسباق نہ تھا۔ مگر اگلے ہی روز صبح سویرے جب میں یونیورسٹی کے لیے گھر سے نکلی تو گھر کے سامنے وہی شوخ رنگ بس آن کر رکی اور عقبی گلی سے چھوٹی سی لڑکی نیلا فراک پہنے اور دو چوٹیوں میں سفید ربن ڈالے آ کر اس میں سوار ہوگئی۔

جمیل نے کہا تھا کہ یوں لگتا ہے کہ کچھ واقعات کبھی کہیں کسی اور وقت میں ہو چک کر (وہ اسی طرح بولتا تھا) کہیں محفوظ ہو جاتے ہیں اور پھر ہمارے اس وقت میں آن داخل ہوتے ہیں۔ مثلاً میں اکثر ایسے لوگوں کو خواب میں دیکھتا ہوں جنھیں میں جانتا پہچانتا نہیں ہوں مگر جو اگلے ہی روز میرے سامنے سے بے نیازی سے گزر جاتے ہیں۔ سو ایسی ایسی غیر عقلی باتوں میں شرکت، کسی اور وقت اور کسی اور دشتِ امکاں کا احساس ہمارا موضوع ہوتا اس میں ہمدمِ دیرینہ ہونے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

اب بھی بے حد بدمزہ چائے کی پیالی اُٹھاتے ہوئے میں نے اس سے کہا۔

''سامری جادوگر! کہو تم نے مزید کتنی قوموں کو گمراہ کیا۔''

''اور سونے کے بچھڑے بنائے!'' اس کی حاضر جوابی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ پھر اس نے اپنی سنک کرسی کے بازو میں اُڑس کر، ایک ٹانگ بالکل سیدھی رکھتے ہوئے کرسی پر نشست جمائی اور اپنی بھدی تختی سی انگشتِ شہادت ہونٹوں پر رکھ کے بولا۔

''چپ چپ۔ یہ حرفِ ابجدس بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ میرا تجربہ کہتا ہے۔''

'سانپ اور سونا' ایک دم میرے کانوں میں گونجا۔

''س کی سرسراہٹ پر وہ فوراً حاضر ہو جاتا ہے حالانکہ اس کے کان نہیں ہوتے وہ اپنی کھال کے ارتعاش سے سنتا ہے اور سب سننے والوں سے بڑھ کر سنتا ہے کہ اسے پکارا گیا۔ میں بھی آج کل ایک س میں اُلجھا ہوا ہوں۔'' وہ ہنسا۔ اب بھی اس کے دانت چمکدار اور ہموار تھے۔

''سانپ یا سونا؟'' میں نے ترنت سوال جڑا۔
دیکھا۔ اسی لیے تو تم کو یاد کرتا تھا کیا کماں بات پکڑتی ہو۔ بھائی سونا۔ سونا۔''
''افوہ۔'' میں نے مایوسی سے کہا۔ ''میرا خیال تھا پہلے والا س ہوگا۔ وہ بھی تو اسی کے آس پاس ہوتا ہے۔ اس نے اپنی پرانی عادت ابھی تک نہ چھوڑی تھی جس کے باعث لوگ اسے پنیڈو بھی کہتے تھے۔ یعنی چائے میں بسکٹ بھگونے کی۔ میں نے کہا۔
''دیکھو جمیل۔ زیورات سے مجھے کبھی بھی دلچسپی نہیں رہی۔ دوسروں پر یہ زیور مجھے بہت اچھے لگتے ہیں مگر اپنے لیے نہیں۔''
''ہاں۔ تمہاری ایک ترقی پسند دوست نے بھی کبھی کوئی زیور نہیں پہنا کیونکہ اس کے نزدیک یہ عورت کی غلامی کی علامات ہیں۔ بالیاں حلقہ بگوشی، ناک کی لونگ نکیل، ہار طوق، چوڑیاں ہتھکڑی، پازیب بیڑیاں، واہ کیا تخیل ہے غارت گرِ حسن!'' وہ ہنسا۔
''خیر میرے معاملے میں ایسی کوئی دور کی کوڑی لانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تو یوں کہا تھا کہ اس کے باوجود بذاتِ خود سونا مجھے بہت فیسی نیٹ کرتا ہے۔ اس کے تصور پر میرے خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے۔''
''تو پھر سوچو ذرا۔ میرا کیا حال ہوتا ہوگا جو دن کے تیرہ چودہ گھنٹے سونے کی کان میں مدفون رہتا ہے۔'' اس نے نہایت اطمینان سے دوسرا بسکٹ چائے میں بھگویا۔
''کیا مطلب۔ تم؟''
''ہاں۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ میں مائننگ انجینئر بن گیا تھا اور ہوں۔ تبھی سے ملکوں ملکوں اور اب اپنے ملک میں مختلف معدنیات کی کھدائی پر تعینات رہتا ہوں اور تجربے کے ساتھ ساتھ میری قدر و قیمت میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ کہو بات پسند آئی؟''
''اچھا تو تم کان کن ہو۔ شکر ہے گورکن نہیں۔'' کہہ کر مجھے احساس ہوا کہ یہ انتہائی بدمذاقی کی بات مُنھ سے نکل گئی۔ مگر اس وقت سونے کے ذکر پر میری عجب حالت ہو رہی تھی۔ ابھی دو 'س' کا ذکر بھی ہوا تھا۔ کیا یہ محض اتفاق تھا کہ یہ سنسناتی ہوئی آواز دو انتہائی پراسرار طاقتوں کی علامت گر ہے۔ سنسناتی آوازوں کی اپنی ہی ایک ہیبت اور تاریک کشش ہوتی ہے۔ س س س۔ ایک تاریک آسیب سرسراتا۔ زہریلا سانس ہر شے کو اپنی طرف کھینچتا۔ وہ کبھی نہ ختم ہونے والے حشرات الارض کی زہریلی سرسراہٹ۔ کسی قیامت خیز لمحے کی ہراول۔

اب اس موضوع کی دلدل سے اپنے آپ کو نکالنا ناممکن سا لگ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ میرے آس پاس معدوم ہونے لگے۔

''یہ سونا۔ دولت کی علامت ہے یا خود دولت مجسم۔ سونا دولت کیونکر بنا۔ کن خصوصیات کی بنا پر اور وہ جو قدیم حویلیوں کے فرشوں تلے آدھی آدھی راتوں کو اشرفیوں بھری دیگیں لڑھکتی ہیں اور صدا دیتی ہیں 'بیٹا دے دو۔ دولت لے لو' اور اس آواز پر ہرگز کان نہیں دھرنا چاہیے۔''

''ہاں۔'' جمیل نے کرسی میں اُڑسی چھڑی نکال کر اس کی موٹھ کا معائنہ کیا۔ ''ہاں میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ ایک ماہرِ معدنیات ہونے کی حیثیت سے کہ زمین بذاتِ خود ایک خزانہ ہے۔ خزانے کا مدفن۔ جتنی دولت ہمیں زمین کے اوپر نظر آتی ہے اس سے کہیں زیادہ کروڑوں درجے زیادہ زمین کے اندر، اس کے نیچے ہے۔ تو دراصل یہی دولت انسان کو سنسان راتوں میں پکارتی ہے اور آخر کھینچ لے جاتی ہے۔''

اب وہ ایک ظالم جاسوسی کہانی کار بنا بیٹھا تھا اور بہت برا لگ رہا تھا۔ ایسا کہانی کار جو کہانی کے اسرار سے پڑھنے سننے والوں کو نیم جان کر دیتا ہے۔ دانستہ اور اس عذاب کو طویل سے طویل تر کرنے کے لیے کہانی کا انجام موخر کیے جاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر کمینگی اور کیا ہوگی۔ زمین کے خزانے سنسان راتوں میں آوازیں دیتے ہیں لیکن ان کے ساتھ جرم کیوں منسلک اور منسوب ہے۔ میں نے سوچا اور اس نے سُن لیا۔

''ہاں دیکھو نا۔ دولت کی ہر دیگ کے مُنھ پر آٹے کا سانپ رکھا ہے جو بوقت ضرورت اصل ناگ بن کر سونے کی حفاظت کرتا ہے اور پھر دولت صرف بیٹے ہی کے عوض کیوں ملے۔ یہ سودا۔ یہ جنس متبادل۔'' وہ بھی سوچ میں پڑ گیا۔

اب میں نے دیکھا کہ اس نجی محفل کے شرکاء ایک ایک کر کے سب جا چکے تھے اور صاحبانِ خانہ خود بھی اکتا کر کہیں کھسک لیے تھے اور کمرے میں بس ہم دو تھے۔

''دراصل دولت سے آدمی کی نیت اور ارادہ کا رشتہ بہت پیچیدہ بھی ہے اور خطرناک بھی۔ دولت سے ہم کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے۔''

''مگر میں تو دولت سے یعنی سونے سے کچھ حاصل نہیں کرنا چاہتی۔ میں صرف اس کو محسوس کرنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ میں نے اسے اس کی اصل صورت اور حالت میں کبھی نہیں دیکھا۔ سونا جو طاقت مجسم ہے۔ یعنی اختیار۔ قوت۔ ناقابلِ تسخیر۔ اس کی منجمد مادی صورت جس کو ہم چھو سکیں، محسوس کر سکیں۔''

''ہاں یہ کبھی بسکٹوں کی صورت میں ڈھال لیا جاتا ہے کیونکہ اب اشرفیوں کا زمانہ نہیں۔''

پھر میں نے کہا'' یہ کہیں رکھا جاتا ہوگا۔ کسی ملک کی طاقت اس کے ذخیرے کے تناسب سے ہوتی ہوگی۔ کرنسی کے برابر ملکیت کا سونا ملکی خزانے میں موجود ہونا ضروری ہے سب کچھ زوال پذیر ہے۔ ملکوں کی کرنسی کی قیمت راکھ برابر ہوسکتی ہے (جیسا کہ ہو رہی ہے) مگر اس کی نہیں۔ یہ لازوال ہے۔ میں بس یہی محسوس کرنا چاہتی ہوں۔ کیسا ہوتا ہوگا۔ تم لوگ اسے کیسے تلاش کرتے ہو۔ کیسی چٹانیں۔ کیسی ریت؟''

اب جمیل نے سگریٹ سلگائی اور اطمینان سے بیٹھ گیا'' تم ابھی تک اچھی خاصی جاہل ہو۔ دراصل شروع ہی سے مجھے تمہاری ذات کے ایک انتہائی اعلیٰ، ایک نہایت احمقانہ حصے کے ساتھ ساتھ موجود ہونے نے بہت الجھایا ہے۔ تمہارا اب بھی وہی حال ہے۔ گوگل کے وقتوں میں کسی بھی چیز سے بے خبر ہونے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔''

''سنی سنائی بے جان خبر میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یہ تو تمہیں ڈکشنری یاد کرنے کا شوق تھا۔ مجھے تازہ، دھڑکتا، پانچوں حسوں سمیت علم چاہیے۔ مجھے بتاؤ وہ کیسی کان ہے؟''

''محترمہ آپ ایک کان کی بات کرتی ہیں۔ پوری زمین ایسے معدنوں سے پٹی پڑی ہے۔ قدم قدم پر ہیرے جواہرات، زمرد، فولاد، الحدید اور کیا کچھ نہیں۔ ذرا اس زمین پر دیکھ بھال کر احتیاط سے قدم رکھا کرو۔ وہ تم بھول گئیں کہ زمین کا ہر ٹکڑا شاید کوئی ساعدِ سیمیں ہے یا کوئی صراحی دار گردن اور زلفِ عنبریں یا چشمِ غزال مگر مسئلہ یہ ہے کہ کوئی شے بھی اس صورت میں نہیں جسے تم پہچان سکو۔ تم تو زمرد اور کنکر میں تمیز کرنے سے عاجز ہو۔ ہزار ہا مرحلوں سے گزر کر ان خزانوں کا جوہر عیاں ہوتا ہے ورنہ تمہارے لیے تو سب کچھ پتھر برابر ہے اور پتھر میں بھی کئی صورتیں پوشیدہ ہیں جو صرف سنگتراش ہی دیکھتا اور برآمد کرتا ہے کچھ آئی سمجھ! دنیا وہ نہیں جو نظر آتی ہے۔ حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے۔''

اب ایک عجیب سے مایوسی مجھ پر طاری ہو رہی تھی۔ ''چلو ٹھیک ہے۔ میں کچھ بھی اصل صورت میں نہیں دیکھ سکتی مگر اس خام مادے کو تو دیکھ سکتی ہوں جو بالآخر یہ سرمایہ، یہ طاقت بن جاتا ہے۔''

''تو کیا تم کسی معدن میں جانے کا سوچ رہی ہو۔'' پھر اس نے حسب عادت مصرع جڑا 'جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں کے معدن کو۔'

''ہاں میں یونہی تمہارے ساتھ وقت ضائع نہیں کر رہی۔ اب ضائع کرنے کو وقت ہے بھی نہیں۔''

''ویسے تو تم سراپا تضیعِ اوقات ہو۔ معاف کرنا۔ اچھا میں تمہیں اپنے ساتھ لے جا تو سکتا ہوں۔ گو اس کے لیے مجھے خاص اجازت لینا ہوگی مگر مجھے ڈر ہے تم ایک اور ڈس الیوژن منٹ کا شکار ہوکر بیمار پڑ جاؤ گی اور خواہ مخواہ خون میری گردن پر ہوگا۔ کیونکہ جہاں میں تمہیں لے کر جاؤں گا وہاں نہ تو کوئی چکا چوند ہوگی نہ ہی اطراف میں جھمکے ہار اور بازو بند اور بسکٹ آویزاں ہوں گے۔ وہ خالص پتھر ہوں گے اور صرف جوہری کی آنکھ ان میں زمرد، پکھراج، عقیق اور زرِ خالص دیکھ پائے گی یا پھر ہم ایسے مشینی تجزیہ کاروں کی۔''

''کوئی مضائقہ نہیں۔ مجھے اپنی سی کوشش کرنا۔ کیا اس بات کی بھی داد نہ دو گے کہ میرے اندر اب تک حیرت زندہ ہے۔ تجسس دھڑکتا ہے۔ حیرت ہے کہ اب تک حیرت زندہ ہے اور اس کی تشفی کی لگن۔

''شاید یہ ہی ریگریشن ہے۔ بچے کی اشیاء دریافت کرنے کی جبلت۔ تم سفر معکوس کر رہی ہو۔ بہرحال آدمی خوش رہتا ہے۔'' جمیل مجھے مایوس کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا۔ پھر اس نے باقی ماندہ سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کہا۔ ''بھائی میں تو خیر حکام اعلیٰ سے تمہارے لیے اجازت لے لوں گا مگر تمہارا اپنا کیا بنے گا۔ تمہارے اپنے لواحقین تمہیں اس عجیب وغریب مہم پر جانے دیں گے۔ یہ تو ان کے لیے بہت ہی طفلانہ حرکت ہوگی خصوصاً جب کہ تمہیں چلنے میں اچھی خاصی دقت ہونے لگی ہے۔ دیکھو سب کچھ خود بخود ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ عارضہ تمہیں کب ہوا؟''

''جب سے تم—'' میں نے بھی جل کر اس کی اسٹک کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاہا۔ اچھا ہے۔ اچھا ہے۔ ہاں تو کس کس سے اجازت لینا ہوگی تمہیں۔''

''تم ویسے میرے کوائف جاننا چاہتے ہو تو تفصیل سے بتا دوں گی۔ مجھے کسی سے اجازت لینے کی حاجت نہیں رہی۔ سب لوگ اپنے آپ میں بے حد مصروف ہیں۔ تم بتاؤ اس پتہ پر مجھے کس دن کس وقت پک کرو گے؟''

پھر میری گردن میں شناختی کارڈ کے ساتھ ساتھ ایک اور کارڈ بھی لٹکا دیا گیا اور جمیل اپنی اس عجیب وغریب لینڈ کروزر میں لے کر مجھے معلوم نہیں کون سے بالکل ہی دور دراز اور انجانے مقام کی طرف چل پڑا۔ پیچھے ہم دونوں اور اگلی سیٹوں پر ڈرائیور اور ایک اس کا ساتھی تھے۔ گاڑی کے تمام شیشے رنگے ہوئے تھے اور ان میں سے خشک پہاڑی راستے، بے آب وگیاہ خطے گزرتے

چلے جا رہے تھے۔ میں سینڈوچ اور کافی کی تھرمس لے آئی تھی۔ جمیل کھانے پینے میں کبھی تکلف نہیں برتتا تھا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ بلوچستان میں سونا دریافت ہو چکا ہے اور سوات اور سرحد میں تو قیمتی پتھر ایک عرصے سے نکل رہا ہے اور بے چاری سپر طاقتیں سخت مصیبت میں گرفتار ہیں۔ اب بلوچستان پر ان کی عنایت ہائے بے جا۔ واہ، سونے میں کیسی طاقت ہے۔''

میں نے کہا ''جمیل زمین جو ہمارے قدموں پڑی رہتی ہے کتنی طاقت ور ہے۔ جس دن کھلے گا وہ دن بڑا خوفناک ہوگا۔ جوع الارض کتنی بھی بلاخیز ہو خود زمین سے زیادہ طاقت ور نہیں ہو سکتی۔ جس روز وہ اپنا سب کچھ دے مجھے موجود نہیں ہونا چاہیے۔''

''چلو اب تم ایسے لوگ اس زمین سے محبت تو کریں گے کہ اس میں سونا ہے۔''

اس وقت تک گاڑی رک چکی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا گیٹ تھا جس پر اندھے شیشوں والی ایک چیک پوسٹ میں نہ نظر آنے والے لوگ تھے اور کہیں سے ٹک ٹک کی آوازیں آ رہی تھیں اور چیک پوسٹ کی چھوٹی سی کھڑکی کا چھوٹا سا پٹ آدھا کھلا تھا جس میں سے کچھ بھی نظر نہ آتا اور اس میں سے کاغذات اندر سرکائے جا رہے تھے اور چاروں سمت سناٹا تھا پھر گاڑی روانہ ہوئی اور اب چاروں مشینوں کی گڑگڑاہٹ اور آتی جاتی گاڑیاں۔ سب لوگ روبوٹ نظر آ رہے تھے۔ ایک سے نارنجی اوور آل۔ ایک مجھے بھی پہنا دیا گیا اور سر پر وہ ہیلمٹ۔ میری ازلی کمزوری رہی ہے کہ سر پر ذرا سا بوجھ بھی مجھے سن کر دیتا ہے۔ سو اس وقت بھی دھندلی نیم غفلت بڑھتی چلی آ رہی تھی۔

''شاید تمہیں معلوم ہی ہو کہ معدن میں اترنے کے لیے ہمیں زیرِ زمین بے حد و حساب گہرائی میں جانا پڑتا ہے۔ اس معدن کی کھدائی ابھی تک تکمیل کے مراحل سے گزر رہی ہے۔ ہم اس لفٹ میں سفرِ معکوس کرتے ہوئے معدن کے پیٹ میں جا پہنچیں گے۔ یہاں آکسیجن کا مرکزی سسٹم ہے اور بجلی کا بھی۔ دیکھنا وہ کمرہ کس قدر روشن ہے جہاں میں کمپیوٹر اور بہت سے آلات پر رات گئے تک کام کرتا ہوں اور وہ پیمانے تلاش کرتا رہتا ہوں جن کے مطابق اس کھدائی کی تکمیل ہوگی۔ لفٹ ذرا چھوٹی ہے۔ تنگ سی۔ مگر فکر نہ کرو اس کی بجلی کبھی دغا نہیں دیتی۔ گو اس میں صرف دو بندوں کی گنجائش ہے۔ اس کے تمام بٹنوں اور برقی نظام سے میں بخوبی واقف ہوں۔ گھبراؤ نہیں۔ اس کیپسول سے باہر سوائے تاریکی اور سنگین اطراف کے کچھ نہیں۔ مگر جب ہم اپنی منزل پر پہنچیں گے تو دیکھنا وہاں کیسی رونق اور روشنی ہے تم دیکھ کر خوش ہو جاؤ گی۔ بہت سے لوگ۔ دلکش

موسیقی۔ کیفے ٹیریا۔ آرام دہ نشستیں۔ جی چاہے تو آرام کرنے کو دیوان بھی موجود ہے۔ میں جاتے ہی تمہیں بڑی زبردست چائے پیش کروں گا اور اس ہیلمٹ سے نجات دلاؤں گا۔ جس سے تم نیم بے ہوش ہوتی جا رہی ہو۔ ابھی کچھ ہی دیر میں تم ان اطراف کو چھو سکو گی جو سونا ہیں۔

''اور مجھے تو یہ سب کچھ خیال ہی محسوس ہوا۔ یہ لفٹ کا زمین دوز سفر۔ شکر ہے مجھے بعد میں پتہ چلا تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر کی گہرائی پر اور جمیل کا دفتر تو بالکل میرے گھر کے لاؤنج ایسا۔ شاید اس نے پہلے سے اطلاع دے رکھی تھی۔ اس وقت شاہدہ پروین کی آواز نرم لہروں ایسی ڈوب پھر رہی تھی۔ روٹھی رت نہ مانی عمر یا بیت گئی۔ ہم زیر زمین ہرگز نہ تھے۔ اور کیا واقعی ڈیڑھ دو کلومیٹر گہرائی پر۔ دیکھو تو برسر زمین اور زیر زمین چند ثانیوں کا فرق ہے مگر اترو تو زمانوں کا فاصلہ۔ ہونے نہ ہونے کی حد فاصل۔ ایک کپکپی مجھے سر سے پاؤں تک ٹھنڈا برف کرنے لگی۔ جمیل نے میرا ہیلمٹ اتار کر ایک کاؤنٹر پر رکھ دیا تھا اور میری نیند غائب ہونے لگی تھی۔ کوئی نامعلوم سی دھند رفتہ رفتہ چھٹنے لگی۔'' کہاں ہے۔ سونا۔ کیا یہ سب اطراف۔'' میں نے چاروں جانب دیکھا۔

''ہاں دیکھو اس سارے پتھر میں دیواروں میں، چھت میں، فرش میں، روشنی کے کسی خاص زاویے سے کرسٹل نظر آتے ہیں۔ تو یہی وہ طاقت ہے۔ یہ پتھر۔ میں نے اس سنگین طاقت کو چھو کر دیکھنا چاہا۔ مگر عین اسی وقت ایک دہاڑتے الارم نے درودیوار لرزا دیے۔

''یہ کیا؟'' میں نے شیراز کے زرد پڑتے چہرے کی طرف دیکھا۔ س کی سنسناہٹ نے ہمیں گھیر لیا تھا۔ س س س یہ پھنکارتی لرزش دم بہ دم بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ شاید زمین اپنے راز اگلنے لگی تھی۔ (اور ہم اس بات سے عاجز نہیں کہ تمہاری طرح کے اور لوگ تمہاری جگہ لے آئیں اور تم کو ایسے جہان میں پیدا کر دیں جس کو تم نہیں جانتے)

''کچھ نہیں۔ گھبراؤ نہیں۔'' جمیل نے اطمینان سے کہا۔ ''ایک تودہ گر گیا ہے۔ گرتے رہتے ہیں۔ مگر لفٹ کا راستہ تنگ ہونا شروع ہو گیا ہے۔ سب کو فوراً باہر نکلنا ہے۔'' اس نے جلدی سے ہیلمٹ میرے سر پر رکھا اور مجھے کھینچتا ہوا لفٹ تک لے گیا۔ جس کے دروازے پر سرخ روشنی میں صرف ایک بلب جل بجھ رہا تھا۔ اس نے مجھے اندر دھکیلا اور لفٹ ٹھوکریں کھاتی چلتی رکتی روانہ ہوئی۔ مجھے ان بٹنوں کا اس پورے نظام کا کچھ علم نہیں اور میں ایک بھی پتھر ہمراہ نہیں لا سکی اور مجھ پر وہ زرِ خالص بھی منکشف نہیں ہوا۔

فہمیدہ ریاض

ایک مقتول صدر کے بیٹے

دوسری عالمی جنگ کے اختتام پر، دنیا کے نقشے پر ابھر آنے والے کئی ملکوں میں سے ایک میں، یہ معمولی سا واقعہ ہوا۔

ساٹھ پینسٹھ برس قبل، اس ملک کا ایک اوّلین صدر بھی تھا۔ ایک سیاسی جماعت کا رہنما جس نے لاکھوں، نہیں اچھے خاصے کروڑوں لوگوں کا من موہ لیا تھا۔ زمین کے ایک طویل و عریض خطے پر پھیلے ہوئے میدانوں، پہاڑوں، سمندری ساحلوں پر رہتے یہ لوگ اس جماعت کے حمایتی بن گئے تھے۔ یہ جماعت جس کا ابتدائی تحریری مقصد اپنے مذہبی مسلک سے تعلق رکھنے والے زمین داروں کے مفادات کی نگہبانی تھا لیکن زمین داروں کے مذہب کے ذکر کے باعث، یہ جماعت اس مذہب کے زیادہ تر پیروکاروں کو بھا گئی تھی۔ لوگوں نے صرف مذہب کے نام پر توجہ دی۔ اس ایک لفظ نے ان کے دماغ کے کسی تار کو چھیڑ دیا۔ بات نیا ملک بنانے تک پہنچی۔ اسی طرح کچھ لکیریں کھینچ کر وہ ملک بنایا گیا۔ اس کے بعد پورے خطے کی آبادی نے ایک دوسرے کو مارکاٹ کر سرحدوں سے پرے دھکیلنا شروع کیا۔

بہت خون بہا۔ ان گنت قافلے ہر دو جانب سے روانہ ہوئے۔ وہ پیدل چل رہے تھے اور کچھ ٹرینوں میں سفر کر رہے تھے۔ چند لوگ اس وقت کے چھوٹے چھوٹے قدیم ہوائی جہازوں میں بھی بیٹھ کر آئے۔ بہت سے لوگ سمندری جہازوں میں سوار ہو کر ایک ملک کے ساحل سے دوسرے ملک کے ساحل پہنچ گئے۔ تھپیڑے مارتی لہروں میں انہوں نے لنگر ڈالے اور چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں بیٹھ کر نئے ملک کی زمین پر قدم رکھنے پہنچے۔

ان کشتیوں کے سیاہ فام ملاح نئے آنے والوں کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ گزشتہ صدی

میں ان کے آباؤ اجداد یہاں شاید غلام بنا کر لائے گئے تھے۔ چند ایک کسی حکمراں کی چھوٹی سی فوج میں بھی شامل تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو قدیم بحری جہازوں میں تجارت کرنے جاتے تھے اور ان کے کپتان بھی تھے۔

وہ ہنس رہے تھے اور آپس میں مذاق کر رہے تھے اور آنے والوں کی بہتات کے باعث ان کی آمدنی پہلے سے کہیں زیادہ ہو رہی تھی۔

ساٹھ پینسٹھ برس بعد ان ہی کی اولادوں میں سے کسی ایک نے انگلی سے اشارہ کر کے ایک سرکاری موٹر کار کو شہر کے قومی عجائب گھر کا راستہ بتایا۔ وہ شہر کی قدیم تنگ سڑکوں پر بھٹک رہی تھی جو دکانوں سے پٹا پڑا تھا۔ اوپر پرانے مکان اپنی زنگھیائی لوہے کی بالکنیوں اور بندروں اور شیروں کی ٹوٹی پھوٹی مورتیوں سمیت ایک دوسرے پر چڑھے آ رہے تھے۔ یہ گلیاں سے جب بنائی گئیں تھیں تو موٹر کاروں کا تصور کسی کے ذہن میں نہ تھا۔ اس لیے گاڑیاں گلیوں سے واپس نہیں جا سکتی تھیں کیونکہ لحظہ بھر میں ان کے پیچھے ایک لمبے رسیلے میٹھے بانس نما نبات کے رس بیچنے والوں کے اور پلاسٹک کے کھلونے یا پرانی ادویات میں استعمال ہونے والے اور اس خطے میں نایاب جڑی بوٹیوں اور ان کے سفوفوں کے رنگ برنگے ڈھیر سجائے ٹھیلوں کی قطار راستہ بند کر دیتی تھی۔ ان میں دوسری موٹر گاڑیاں دکانوں کے سامان سے لدے پک اپ اور موٹر سائیکلیں بھی شامل تھیں جو زور زور سے پھٹپھٹا رہی تھیں اور ہارن بجا رہی تھیں۔ اس طرح ایک جلوس میں سرکاری گاڑی ایک تنگ گلی سے دوسری تنگ گلی میں داخل ہو رہی تھی کیونکہ اسے بتایا گیا تھا کہ اس شہر کا قومی عجائب گھر جو شاید اپنی نئی عمارت میں منتقل ہو گیا ہے، یہیں کہیں ہے۔

گاڑی بھٹک گئی تھی اور حیران تھی کہ ان بھول بھلیوں سے کیوں کر نکلے اور قومی عجائب گھر تک کیسے پہنچے جہاں اسے ایک تقریب میں جانا تھا۔ جو اس ملک کے اس اولین صدر کے نام پر اس سرکاری ادارے کو یادگاری تمغہ دینا چاہتی تھی جس نے اس زبان کی ایک لغت بنائی تھی جو اولین صدر بولتے تھے، اور ان کے جلوس میں آنے والے لاکھوں لوگ بھی جو لکیریں پار کرتے وہاں آئے تھے جہاں یہ بولی کسی زمین کے ٹکڑے کی اپنی زبان نہیں تھی۔

ایسی حالت میں کتابوں سے بھری ایک پک اپ کے سرخ و سفید ڈرائیور سے سرکاری گاڑی نے قومی عجائب گھر کا راستہ پوچھ کر اسے کچھ پریشان کر دیا۔ وہ اس ساحلی شہر پر نیا تھا اور دور دراز شمال کے ایسے خطے سے آیا تھا جہاں آڑو، اخروٹ، خوبانی اور بادام کے لدے پھندے درخت

تھے۔ یہ پہاڑی علاقہ تھا اور اس کے گاؤں میں ایک جھرنا بہتا تھا۔ پانی کے ایک ٹوٹے ہوئے نالے سے پھوہار اس کے مٹی کے گھر کے عین سامنے گرتی تھی جس میں نہایا جاسکتا تھا۔ وہ اپنی فیملی کو ابھی وہیں چھوڑ آیا تھا۔ وہ آڑوؤں کے ایک ٹرک کے ساتھ ہی اس بڑے ساحلی شہر میں وارد ہوا تھا جہاں اسے ڈرائیور کا روزگار مل گیا تھا۔ گاڑی چلانا اسے واجبی سا ہی آتا تھا لیکن تین مہینوں میں وہ تھوڑی بہت سیکھ گیا تھا جبکہ اس شہر کی زبان سیکھنا اس کے لیے زیادہ مشکل ثابت ہوا تھا۔ اب وہ کتابوں سے لدی ایک پک اپ لیے کتابوں کے بازار کی طرف جارہا تھا جو ان گنجان گلیوں میں ہی کہیں پیوست تھا۔ اس نے سرکاری گاڑی کے اشارے پر پک اپ روک تو لی تھی جو ٹریفک کے باعث یوں بھی بس رینگ سی رہی تھی لیکن سرکاری گاڑی کے اس سوال پر کہ شہر کا قومی عجائب گھر کہاں ہے اس نے ہاتھ نچایا جس کا مطلب یہ تھا کہ نہ وہ یہ سوال سمجھا ہے اور نہ ہی اسے اس کا جواب معلوم ہے۔ جس پر سرکاری گاڑی کا ڈرائیور کافی متعجب ہوا۔

گاڑی میں سوار شخص جسے تمغہ لینا تھا یہ دیکھ رہا تھا کہ پک اپ میں ٹھنسی ہوئی کتابوں میں ایک ایسے شاعر کا کلام بھی تھا جس کی اس ملک میں صد سالہ سالگرہ منائی جارہی تھی۔ اولین صدر کے زمانے میں اسے ایک فوجی انقلاب لانے کی سازش میں شریک ہونے کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا تھا۔ اسے دوسرے ادیبوں اور صحافیوں کے ساتھ کئی برس جیل میں رکھا گیا تھا اور ایک جیل سے دوسرے جیل منتقل کیا جاتا رہا تھا۔ مگر یہ شاعر کچھ اس درجہ خلاق تھا کہ قید خانے کی سختیاں جھیلتے جھیلتے اس نے جو شاعری کی وہ بے حد حسین و جمیل، غم زدہ اور ساتھ ہی عوام کے لیے بہتر دنوں کی امید سے روشن اور تابناک قسم کی نکلی جو وہ اپنے ملاقاتیوں کے ہاتھ باہر بھیجتا رہا اور یہ لکیروں کے اندر اور باہر ہزاروں لوگوں کے دل میں اُتر گئی۔ جب وہ جیل سے باہر نکلا تو ہزاروں لوگوں کا ہیرو اور محبوب تھا۔ لوگوں کی محبت بہرحال اس کا اور اس کے بیوی بچوں کا پیٹ نہ بھر سکتی تھی اس لیے وہ روزگار کے لیے سرگرداں ہی رہا۔ ملک کے حاکموں کو الگ اُسے جیل بھیجنے کی عادت سی پڑ گئی تھی اور جب بھی ملک کی حاکمیت میں تبدیلی آتی تو اسے جیل بھیج دیا جاتا۔

دوسری صورت میں، کیونکہ اس کی عوامی مقبولیت اور والہانہ محبت روز افزوں رہتی تھی، حکام اسے مجبور کرتے کہ وہ ان سے مل جائے اور بس ان کا ہوکر رہے۔ اس پر ستم رسیدہ اور غم زدہ شاعر لکیریں پار کرکے کسی دوسرے ملک جا بستا جہاں سے پھر وہ کسی اور ملک کا رخ کرتا اور پھر کہیں اور چلا جاتا۔ جب وہ ملک واپس آتا تو وہی پرانے مسائل ازسرنو اس کو کچوکے لگاتے۔ جب وہ لکیروں

سے کہیں بہت دور نئی لکیروں میں ہوتا تب بھی اس کا دل خون خرابے اور ظلم و ستم پر درد سے بے چین رہتا اور وہ شعر لکھ لکھ کر وطن بھیجتا رہتا جسے اس کے شائقین چومتے اور آنکھوں سے لگاتے اور آنسو بہاتے۔ بالآخر ایک بار شکستہ بدن اور زخمی روح کے ساتھ جب وہ اس ملک میں واپس آیا تو جلد ہی دل کا دورہ پڑنے سے ختم ہو گیا۔

اس کی زندگی کے اختتام میں کئی عشرے لگے۔ جن کے دور حکومت میں اسے گرفتار کیا گیا تھا ملک کے اس اولین صدر کو تو بہت جلد قتل کر دیا گیا تھا۔ ان کا دور چند برس سے بھی کم عرصے پر مشتمل ثابت ہوا۔

آخر سرکاری گاڑی ایک جگہ رکی اور گاڑی میں سوار شخص باہر نکلا۔ یہ ایک چائے خانہ تھا جس میں بیٹھے کچھ سڑک چھاپ لوگ میلے کپڑوں میں ملبوس ایک اخبار کے ملگجے ورقوں کی کھینچا تانی کر رہے تھے۔ ان سے کافی دور ایک ملک میں لاکھوں نوجوان اچانک اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور اپنے اوپر تیس برس سے مسلط حاکم کو نکال باہر کیا تھا۔ چائے خانے میں کڑک دودھ پتی کی چائے پیتے اور میز پر گراتے بہر حال چائے خور اس پر بہت مسرور تھے۔ وہ قہقہے لگا کر ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار رہے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ اخبار میں کئی دنوں سے مسلسل آنے والی ان خبروں پر وہ بہت خوش ہیں اور دوردراز کے ملک کے نوجوانوں کے ساتھ ہیں۔

وہ ایک ابر آلود دن تھا۔ سمندر سے آتی گیلی اور نمکین ہوا کے تیز جھونکوں نے میلی سڑک، چائے خانے، اخبار اور اخبار کی کھینچا تانی کرنے والوں کو چپچپا اور نمکین بنا رکھا تھا۔ سمندر کی گہری سرمئی مضطرب لہروں میں کسی دوسرے براعظم کا جہاز وسیع اور گہری ریتیلی بندرگار سے آہستہ آہستہ دور جا رہا تھا۔ ابھی سہ پہر تھی لیکن جھکے ہوئے بھورے بادلوں نے روشنی گم کر دی تھی اور بحری جہاز میں قمقمے روشن کر دیئے گئے تھے جو چھپا چھپ کرتی، اٹھتی گرتی لہروں میں ٹوٹتی اور بنتی زرد چمکتی ہوئی کرچیوں کی طرح منعکس تھے۔ بندرگار کے پھوار سے بھیگے اداس دھندلکے میں جوڑوں کے درد کا مارا ایک معمر بار بردار ایک بوتل میں جہازی تیل لیئے ہوئے دھیرے دھیرے اپنے گھر جانے والی بس کے اڈے کی طرف لنگڑاتا ہوا جا رہا تھا۔ اس کے حکیم نے اسے بتایا تھا کہ مشین میں لوہے کی رگڑ کھانے والا تیل لوہے کی خاصیت جذب کر لیتا ہے اور جوڑوں کے درد یا گٹھیا میں بہت مفید ہوتا ہے۔ اسی لیے اس بار لنگر ڈالنے والے جہاز کے کارندوں کی خوشامد کر کے اس نے بوتل بھر استعمال شدہ تیل جمع کر لیا تھا۔

چائے خانے کے باہر زور زور سے بتیاتے چائے پیتے گاہکوں کے قریب چپچپاتی سڑک کے ایک گٹر کے کنارے یہ سیاہ فام آدمی جس کے آباؤ اجداد کو غالباً غلام بنا کر اس خطے میں لایا گیا تھا یا ہوسکتا ہے کہ وہ بحری جہازوں کے سیاہ فام کارندوں کی نسل سے ہو جو ایک ڈیڑھ صدی سے اس علاقے کے ساحل سے، مشرق اور شمال کے سمندروں میں جہازرانی کرتے رہتے تھے صرف ایک لنگوٹی کسے کھڑا تھا اب کئی برس سے وہ اس شہر میں جس کے وہ اور اس کے اجداد قدیم ترین باسی تھے، ہر قسم کے چھوٹے موٹے کام کرتا رہتا تھا۔ اس کے سخت گھنگریالے بال سفید ہو رہے تھے اور سیاہ آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔ لیکن چونکہ وہ ان گلیوں میں اور سڑکوں پر گھومتا پھرتا تھا اس لیے اس کے مقامات سے خوب واقف تھا۔ سرکاری گاڑی کے سوار کے پوچھنے پر اس نے ہاتھ سے اشارہ کر کے اپنی مخلوط اور دلچسپ ایک طرح کی مزاحیہ بولی میں اسے بتایا تھا کہ شہر کا قومی عجائب گھر کہاں ہے اور یہ بھی کہ تنگ گنجان گلیوں کی بھول بھلیوں سے وہ کیسے نکل کر بڑی سڑک تک پہنچ سکتا ہے۔

شاید یہ نزدیک ہی سیاہ فام آبادی کی قدیم آبادی سے آیا ہو! سرکاری گاڑی کے سوار نے سوچا تھا اور اسے خیال آیا تھا کہ ستم رسیدہ، الم گزیدہ شاعر بے روزگاری کے زمانے میں اسی آبادی کے ایک یتیم خانے جیسے کالج میں پرنسپل رہا تھا۔ اس کے بعد حالات نے اسے دوبارہ وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا اور وہ لکیریں پھلانگتا ہوا آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

دوبارہ اپنی غم زدہ، مضطرب اور پرتاثیر شاعری کرنے اور پرزوں پر لکھ لکھ کر انہیں خطوں کی طرح بھیجتے رہنے کے لیے۔

جب سرکاری گاڑی شہر کے قومی عجائب گھر پہنچی تو وہاں ابھی تقریب کے مہمانوں میں سے کوئی نہ پہنچا تھا۔ گاڑی رکوا کر گاڑی میں سوار ہونے والے شخص نے تھوڑی دیر چہل قدمی کی۔ عجائب گھر کی اندرونی عمارت کے گرد ایک وسیع احاطہ تھا جس میں املتاس اور گل مہر کے درخت لگے تھے اور زمین پر دور دور تک ایسا جھاڑ جھنکار تھا جو گھانس ہوسکتا تھا جو زرد اور بری طرح اجڑی ہوئی تھی۔ درختوں کی شاخوں پر کوؤں اور چیلوں کا بسیرا تھا۔ زمین پر پلاسٹک بیگ اور بچے ہوئے آلو کے قتلے اور گوشت اور ڈبل روٹی کے ذرے بکھرے تھے۔ کوؤں اور چیلوں کی جھپٹتی غوطہ خوری سے گھبرا کر سرکاری ادارے کے اس نمائندے نے سوچا کہ وہ تقریب کے شروع ہونے کے انتظار کا تھوڑا سا وقت عجائب گھر میں کیوں نہ گزارے۔

اس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔ عجائب گھر بند ہونے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی

تھا۔ جب وہ اس بارعب، تازہ تعمیر چکنے روغنی ٹائلوں سے مزین عمارت میں داخل ہوا تو سب سے پہلے اس کی نظر سامنے دیوار پر نیلے اور لاجوردی سنگریزوں سے تحریر اس عبارت پر پڑی جو اس ملک کی آبادی کے آسمانی صحیفے سے اخذ تھی۔ یہ وہی زبان تھی جو اس ملک میں خلیج سے پار اس ملک کی بولی تھی جہاں کے نوجوان لاکھوں کی تعداد میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے جس پر گنجان گلیوں کے چائے خانے میں آنے جانے والے بہت خوش تھے۔ اس زبان کو سمجھنے، یا لکھ پڑھ سکنے والے لوگ اس ملک میں شاید چند ہزار سے زیادہ نہ ہوں جو ایک وسیع وعریض خطے میں جہاں تہاں بکھرے ہوئے تھے اور اپنی استعداد صرف آسمانی صحیفے کو پڑھنے اور پڑھانے تک ہی محدود رکھتے تھے۔ ملک کے عام لوگ اسی زبان سے چنداں واقف نہ تھے۔ لیکن سطر کے نیچے اس ملک کی قومی زبان میں اس کا ترجمہ بھی لکھا تھا جو اس ملک کے کسی خطے کی اپنی قدیمی زبان نہیں تھی لیکن ان مقتول اولین صدر کی زبان تھی جن کے نام کا تمغہ وصول کرنے سرکاری شخص یہاں آیا تھا۔ اس زبان کو ملک کی آبادی سمجھ سکتی تھی اور سرکاری شخص بھی پڑھ سکتا تھا کہ دیوار پر لکھا تھا۔ ''خدا جسے چاہتا ہے اسے مٹا ڈالتا ہے اور جسے چاہتا ہے اسے قائم رکھتا ہے۔''

سرکاری آدمی نے سوچا کہ صحیفے کی یہ سطر لوگوں کو عبرت دلانے کے لیے لکھی گئی ہے۔ شاید ان کا اشارہ کئی ہزار برس قدیم مورتیوں وغیرہ کے لیے ہو جو کھدائی پر برآمد ہوئیں اور میوزیم کے اندر ہوں گی۔ اب وہ اندر جانا چاہتا تھا لیکن داخلے کے ٹکٹ فروخت کرنے والی میز پر کوئی نہیں تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر نظر ڈالی۔ سفید و سیاہ شطرنجی فرش کے دائیں طرف عجائب گھر کے دس بارہ کارندے موجود تھے۔ لیکن وہ سب رکوع و سجود میں مشغول تھے اور خدا کی عبادت کر رہے تھے۔ (اس ملک میں اور اس مذہب کے پیروکاروں میں طلوع آفتاب سے لے کر غروب آفتاب اور اس کے بعد بہت دیر تک پانچ مرتبہ خدا کی عبادت کی جاتی تھی۔) اس پر سرکاری آدمی کو خیال آیا کہ وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو جائے۔ لیکن اس اثنا میں عمارت کے آڈیٹوریم سے ایک شخص اسے بلانے آ پہنچا کیونکہ تقریب اب شروع ہونے والی تھی۔

سرکاری آدمی چالیس کے پیٹے میں تھا اور یہ دیکھ کر کچھ مضطرب ہو رہا تھا کہ تقریب کے ہال میں حاضری نہ صرف برائے نام تھی بلکہ زیادہ تر آنے والے نوے برس سے زیادہ عمر کے معلوم ہو رہے تھے۔ اسے خیال آیا کہ ملک کے اولین صدر کو نہایت سرعت بلکہ عجلت میں بھلایا گیا تھا۔ ملک کے حالات بعدازاں تیز رفتاری سے دوڑتے رہے تھے۔

سرکاری آدمی کو اسٹیج پر بٹھا دیا گیا۔ اس کے علاوہ اسٹیج پر رکھی ہوئی آرام کرسیوں پر ایک کہنہ سال سابق وزارت خارجہ کے سیکریٹری بیٹھے تھے جو نیم خوابیدہ معلوم ہو رہے تھے۔ ان کے ساتھ کی کرسی پر ایک سن رسیدہ صاحب ایک سیاہ چھڑی کی موٹھ پر سر ٹکائے بیٹھے تھے ایک ادھیڑ عمر لایق و فایق اور ہنوز دلکش خاتون ان کے دائیں طرف کی کرسی پر بیٹھی تھیں جو سابقہ حکومتوں کے اعلیٰ ترین سرکاری عہدوں پر فائز رہی تھیں لیکن آج کل فارغ تھیں۔ ان کے بعد ایک شریف صورت معمر شخص بیٹھے تھے اور پھر سرکاری شخص کی کرسی تھی جس کی دوسری جانب آخری کرسی پر ایک عمر رسیدہ شخص متمکن تھے جن کی بھاری سفید مونچھیں متانت سے ان کی ٹھوڑی کی سمت چہرے پر آویزاں معلوم ہو رہی تھیں۔ ہال میں روشنی مدھم اور زرد سی تھی۔ سرکاری شخص نے نظریں دوڑائیں تو اسے بائیں طرف نیم تاریک دیوار پر ایک بڑا سا پرچم لٹکا نظر آیا جس پر اس نے خشک ہونٹ چباتے ہوئے دیکھا کہ اسی الم نصیب اور دردمند شاعر کا ایک شعر بڑے بڑے حروف میں لکھا تھا جسے مقتول اولین صدر کے زمانے میں گرفتار کرلیا گیا تھا۔ سرکاری شخص اس شعر سے واقف تھا کیونکہ اسے ملک کے کئی گلوکاروں نے سریلی آوازوں میں گایا تھا۔ پرانے زمانوں کی یہ کیسٹیں اس کی ماں کے موسیقی کے ذخیرے میں موجود تھیں جن کو موسیقی سے دلی لگاؤ تھا۔ اب ان کے سی ڈیز بن گئے تھے جو سرکاری شخص نے بھی خرید لیے تھے۔ رات گئے بہت دیر تک چلنے والی ڈنر پارٹیز میں ان سی ڈیز کو بجانا تہذیب و تمدن اور اعلیٰ طبقے کے ذوق کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ یہ اشعار اس نے جیل کے کسی کمرے میں بند کیے جاتے تالے میں کنجی گھومنے کی آواز سننے کے بعد یا دور کسی پردیس میں آخری ملاقاتی سے وطن کے احوال سننے پر کسی پرائے گھر کی خواب گاہ کی اداس ٹمٹماتی روشنی میں کاغذ پر اتارے تھے۔ سمندروں کے پار دوسرے براعظموں میں اس کے متمول ہم وطن اس کی میزبانی خوشی سے کرتے تھے کیونکہ وہ غیر معمول طور مقبول اور محبوب تھا۔ جس کے بعد اسے اپنا ٹھکانہ کہیں اور ڈھونڈنا ہوتا تھا۔

سرکاری شخص نے ہاتھ کے اشارے سے منتظمین سے پانی مانگا۔ ایک نوجوان کارندہ اس کے لیے منرل واٹر کی چھوٹی بوتل لایا اور اس کا تعارف اس کے دائیں بائیں بیٹھی شخصیتوں سے کرایا کہ دراصل وہ مقتول اولین صدر کے بیٹے ہیں۔

یہ معلوم کر کے سرکاری شخص حیرت زدہ پوری طرح چوکنا ہوگیا۔ کیا واقعی! اس نے سوچا اور دونوں کو غور سے دیکھا۔ اولین صدر کب اور کیوں قتل کیے گئے تھے۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش

کی۔ ایک نئے بنائے ہوئے ملک کے اولین صدر ..... لاکھوں لوگوں کی ہجرت، خون کے بہتے دریا، اس ساحلی شہر میں خیموں اور جھونپڑیوں کی قطاریں جو راتوں رات اگ رہی تھیں۔

اس دن آسمان صاف تھا جب اولیں صدر ایک چھوٹے سے ہوائی جہاز میں اس ساحلی شہر سے کافی دور ایک بڑے جلسے کو خطاب کرنے روانہ ہوئے تھے۔ ان کی خوبصورت اور ملکی معاملات، خصوصاً عورتوں کی آزادی میں بہت دلچسپی رکھنے والی بیگم نے دو چھوٹے بچوں کے ساتھ انہیں الوداع کہا تھا۔ اس امید کے ساتھ کہ وہ رات تک یا دوسری صبح واپس آ جائیں گے۔

لیکن اس سہ پہر ان کی زندگیوں میں سب کچھ بدل جانے والا تھا۔ اس بڑے جلسے میں جہاں دریا کی طرح لہریں لیتا مجمع زندہ باد کے نعرے لگا رہا تھا، ملک کے اولین صدر کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

سرکاری شخص کو اپنی ماں کے سنائے ہوئے قصے یاد آ رہے تھے کہ اولیں صدر کے قتل پر کسی قدر کہرام مچا تھا، جو زیادہ تر ان ہی لوگوں میں تھا جو مقتول صدر کی طرح لکیروں کے پار سے آئے تھے۔ وہ سر پیٹتے تھے اور روتے تھے اور کہتے تھے ''آج ہم یتیم ہو گئے''۔

بہرحال وہ ایک پورے، نئے بنائے ہوئے ملک کا اولین صدر تھا اور اسے وجود میں لانے کی کوششوں میں بہت سرگرم، اس کی بنیاد ڈالنے والا۔ وہ مقتول صدر کے بیٹوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ اسے یہ محسوس کر کے حیرت ہوئی کہ وہ ان سے بات کرنا چاہتا تھا۔

''جب مرحوم کو قتل کیا گیا'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ تب آپ دونوں تو ..... بہت چھوٹے ہوں گے۔''

''ہاں'' اس کے برابر بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔ میں دس برس کا تھا اور یہ .....'' اس نے گردن سے اشارہ کیا، سات برس کا۔''

''جس نے قتل کیا تھا..... اس کو تو موقعہ پر گولی مار دی گئی تھی۔'' سرکاری شخص کو یاد آیا۔

''جی ہاں۔'' مقتول صدر کے بڑے بیٹے نے کہا۔

ان کے چھوٹے بیٹے نے اچانک بڑے بیٹے سے کہا۔

''تم نے انہیں بتا دیا ہے نا کہ میں کچھ نہیں بولوں گا۔''

''ہاں، ہاں۔'' بڑے بیٹے نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ میں کچھ نہیں بولوں گا۔'' اس نے دُہرایا۔ پھر سرکاری شخص پر نظر ڈال کر کہا۔ ''اس

طرح بہت لمبا ہو جاتا ہے۔''

سرکاری شخص نے کچھ بے چینی سے پہلو بدلا اور کہا۔ ''جو تفتیش ہوئی تھی۔ یعنی جو صاحب تفتیش کر کے لا رہے تھے..... ان کا جہاز بھی گر گیا تھا۔ تفتیش کے کاغذ بھی ان کے پاس تھے۔''

''جی ہاں وہ بھی .....'' بڑے بیٹے نے کہا۔ ''کچھ پتہ نہیں چل سکا کہ اصل مجرم کون ہے۔''

''آپ کی والدہ کو علم ہوگا..... آپ کی والدہ کو۔''

سرکاری شخص بدبدایا، لیکن اس کی بات شاید کسی نے نہیں سنی۔

وہ تھوڑی دیر خاموش رہا۔ پھر تجسس سے پوچھا۔

''آپ دونوں ساتھ رہتے ہیں؟''

''نہیں۔'' بڑے بیٹے نے اس عجیب سے سوال پر چونک کر کہا۔ ''الگ رہتے ہیں۔ اپنے اپنے گھر میں .....''

''تو..... آپ کا کیا مشغلہ ہے۔؟''

مقتول صدر کے بڑے بیٹے نے لحہ بھر رک کر کہا۔ ''اب تو ریٹائرڈ ہوں۔ پہلے میری ایک ٹریولنگ ایجنسی تھی۔''

''ٹریولنگ ایجنسی۔'' سرکاری شخص نے دہرایا۔ ''اور ..... ان کا'' اس نے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کر کے کہا جس پر مقتول صدر کا چھوٹا بیٹا ایک پمفلٹ کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

''ان کا پھولوں کا کاروبار تھا۔''

اچھا.....!''

سرکاری شخص نے کہا۔

''بعد میں تو کچھ نام بھی سامنے آ گئے۔ فلاں اور فلاں اور فلاں .....''۔

''ہوووں'' مقتول صدر کے چھوٹے بیٹے نے کہا۔

سرکاری شخص کو مزید تجسس ہوا۔

''آخر کیوں؟'' اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ اولیں صدر کو قتل کرنے کی وجہ آخر کیا ہو سکتی تھی؟ کیا ان کی ..... پالیسیوں وغیرہ سے کچھ اختلاف .....؟''

''اجی کہاں صاحب۔'' سیاہ چھڑی کی موٹھ پر ٹھوڑی ٹکائے ضعیف العمر شخص اس گفتگو میں شامل ہو گیا۔ ''وجہ تو کہتے ہیں یہ تھی کہ..... سنا ہے مقتول صدر کابینہ میں تبدیلی کرنے والے تھے۔''

سرکاری شخص کو یہ سن کر پہلے پہل دھچکا سا لگا۔ اس کے منہ سے نکلا'' ارے! مقتول صدر کے دونوں بیٹے خاموش بیٹھے رہے۔ چھوٹا بیٹا پمفلٹ پڑھنے میں مستغرق نظر آ رہا تھا۔ جبکہ بڑے بیٹے کی نگاہیں اسٹیج سے نیچے بچھے قالین پر جم گئی تھیں جسے وہ بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

سرکاری شخص بھی کھنکھار کر اسٹیج پر رکھے روسٹرم کو اور پھر مائیکروفون کے تاروں کو غور سے دیکھنے لگا جو لچھے بناتے ہوئے نیچے رکھے سوئچ بورڈ سے ایک پلگ کے ذریعے جڑے ہوئے تھے۔

جب اس کے ادارے کے نام کا اعلان ہوا تو وہ مقتول صدر کے دونوں بیٹوں کے ہاتھوں سے تمغہ وصول کر کے تقریباً فوراً ہال سے باہر آ گیا۔ اس نے سیل فون پر سرکاری گاڑی کے ڈرائیور کو بلایا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور اس بات پر ناخوش تھا کہ اس نے چائے کا انتظار نہیں کیا تھا جس میں کھانے پینے کی دوسری اشیا بھی میزوں پر رکھی نظر آ رہی تھی۔

تم اپنا حصہ لے آؤ۔ گھر چل کر میں جب چائے بھیجوں تو کھا لینا۔

ڈرائیور ایک کاغذ کا پلیٹ پر سینڈوچ اور معمولی کیک کے ٹکڑے رکھ کر واپس آیا۔ پلیٹ اس نے سامنے کی خالی سیٹ پر رکھ دی اور سرکاری گاڑی ایک موڑ کاٹ کر احاطے کے چوبی دروازے سے باہر نکل آئی۔

انیس اشفاق

ویران مقبروں کے مسافر

ویران میدانوں سے گزرتے ہوئے اچانک ایک مقام پر میں رکا۔ میری نگاہ راہ کے ایک پتھر پر ٹکی جس پر یہ عبارت کندہ تھی: ''یہ راستہ ان مقبروں کی طرف جاتا ہے جہاں سوگواروں کو مارا گیا تھا''۔ عبارت پڑھ کر میں آگے بڑھا ہی تھا کہ ایک آواز نے مجھے روکا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو سیاہ لباس میں ملبوس ایک عورت میرے سامنے کھڑی تھی۔

''تم نے عبارت پڑھی''۔ میرے مڑتے ہی اس نے پوچھا۔

''پڑھی''۔ میں نے کہا۔

''پھر''؟ اس نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں خاموش رہا۔'' اس نے پھر پوچھا:

''اس طرف جاؤ گے؟''

''کس طرف؟''

''جہاں لوگوں کو مارا گیا تھا۔''

''انھیں کیوں مارا گیا تھا؟''

''انھوں نے مرنے والوں کا سوگ کیا تھا۔'' اس نے کہا: پھر کہا۔ ''جس دن انھوں نے سوگ کیا اسی دن انھیں مارا گیا۔'' پھر پوچھا: تم جاؤ گے اس طرف؟۔

''جاؤں گا۔'' میں نے بے خیالی میں کہہ دیا۔

''تو چلو میرے ساتھ۔''

میں اس عورت کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ کچھ ہی دیر میں ہم ان مقبروں میں پہنچ گئے۔ میں دیر

تک اس عورت کے ساتھ ان ویران مقبروں میں گھومتا رہا۔ یہ مقبرے ایک بڑے میدان میں تھوڑی تھوڑی دور پر بنے ہوئے تھے۔ میدان کے چاروں طرف دیواریں تھیں جن میں جگہ جگہ شگاف تھے۔ انھیں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ اب گرنے ہی والی ہیں۔ مقبروں کے میدان میں چاروں طرف جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ انھیں جھاڑیوں میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر وہ پیڑ کھڑے تھے جنھیں کبھی مقبروں کی زمینوں کو ہرا بھرا رکھنے کے لیے لگایا گیا تھا لیکن اب یہ پیڑ جنگلی بیلوں کی لپیٹ میں تھے اور یہی بیلیں مقبروں کے اُن گنبدوں کو لپیٹے ہوئے تھیں جو برسوں کی دھوپ کھا کھا کر سیاہ پڑ چکے تھے۔ میں نے ان مقبروں کو چاروں طرف سے گھوم گھوم کر دیکھا۔ پھر اُن کے سنگی چبوتروں کی اُن سیڑھیوں پر چڑھ کر جن کے جوڑوں میں گھاس اُگ آئی تھی، اُن کٹاؤدار جالیوں سے اندر جھانکا جو مقبروں کی تعمیر کے وقت بہت خوبصورتی سے بنائی گئی تھیں۔

مقبروں کے اندر روشنی زیادہ نہیں تھی لیکن میں دیکھ سکتا تھا کہ اُن کے فرش خاک سے اٹے ہوئے ہیں اور قبروں کی جالیوں پر گرد کی تہیں جمی ہوئی ہیں۔ چھتوں پر جگہ جگہ جالے ہیں اور طاقوں میں فاختاؤں نے اپنے آشیانے بنا لیے ہیں۔ کچھ کچھ دیر بعد ان کے اندر مجھے ابابیلیں بھی چکر لگاتی ہوئی نظر آئیں۔ سیڑھیوں سے اتر کر میں نے مقبروں کے گنبدوں کو دیکھا اور ان کی ایک سی گولائیوں کو دیکھ کر مجھے ان کے بنانے والوں پر حیرانی ہوئی۔ کبھی یہ دور سے بہت صاف۔ اور چمکتے ہوئے نظر آتے ہوں گے لیکن اب ان پر جنگلی کبوتروں کے ڈیرے تھے۔ میں ان کبوتروں کو گنبدوں کے اوپر ٹکڑیوں کی شکل میں اُڑتے ہوئے اور کچھ کچھ دیر بعد انھیں گنبدوں پر جھنڈوں کی شکل میں اترتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میں نے سوچا: ''زمانوں کے ساتھ سب کچھ بدلتا رہا ہوگا''۔ مقبروں کے اندر آشیانے بنانے والی فاختائیں، چکر لگاتی ہوئی ابابیلیں، گنبدوں پر اڑتے اور اُن پر اترتے ہوئے کبوتر۔

میں گنبدوں کے اوپر کبوتروں سے بھرے ہوئے آسمان کو دیکھ رہا تھا، اسی وقت میری پشت سے ایک آواز آئی۔

''دیکھ چکے''؟

میں پیچھے مڑا تو وہی سیاہ پوش عورت کھڑی تھی جس نے ان مقبروں تک میری رہنمائی کی تھی۔

''دیکھ چکا۔'' میں نے کہا۔ پھر پوچھا: ''مگران کی قبریں کہاں ہیں۔''

''ان کی قبریں نہیں ہیں۔'' اس نے کہا۔ پھر بولی: جس دن انھیں مارا گیا تھا، مقبرے کا

میدان لاشوں سے بھر گیا تھا۔ پھر اسی لہجے میں کہا: انھیں ان مقبروں کی زمینوں پر جلا دیا گیا۔'' پھر مقبروں کی دیواروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی'' یہ سیاہی دیکھ رہے ہو؟''

''دیکھ رہا ہوں۔''

''یہ انھیں کی جلی ہوئی لاشوں کا دھواں ہے جو ان دیواروں پر جم گیا ہے''۔ اس نے کہا۔

میں دیواروں پر جمی ہوئی سیاہی کو دیکھتا ہوا مقبروں کی چہار دیواری سے باہر آنے لگا تو سیاہ پوش عورت نے میرے پیچھے آتے ہوئے مجھ سے پوچھا: ''کہاں جا رہے ہو''؟

''باہر۔'' میں نے کہا۔ مجھے آگے جانا ہے۔

''آج یہیں ٹھہرو۔''

''کیوں؟''

''وہ رات کے اندھیرے میں روز یہاں آتے ہیں''۔ اس نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔

''کون؟''

''سوگوار۔''

''وہ تو مارے جا چکے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''یہ نئے سوگوار ہیں۔'' اس نے کہا۔ پھر بولی: ''یہ مارے گئے سوگواروں کا سوگ منانے آتے ہیں۔''

''انھیں بھی مارا جائے گا؟'' میں نے پوچھا۔

سیاہ پوش عورت خاموش رہی۔

''مجھے آگے جانا ہے۔'' میں نے پھر کہا۔

''تم کس طرف سے آ رہے ہو۔''

''شہر کی طرف سے۔''

''کون سا شہر؟''

''نام نہیں معلوم۔''

''نام نہیں معلوم؟'' اسے حیرانی ہوئی۔

''اس شہر کا کوئی نام نہیں ہے۔''

''کیوں؟''

''نہیں معلوم۔''میں نے کہا۔''ہم اسے شہر کہتے ہیں۔''

''وہاں کتنے لوگ رہتے ہیں۔''اس نے پوچھا۔

''کوئی نہیں۔''

''کوئی نہیں؟''اسے پھر حیرانی ہوئی۔

''وہ شہر مکینوں سے خالی ہے۔ہم اس کی پہچان مکانوں سے کرتے ہیں۔''

''کتنے مکان ہیں وہاں''

''نہیں معلوم۔وہاں مکان گنے نہیں جاتے۔''

''کیوں؟''

''مکانوں کی گنتی کرنے والے مارے جاتے ہیں۔''

''تم وہاں سے کب نکلے تھے؟''

''جب انھیں مارا جا رہا تھا۔''

''کنھیں؟''

''مکان گننے والوں کو۔''

''کتنے لوگ مارے گئے؟''

''معلوم نہیں۔''

''مارنے والے کون تھے؟''

''یہ بھی نہیں معلوم۔''

''تمھارے سوگواروں کو کس نے مارا''؟ میں نے پوچھا۔

''مجھے بھی نہیں معلوم ۔مارنے والے نظر نہیں آتے۔''

''دن ڈھل رہا ہے۔مجھے آگے جانا ہے''۔میں نے اسے یاد دلایا۔

''میں نے کہا نا آج یہیں ٹھہرو۔رات ہوتے ہی سوگوار آنا شروع ہو جائیں گے۔''

میں خاموش رہا اور رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

اندھیرا پھیلتے ہی ان ویران مقبروں میں سوگوار آنے لگے۔ وہ سب سیاہ لباس میں ملبوس تھے۔ احاطے میں ایک قطار بنا کر وہ دیر تک خاموش کھڑے رہے۔ پھر انھوں نے باری باری ان

مقبروں کا طواف کیا۔ پھر مقبروں کے چبوتروں پر چراغ روشن کیے۔ چبوتروں کی زمینوں پر اُن کی آہٹیں پا کر مقبروں کے اندر موجود ابابیلیں اپنے پروں کو پھڑ پھڑاتی ہوئی ادھر سے اُدھر اڑنے لگیں۔ چبوتروں پر جلتے ہوئے چراغوں کی لویں تیز ہواؤں میں دیر تک نہیں ٹھہر سکیں اور کچھ دیر بعد خاموش ہو گئیں۔ چراغوں کے بجھتے ہی سوگوار بھی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ کہاں گئے، چبوتروں کی طرف بڑھنے لگا تو سیاہ پوش عورت نے مجھے روکا:

''فضول ہے۔''

میں نے مڑ کر اس سے پوچھا: ''وہ سب کہاں گئے''

''مارے گئے۔''

''کس نے مارا؟''

''میں نے کہا نا مارنے والے نظر نہیں آتے۔''

''ان کی لاشیں؟''

''اٹھا لی گئیں۔''

''میں نے انھیں مرتے ہوئے نہیں دیکھا۔'' میں نے کہا۔

''اور نہ ان کی لاشوں کو اٹھتے ہوئے۔'' اب یہی کہو گے۔

''ہاں۔''

''وہ بڑی خاموشی سے مارے جاتے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''پہلے ان کی لاشیں اسی احاطے میں جلا دی جاتی تھیں۔ اب اٹھا کر کہیں اور لے جائی جاتی ہیں۔'' اس نے مزید کہا۔

''کہاں؟''

''یہ نہیں معلوم۔ کل نئے سوگوار آئیں گے۔ کئی دن وہ اسی طرح آئیں گے اور ایک دن اسی طرح مار دیے جائیں گے۔''

''تمھیں آگے جانا ہے۔'' اس نے مجھے یاد دلایا۔

''ہاں۔''

''نکل جاؤ، ورنہ تم بھی مارے جاؤ گے۔''

''میں ان کا سوگوار نہیں ہوں۔''

''لیکن میں ان کی سوگوار ہوں اور تم میرے ساتھ ہو۔''

''تمھیں اب تک نہیں مارا گیا۔؟''

''میں سوگواروں میں شامل نہیں ہوتی۔''اس نے کہا۔''جب وہ سب مار دیے جاتے ہیں اور جب مارنے والے یہاں سے چلے جاتے ہیں تو میں اکیلے ان کا سوگ مناتی ہوں۔''پھر بولی: ''اب تم جاؤ۔ میں انھیں یاد کروں گی''۔

میں مقبروں کے احاطے سے باہر نکلنے لگا تو اس نے مجھ سے پوچھا؛

''لیکن جاؤ گے کس طرف؟''

''آگے ایک شہر ہے، اس طرف۔''

''تمھارا شہر؟''

''نہیں میرا کوئی شہر نہیں۔''

''وہاں کیوں جا رہے ہو''

''جب ایک شہر چھوڑنا پڑتا ہے تو۔ ۔ ۔''میں کہتے کہتے رک گیا۔

''تو؟''

''دوسرے شہر کا رخ کرنا پڑتا ہے۔''میں نے جملہ مکمل کیا۔

''جاؤ۔''اس نے کہا۔ میں چلنے لگا تو اس کی آواز پھر آئی:

''کبھی وہاں سے لوٹنا تو اس طرف ضرور آنا۔ میں یہیں ملوں گی''۔''لیکن تب تک بہت لوگ مارے جا چکے ہوں گے''۔ میں نے کہا۔

''ہاں۔لیکن جب تک وہ مجھے نہیں مارتے، میں مارے جانے والوں کا سوگ مناتی رہوں گی۔''

میں آگے بڑھ گیا۔ کچھ دیر چلنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ وہ اپنی جگہ پر کھڑی ہے اور مجھے جاتا ہوا دیکھ رہی ہے۔

میں نے ان مقبروں کو سورج نکلنے سے پہلے چھوڑ دیا تھا۔ دن بھر میں سفر کرتا رہا۔ شام ہوتے ہوتے میں ایک ایسے سنسان مقام پر پہنچا جہاں کئی خیمے لگے ہوئے تھے۔ میں خیموں کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ ہر خیمے کے اوپر ایک سیاہ پرچم لگا ہے اور ہر خیمے کے باہر راکھ کے ڈھیر موجود ہیں اور ان میں کچھ ادھ جلی لکڑیاں۔

''کسی قافلے نے شاید ابھی کوچ کیا ہے''۔ میں نے سوچا۔

لیکن خیمے کیوں نہیں اٹھائے گئے۔ میں نے پھر سوچا۔ یہی سوچتے سوچتے میں اُن خیموں

کے اندر داخل ہوا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ نہ خیمہ دار نہ ان کا ساز و سامان ۔لیکن آخری خیمے سے نکلتے وقت مجھے ایک کونے میں سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی کوئی چیز نظر آئی۔ اسے دیکھتے ہی میں پھر خیمے میں داخل ہوا۔ اور اب مجھے محسوس ہوا کہ اس چادر کے اندر کوئی انسانی وجود ہے۔

''کون ہے؟''میں نے پوچھا۔

''دعا کرنے والی۔'' سیاہ چادر کے اندر سے آواز آئی۔

لیکن تم ہو کون؟

''دعا کرنے والی۔''چادر کے اندر سے پھر آواز آئی۔اس بار چادر میں حرکت ہوئی اور اس کے اندر موجود شے ایک مکمل انسانی وجود میں تبدیل ہوگئی۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا:

خیمے خالی کیوں ہیں؟

''انھیں خیمے چھوڑ کر جانا پڑا۔''

''کیوں؟''

''نہ جاتے تو مارے جاتے۔''

''وہ سب کدھر گئے؟''

''نہیں معلوم۔''

''تمھیں چھوڑ کر چلے گئے؟''

''میں ان میں سے نہیں ہوں۔''

''مگر تم انھیں کے خیموں میں ہو۔''

''یہ خیمے ان کے نہیں ہیں۔''

''پھر کس کے ہیں؟''

''ان کے جو ان خیموں میں نہیں رہ سکے، میں انھیں میں سے ہوں۔''

''جو نہیں رہ سکے وہ کہاں ہیں؟''

''مارے گئے۔''

''جو خیموں میں رہے اور چھوڑ کر چلے گئے وہ کہاں ہیں؟''

''نہیں معلوم بتا تو چکی ہوں۔''

''لیکن وہ پرائے خیموں میں کیوں رہے۔؟''

''یہاں انھوں نے پناہ لی تھی۔ وہ جہاں سے آئے تھے وہاں انھیں مارے جانے کا ڈر تھا۔''

''وہ کہاں سے آئے تھے؟''

''نہیں معلوم۔''

''تم یہاں کیوں ہو؟''

''جو مارے گئے انھیں روتی ہوں۔ جو نکل گئے ان کے لیے دعا کرتی ہوں۔''

''جو چلے گئے وہ آئیں گے؟۔''

''زندہ رہے تو ضرور آئیں گے''۔ اس نے کہا۔ پھر کہا: اب تم جاؤ میں ان کے لیے دعا کروں گی۔''

میں دعا کرنے والی کو ان ویران خیموں میں اکیلا چھوڑ کر آگے نکل آیا لیکن یہ بھول گیا کہ مجھے کس طرف جانا ہے۔ بڑی دیر تک میں ایک جگہ پر کھڑا سوچتا رہا کہ مجھے کس طرف جانا ہے۔ اور پھر میں یہ بھی بھول گیا کہ میں نے سفر شروع کہاں سے کیا تھا۔ پھر مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ میرا ٹھکانہ کہاں تھا۔

میں چل رہا تھا اور چلتا جا رہا تھا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میرا گلا سوکھ رہا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ میں کسی سامان کے بغیر سفر پر نکلا تھا۔ میرے سر پر سورج پوری طرح چمک رہا تھا۔ پیاس کی شدت سے میری زبان باہر نکلی آ رہی تھی۔ مجھے پانی کی تلاش تھی۔ میں نے اپنے چاروں طرف نگاہ دوڑائی لیکن پانی کا ٹھکانہ کہیں نہیں تھا۔ چلتے چلتے میرے پاؤں جواب دینے لگے تھے۔ میرے لیے ضروری تھا کہ میں کچھ دیر سائے میں ٹھہر کر آرام کروں لیکن سایہ کہیں نظر نہ آتا تھا۔ مجھ پر غشی طاری ہو رہی تھی، اسی عالم میں مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک سایہ دار درخت کے نیچے لیٹا ہوا ہوں اور ایک شخص پانی سے بھری ہوئی مشک کا دہانہ کھول کر مجھے پانی پلا رہا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کتنی دیر بیہوش رہا لیکن جب مجھے ہوش آیا تو منظر کچھ اور ہی تھا۔ میرا گلا پہلے ہی کی طرح سوکھا ہوا تھا اور میرے مونہہ سے پانی... پانی کی آواز نکل رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ میرے چاروں طرف کچھ لوگ سرخ پوشاکوں میں ملبوس ہاتھوں میں ننگی تلواریں لیے کھڑے ہیں۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر گرجدار آواز میں مجھ سے پوچھا:

''کس طرف سے آ رہے ہو؟''

''کسی طرف سے نہیں۔ میں نے کہا''۔

''تمھیں بتانا ہوگا کہ تم کس طرف سے آ رہے ہو۔''اس بار اس نے تلوار میری گردن پر رکھتے ہوئے پہلے سے بھی زیادہ بلند آواز میں کہا۔

میں خوف سے لرز رہا تھا لیکن میری آنکھیں اب پوری طرح کھل چکی تھیں اور آس پاس کے منظر مجھے صاف نظر آنے لگے تھے۔ میں شاید کسی قلعے میں تھا جس کے چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں تھیں اور اس کی فصیل بہت دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ جس شخص کی تلوار میری گردن پر تھی وہ شاید ان سرخ پوشوں کا سردار تھا۔

''پانی... بہت پیاسا ہوں'' سردار کی بات کا جواب دینے کے بجائے میں نے پانی طلب کیا۔ ''ملے گا۔ لیکن پہلے بتاؤ کہ تم آ کس طرف سے رہے ہو۔'' سرخ پوشوں کا سردار اب کے اور غضبناک ہوتے ہوئے بولا۔

''بتاتا ہوں۔ لیکن پہلے یہ تلوار میری گردن پر سے ہٹاؤ اور مجھے تھوڑا پانی پلاؤ''۔

سرخ پوشوں کے سردار نے تلوار میری گردن سے ہٹاتے ہوئے مجھے پانی پلائے جانے کا حکم دیا۔ فوراً ہی ایک طشت میں پانی سے بھرے ہوئے کئی کوزے میرے سامنے رکھ دیے گئے۔ میں نے جی بھر کر پانی پیا اور سیراب ہوتے ہی اپنی بات کہنا شروع کی:

''میں ان ویران مقبروں کی طرف سے آ رہا ہوں جہاں شام ہوتے ہی ایک سوگوار عورت اپنے مرنے والوں کا سوگ مناتی ہے اور میں اُن اجاڑ خیموں کی طرف سے آ رہا ہوں جہاں سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی ایک عورت مر جانے والوں کے لیے روتی ہے اور بچ کر نکل جانے والوں کو لیے دعا کرتی ہے۔''

میں آگے کچھ اور کہنے والا تھا کہ سرخ پوشوں کے سردار نے مجھے بیچ ہی میں روک دیا۔ میں نے دیکھا کہ تلوار کے قبضے پر اس کی گرفت مضبوط ہو رہی ہے اور اس کی آنکھوں میں خون اتر رہا ہے۔ سردار کے ساتھ ساتھ میں نے دوسرے سرخ پوشوں کی آنکھیں بھی لال ہوتے ہوئے دیکھیں۔ کچھ دیر تک وہ سب ایک دوسرے کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے رہے پھر اس گہرے سکوت میں سردار کی آواز گونجی:

''تم ہمیں ان جگہوں تک پہنچا سکتے ہو؟''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں وہ جگہیں پہچانتا ہوں لیکن وہ علاقے نہیں پہچانتا جہاں میں

نے انھیں دیکھا تھا''۔

''تم وہاں کیوں جانا چاہتے ہو؟'' میں نے سردار سے پوچھا۔ ''ہم بچ کر نکل جانے والے انھیں لوگوں میں سے ہیں جن کے لیے وہ سیاہ پوش بی بی دعا کرتی ہے''۔ سردار نے کہا۔ پھر کہا: ''مقبروں میں دفن لوگ ہم میں سے تھے اور جو خیموں کے اندر مارے گئے وہ بھی ہمارے ہی لوگ تھے''۔ سردار کی آواز میں غم بھی تھا اور غصہ بھی۔

وہ چپ ہوا تو میں نے کہا: ''لیکن دعا کرنے والی بی بی کہتی تھی جو بچ کر نکل گئے وہ اُن میں سے نہیں ہے۔''

''یہی تو ہم جاننا چاہتے ہیں کہ وہ ہم میں سے نہیں ہے، پھر ہمارے لیے دعا کیوں کرتی ہے۔'' سردار کی آواز میں تجسّس تھا۔

''وہ سمجھتی ہے کہ تم سب بھی مارے جاؤ گے۔'' میں نے کہا۔ پھر اپنی بات کو مزید سمجھاتے ہوئے کہا: '' اور جب تم مارے جاؤ گے تو اسی کے قبیلے میں شمار کیے جاؤ گے اور کیونکہ تم مارے جاؤ گے اس لیے وہ تمھیں اپنے قبیلے کا جان کر تمہاری سلامتی کی دعا کرتی ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے سردار کے چہرے پر نگاہ کی ۔وہ کہیں کھویا ہوا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو۔'' میں نے اسے مخاطب کیا۔

''یہی کہ ہم ان بی بیوں سے کیسے ملیں گے'' سردار چونکتے ہوئے بولا۔

''انھیں مارا جا چکا ہوگا۔'' میں نے کہا۔'' آخر وہ کب تک چھپتی پھریں گی۔''

''ایسا مت کہو۔'' سردار لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ پھر بولا: ''ان کا زندہ رہنا ضروری ہے۔''

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''ان تک پہنچ کر ہم مقبروں کے میدان میں دفن لوگوں کا حال معلوم کریں گے اور ان لوگوں کا بھی حال معلوم کریں گے جو اپنے بنائے ہوئے خیموں میں نہیں رہ سکے اور مارے گئے۔''

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم اس قلعے میں کب سے ہو اور کیوں ہو؟'' میں نے بات بدلتے ہوئے سردار سے پوچھا۔

''جب سے ہم ان خیموں سے نکلے ہیں، ہم نے یہیں پناہ لی ہے'' سردار نے کہا۔ پھر سخت لہجے میں کہا: ''جب تک ہم انھیں مار نہیں لیں گے، یہیں رہیں گے''۔

''کنھیں مار نہیں لو گے؟''

''جنھوں نے ہمیں مارا ہے۔''

سردار کی بات سنتے سنتے میری آنکھوں میں بہت سے بھولے ہوئے منظر گھومنے لگے۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے ایک زمانہ مسافرت میں گزار دیا ہے۔ سفر کے دوران راستوں کو عبور کرتے وقت میں نے طرح طرح کے منظر دیکھے تھے اور بہت سے منظروں کو دیر تک دیکھنے کے لیے میں نے اپنا سفر موقوف بھی کر دیا تھا۔ ان منظروں کو دیکھنے کے لیے میں نے اُن مقامات پر قیام کیا اور دوسروں کی آنکھوں میں آئے بغیر میں وہ سب کچھ دیکھتا رہا جسے یاد رکھنے اور دیر تک یاد رکھنے میں اذیت اٹھانے کے سوا میرے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔

میں سفر کرتا رہا لیکن مجھے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ میں کن راستوں پر سفر کر رہا ہوں۔ نا معلوم راستوں پر سفر کرتے ہوئے مجھے ایک زمانہ گزر گیا۔ پھر انھیں راستوں پر ایک منزل ایسی آئی جہاں بہت سے لوگ کسی طرف جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر میں رکا اور ان میں سے ایک سے پوچھا:

''کس طرف جا رہے ہو؟''

''اپنی چھوڑی ہوئی زمینوں کی طرف۔ اس نے جواب دیا۔''

''لیکن اب تو انھیں زمینوں پر تمھیں رہنا ہے۔''

''ہم وہاں رہنے کے لیے نہیں جا رہے ہیں۔''

''پھر؟''

''اُن سے ملنے جو اُن زمینوں کی چھوڑتے وقت ہمارے ساتھ نہیں نکل سکے۔''

''لیکن تم ابھی تک نکلے نہیں؟''

''اُس طرف جانا آسان نہیں ہے۔''

''کیوں؟''

''حاکموں کی طرف سے اجازت بڑی مشکل سے ملتی ہے۔''

''تو اُنھیں اس طرف کیوں نہیں بلا لیتے۔''

''وہاں بھی یہی صورت ہے۔ اس نے کہا۔ اُدھر بھی آسانی سے اجازت نہیں ملتی۔ وہاں سے نکلتے وقت میری ماں وہیں رہ گئی تھی۔ پچھلے برس اس کی موت ہو گئی۔ میں نے اس طرف جانے کی بہت کوشش کی لیکن مجھے یہ کہہ کر روک دیا گیا کہ حالات ٹھیک نہیں ہیں''۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے

ہوئے کہا" اس برس میری بہن کی موت کی خبر آئی ہے۔لیکن ہمیں پھر جانے سے روکا جا رہا ہے۔"

"کیوں؟"

"حالات ٹھیک نہیں ہیں۔" اس نے کہا۔

"تم اسی طرف سے آرہے ہو؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"نہیں۔"

"اس طرف جاؤ گے؟"

"جا بھی سکتا ہوں اور نہیں بھی۔"

"اگر جانا اور دوبارہ اس طرف آنا تو یہ معلوم کرتے ہوئے آنا کہ ان کی قبریں کہاں بنائی گئی ہیں۔"

اس نے مجھے ان ٹھکانوں کے پتے لکھوائے جہاں اس کے متعلقین رہتے تھے۔

کچھ دیر اس مقام پر ٹھہر کر میں وہاں سے آگے نکل آیا اور انجانی منزلوں کی طرف آگے بڑھتا رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کس طرف جا رہا تھا۔سمتوں کا بھی مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ چلتے چلتے شام ہوگئی اور مجھے نیند آنے لگی۔

میں نے کھلے ہوئے میدان میں سونے کے لیے ایک جگہ منتخب کی اور وہاں لیٹتے ہی مجھے نیند آ گئی۔

صبح میری آنکھ کھلی تو گہری نیند میں دیکھے ہوئے خواب کے بہت سے منظر ایک کے بعد ایک میری آنکھوں میں تازہ ہونے لگے۔ ان منظروں میں سب سے پہلے مجھے وہ سیاہ پوش عورت نظر آئی جو مجھے ویران مقبروں میں لے گئی تھی۔وہ مجھ سے مقبروں میں لوٹ کر نہ آنے کی شکایت کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی:

"تم نے لوٹ کر آنے کا وعدہ کیا تھا' آئے نہیں۔"

"موقع نہیں ملا۔"میں نے کہا۔

"کیوں؟"

"مجھے کئی شہروں میں جانا پڑا۔"

"اور اب؟" اس نے پوچھا۔

"کئی اور شہروں میں جانا ہے۔"میں نے کہا۔

"تو اب یہاں نہیں آؤ گے؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔آ بھی سکتا ہوں۔"میں نے کہا۔

''وہاں اب کیا ہو رہا ہے۔''میں نے پوچھا۔

''وہی جو پہلے ہو رہا تھا''۔اس نے جواب دیا۔

''مطلب؟''

''لوگ مارے جا رہے ہیں۔''

''اور تم؟''

''ان کا سوگ منا رہی ہوں۔''

''تمھیں یاد ہے۔'' میں نے اس سے کہا''میں نے چلتے وقت کہا تھا کہ میرے لوٹنے تک یہاں بہت لوگ مارے جا چکے ہوں گے۔''

''یاد ہے اور ایسا ہی ہوا'' اس نے کہا۔ پھر کہا:''مجھے نہیں لگتا کہ تم دوبارہ یہاں آؤ گے لیکن آؤ گے تو مجھے نہیں پاؤ گے۔''

''یہ سن کر مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔'' کیوں؟''میں نے پوچھا۔

''میں کب تک چھپتی پھروں گی۔ ایک دن وہ مجھے بھی دیکھ لیں گے اور مار دیں گے۔''

''نہیں ایسا نہیں ہوگا۔''

''ایسا ہی ہوگا۔''اس نے کہا۔

سیاہ پوش عورت سے اس مکالمے کے بعد خواب میں ایک اور منظر سامنے آ گیا۔ میں نے دیکھا کہ اجاڑ خیموں کے اندر سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی وہ عورت میرے سامنے کھڑی ہے جو خود کو دعا کرنے والی بتاتی تھی۔ وہ اب بھی انھیں خیموں میں تھی اور خیمے چھوڑ کر چلے جانے والوں کے دوبارہ لوٹنے کا انتظار کر رہی تھی۔

''تم؟''میں نے اسے دیکھتے ہی اس سے پوچھا۔

''ہاں میں۔''مجھے خوشی ہے کہ تم نے مجھے پہچان لیا۔''اس نے کہا۔

''تم اب بھی انھیں خیموں میں ہو''؟

''اور کہاں جاؤں گی۔''

''اور اب بھی چلے جانے والوں کی سلامتی کی دعا کرتی ہو؟''

''دعا کرنا ہی میرا کام ہے۔''

''تمھیں یقین ہے کہ چلے جانے والے واپس آئیں گے۔؟''

''نہیں آئیں گے تب بھی میں یہیں رہوں گی۔''

''لیکن تم کہاں رہے؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''بہت سے شہروں میں۔''

''اب کہاں ہو۔''

''نہیں معلوم۔ بس یہ معلوم ہے کہ میرے پاؤں کے نیچے زمین ہے لیکن یہ نہیں معلوم کہ یہ زمین کس کی ہے۔''

''تم گئے تو پھر ادھر آئے نہیں۔''

''مجھے ان خیموں سے خوف آتا ہے۔ ان کی ویرانی مجھے دکھ دیتی ہے۔''

''اور میں اسی ویرانی کو عزیز رکھتی ہوں۔'' اس نے کہا ''رات کے سناٹے مین جب میں چلے جانے والوں کے لیے مناجاتیں کرتی ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ سب کے سب زندہ سلامت لوٹ آئے ہیں۔''

یہ کہہ کر دعا کرنے والی غائب ہوگئی اور میری آنکھ کھل گئی۔

بیدار ہوتے ہی میں نے اپنا سفر پھر شروع کر دیا لیکن اب میں جس زمین پر چل رہا تھا وہ پرانی زمینوں سے بالکل مختلف تھی اور جن علاقوں سے گزر رہا تھا وہ پہلے کے علاقوں جیسے نہیں تھے اور راستے میں جو صورتیں نظر آ رہی تھیں، رنگ روپ میں وہ پہلے کی صورتوں سے بدلی ہوئی تھیں۔ مجھے لگا کہ میں کسی دوسری دنیا میں ہوں۔ راہ چلتے جو آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں، انھیں سمجھنے سے میں قاصر تھا۔ یہ کچھ الگ سی بولیاں تھیں اور ان سے میرے کان مانوس نہیں تھے۔ میں نے سوچا اگر مجھے کسی سے کلام کرنا پڑا تو میں اسے اپنی بات کیوں کر سمجھاؤں گا۔ میں بڑی دیر تک ان نامانوس زمینوں پر چلتا رہا اور اُن اجنبی علاقوں سے گزرتا رہا۔ چلتے چلتے میں نے محسوس کیا کہ سنسان زمینیں ختم ہو رہی ہیں اور آبادیاں قریب آتی جا رہی ہیں۔ آبادیوں میں داخل ہونے سے قبل ایک بار میں نے خود کو چھو کر جاننا چاہا کہ میں واقعی بیدار ہوں یا ہنوز خواب میں ہوں اور جب مجھے یقین ہوگیا کہ میں خواب کی دنیا میں نہیں ہوں تو میں اُن آبادیوں میں داخل ہوگیا جو میرے لیے بالکل نئی تھیں۔

میں دیر تک نئی شاہراہوں پر چلتا رہا، نئے بازاروں میں گھومتا رہا اور نئی عمارتوں کو دیکھتا رہا۔ شاہراہوں کی روشنی، بازاروں کی رونق اور عمارتوں کی بناوٹ مجھے اچھی لگ رہی تھی لیکن بار بار مجھے ویران مقبروں کا خیال آتا، سوگوار عورت کی یاد آتی اور دعا کرنے والی کی آواز سنائی دیتی۔ لمحہ

بھر کے لیے مجھے محسوس ہوتا کہ وہ سب کچھ یہیں کہیں میرے آس پاس موجود ہے لیکن شاہراہوں کا شور، بازاروں کی گہما گہمی اور عمارتوں کا شکوہ مجھے بتاتا کہ میں کہیں اور ہوں۔ کئی بار میں نے چاہا کہ میں قریب سے گزرتے ہوئے لوگوں سے پوچھوں کہ میں کہاں ہوں لیکن میں ایسا نہیں کر سکا۔ میں چلتا رہا لیکن آبادیاں ختم نہیں ہوئیں۔ شہر بہت بڑا تھا اور لوگ بہت زیادہ تھے۔ لیکن وہ سب ایک دوسرے سے بے تعلق اپنی اپنی راہوں پر چل رہے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ سب کسی کے حلقۂ اطاعت میں ہیں اور وہی کر رہے ہیں جو ان سے کہا گیا ہے۔ مجھے لگا کہ اگر میں بھی یوں ہی چلتا رہا تو انھیں لوگوں کی طرح میں بھی کسی کے اشاروں پر نہ چلنے لگوں۔ لیکن جیسے ہی میں نے یہ سوچا مجھے حکم ملا: ''چلتے رہو۔ اس شہر میں ٹھہرے تو مرنا یقینی ہے''۔ یہ سنتے ہی میں نے تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ میں جلد سے جلد اس شہر سے نکل جانا چاہتا تھا۔ میں چلتا رہا اور شہر بڑھتا رہا۔ چلتے چلتے میں نے سوچا: ''آخر کب ختم ہوگا یہ شہر''۔ اسی وقت پھر ایک آواز آئی: ''ٹھہرے تو مرنا یقینی ہے''۔ میں چل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ آخر اس شہر میں ایسا کون ہے جو مجھے موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے۔ چلتے پھرتے لوگوں میں تو کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو کسی کے قتل کا ارادہ رکھتا ہو۔ پھر بھی مارے جانے کے خوف سے میں چلتا رہا اور پھر مجھے محسوس ہوا کہ میں حدود شہر سے باہر نکل رہا ہوں۔ لیکن یہ میرا وہم تھا۔ میں شہر کے اندر ہی تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے شہر میرے ساتھ ساتھ چل رہا ہو۔ گویا شہر میرے پاؤں میں پڑی ہوئی ایک ایسی زنجیر تھا جو پاؤں سے الگ بھی نہیں ہوتی اور چلنے والے کو آگے بڑھنے سے روکتی بھی نہیں۔ اب میرے پاؤں تھکنے لگے تھے اور مجھ میں آگے بڑھنے کی طاقت نہیں رہ گئی تھی۔ تکان کے سبب میں گرنے ہی والا تھا کہ میں نے دیکھا شہر اپنی رونق سے محروم ہو رہا ہے۔ میں نے دیکھا کہ شاہراہوں کی روشنی ختم ہو رہی ہے، بازاروں کی رونق غائب ہو رہی ہے اور عمارتیں زمیں بوس ہو رہی ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے شہر ویران ہوگیا۔ گلیوں اور بازارو ں میں دوڑتے لوگوں کو زمین جیسے نگل گئی۔ شہر اب میدان بن چکا تھا، ایک ایسا میدان جہاں میرے سوا دور دور تک کوئی نظر نہ آتا تھا۔ میں نے سوچا: شہروں میں داخل ہونے کے لیے اب تک میں کتنے میدانوں کو عبور کر چکا ہوں۔ اور جب بھی میں کسی شہر میں داخل ہوتا ہوں وہ میدان میں بدل جاتا ہے۔ شہر اور میدان اب میرے لیے ایک سے تھے۔

''لیکن اب میں جاؤں کس طرف؟'' میں نے خود سے پوچھا۔

''انھیں مقبروں کی طرف جہاں تم پہلی بار میرے ساتھ گئے تھے'' ایک آواز میرے کانوں

میں آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو میرے سامنے وہی سیاہ پوش عورت کھڑی تھی جو ویران مقبروں میں روز مارے جانے والوں کا سوگ منانے آتی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں سیاہ پوش عورت سے کچھ اور پوچھتا مجھے اس کے پیچھے وہ عورت بھی نظر آئی جو شہر چھوڑ کر جانے والوں کی سلامتی کے لیے مناجاتیں کرتی تھیں۔

''تم دونوں یہاں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''حیران کیوں ہو۔ ہم کسی نئی جگہ پر نہیں ہیں۔'' سیاہ پوش عورت بولی۔

''لیکن یہ زمین بالکل نئی ہے۔ میں کئی میدانوں اور شہروں سے گزر کر یہاں آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''کوئی زمین نئی نہیں ہوتی۔'' اب کی دعا کرنے والی نے کہا۔ ہر زمین کی مٹی ایک سی ہوتی ہے۔ پھر بولی: ''فاصلوں کی فصیلیں نظر کا دھوکا ہیں۔''

''تو ہم سب کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہیں جہاں سے ہم مقبروں کی طرف گئے تھے۔'' سیاہ پوش عورت بولی۔

''اور وہیں جہاں سے تم اس طرف گئے تھے جہاں کئی خیمے لگے ہوئے تھے۔'' دعا کرنے والی نے کہا۔

''تو ہم کس طرف چلیں؟'' میں نے پوچھا۔

''انھیں مقبروں کی طرف اور انھیں خیموں کی سمت'' دونوں نے ایک ساتھ کہا۔

''میں نے کئی دنوں سے مرنے والوں کا سوگ نہیں کیا ہے۔'' سیاہ پوش عورت بولی۔

''اور میں نے کئی دنوں سے شہر چھوڑ کر جانے والوں کے لیے مناجاتیں نہیں کی ہیں۔'' دعا کرنے والی نے کہا اور پھر ہم تینوں اس میدان سے آگے نکل آئے۔

راشد اشرف

خودکش

ویگن کے اڈے پر وہ خاموش ایک طرف بیٹھا تھا۔ ہاتھ میں ایک تھیلا اور اس میں کھانے کا کچھ خشک سامان۔ سرخ و سفید رنگت، چہرے پر تازہ تازہ اگتے بال اور جسم پر ایک سادہ سا قمیض شلوار۔ قمیض کی اندرونی جیب میں ایک پرانا سا موبائل فون جو اسے خصوصی طور پر استاد صاحب نے چلتے وقت دیا تھا۔ "اسے سنبھال کر رکھنا اور کسی کو مت بتانا کہ تمہارے پاس ایسی کوئی چیز ہے۔" ۔۔وہاں تربیتی کیمپ میں اسے سب استاد صاحب کہتے تھے، وہ بھی جو اس سے عمر میں بڑے تھے۔ چہرے مہرے سے وہ ایک جہاندیدہ شخص دکھائی دیتا تھا، پچاس کے پیٹے میں بھی اصل عمر سے کم ہی لگتا تھا۔۔۔اس کی بھی ایک کہانی تھی ۔۔وہاں ہر شخص کی ایک نہ ایک دلدوز کہانی تھی لیکن اب وہ تمام کے تمام یہ کہانیاں اپنے سینے میں ہی چھپا کر رکھنے پر مجبور تھے کہ وہاں انہیں سننے والا کوئی نہ تھا۔۔کب نجانے کس کی باری آجائے اور اسے روانہ ہونا پڑے اور وہ اپنے ساتھیوں کو بروز قیامت ملنے کا وعدہ کر کے چلتا بنے ۔۔ ایک بڑے سے کمرے میں کسی مقامی فنکار کو بلوا کر خصوصی طور پر چند تصاویر بنوائی گئیں تھیں۔ سبزے سے بھرپور باغات، ہر طرف ہریالی ہی ہریالی، درمیان میں کہیں دودھ کی نہر بہتی دکھانے کی کوشش کی گئی تھی۔۔"اسے ذہن میں بٹھا لو، یہی تمہارا آخری گھر ہے جہاں تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنا ہے۔" استاد صاحب نے ایک روز اسے کئی دوسرے نوجوانوں کے ہمراہ آگاہ کیا تھا اور اس کی نظر آخر تک انہی باغات پر جمی رہی تھی جبکہ دوسرے کب کے وہاں سے منتشر ہو چکے تھے۔ ہریالی اسے بہت پسند تھی، وہ اس پر جان چھڑکتا تھا۔۔"اگر یہاں رہنا ہے تو میں تو بہت خوش قسمت ہوں۔" اس نے خود سے کہا تھا۔

استاد صاحب اسے حتمی روانگی سے قبل امیر المومنین کے پاس لے آئے تھے جو ایک تخت پر

بیٹھے تسبیح پھر رہے تھے۔ انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی۔ "جاؤ بیٹا، اللہ کے حوالے۔" اور ایک لمحے کو اس کا دل بھر آیا، وہ امیر المومنین کو اپنا نجات دہندہ سمجھتا تھا اور ان کی کہی ایک ایک بات پر اسے اندھا اعتقاد تھا۔ استاد صاحب تو پھر اکثر تربیت کے دوران سخت لہجہ اختیار کر لیتے تھے لیکن امیر صاحب۔۔۔ کیا معلوم وہ بھی وہیں مل جائیں جہاں میں نے ہمیشہ کے لیے رہنا ہے۔

ویگن کے ہارن کی کرخت آواز نے اسے چونکا دیا اور وہ اپنا تھیلا سنبھالتا ہوا اٹھ گیا۔ سامنے ایک پولیس والا مونچھوں پر تاؤ دے رہا تھا لیکن اسے دیکھ کر وہ پرسکون ہی رہا۔ اس کے سامنے سے گزرتے وقت اس کے ذہن میں روکے جانے کی صورت میں ممکنہ جوابات گھوم گئے جنہیں استاد صاحب نے اسے اچھی طرح ذہن نشین کروا دیا تھا۔ حکومت نے ایک بار خودکش حملہ آور کی پہچان کی نشانیاں بتا کر الٹا انہیں مزید چوکنا کر دیا تھا۔ اب وہ اپنا چہرہ اور جسم کی سکنات کو پرسکون رکھتے ہیں، پھٹنے سے قبل منہ ہی منہ میں کسی قسم کا کوئی ورد نہیں کر رہے ہوتے، کپڑے بھی عام انداز کے پہنتے ہیں اور رات کو اطمنان سے سونے کی وجہ سے ان کی آنکھیں سرخ بھی نہیں ہوتیں۔

ویگن نے اسے شہر کے ایک مضافاتی علاقے میں اتار دیا تھا جہاں سے وہ ایک جانب پیدل چل پڑا۔ بیس منٹ کی مسافت کے بعد ایک تنگ سی گلی میں اس نے ایک دروازے پر دستک دی، دروازہ کھولنے والا ایک باریش شخص تھا۔ شناختی جملوں کے تبادلے کے بعد اسے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا گیا۔ ایک چھوٹے سے صحن سے گزار کر وہ ایک مختصر سے کمرے میں داخل ہوئے۔۔ "تم بالکل محفوظ ہو یہاں۔" باریش شخص نے اسے اطمینان دلایا۔ کچھ دیر بعد وہ خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے۔

وہ سامنے غسل خانہ ہے، یہ نیند کی گولی ضرور کھا لینا، رات کو آرام سے سونا، کوئی چیز چاہیے ہو تو مجھے آواز دے دینا لیکن کمرے سے باہر مت نکلنا، صبح جلدی اٹھنا ہے۔" باریش شخص نے اسے تنبیہ کی۔ اس کے منہ میں بڑا سا نوالہ تھا اس لیے وہ محض سر ہلا کر رہ گیا۔ کھانے کے بعد برتن سمیٹ کر وہ چلا گیا تھا اور خودکش حملہ آور چارپائی پر نیم دراز ہو گیا۔

باہر گلی میں کوئی بانسری بجاتا گزرا تھا۔۔۔ کچھ ہی دیر میں وہ کچھ پرانی تلخ یادوں نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ماں، باپ، بہن بھائی، سبھی تو تھے۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ لیکن ایک دھماکے نے یک دم اس کی دنیا اجاڑ دی تھی۔ دھماکے قبل کسی طیارے کی پرواز

کی جانی پہچانی آواز آئی تھی۔ لوگ ایسی آوازوں کے اب عادی ہو گئے تھے اور ایسے موقعوں پر گھر کے اندر ہی رہنے کو ترجیح دینے لگے تھے۔ لیکن اس بار کمپیوٹر کے سافٹ وئیر میں کوئی غلطی ہوگئی تھی یا پھر زمینی ہدف پر الیکٹرونک چپ رکھنے والے ایجنٹ سے کوئی چوک۔۔۔لیکن اس کا نتیجہ اس کے گھر والوں کی اچانک اور دلدوز موت کی شکل میں نکلا تھا۔ وہ گھر پر موجود نہیں تھا، قریب واقع درختوں کے نیچے بانسری ہی تو بجا رہا تھا۔

گھنے درختوں کے سائے تلے بیٹھ کر بانسری بجانا اس کی زندگی کی سب سے بڑی عیاشی تھی۔ اس کی پسندیدہ ہریالی اور اس ماحول میں بیٹھ کر نئے نئے شوق کی مشق۔۔اس شوق پر کئی بار وہ اپنے باپ سے پٹ چکا تھا، ایسے موقعوں پر اس کی بہن اس کی مدد کو آتی تھی بابا! بجانے دو نا اگر اسے اچھا لگتا ہے۔۔جواب میں اسے کافی دیر تک باپ کی صلواتیں سنی پڑتی تھیں۔

دھماکے کی آواز اس قدر شدید تھی کہ بانسری اس کے مُنھ سے نکل کر دور جا پڑی اور وہ اوندھے مُنھ گر گیا۔ مُنھ میں بھر جانے والی مٹی نکالتا ہوا دیوانہ وار گھر کی جانب دوڑ پڑا تھا لیکن اس وقت تک سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ تربیتی کیمپ میں وہ کسی کے توسط سے پہنچا تھا جہاں اس جیسے اور بھی کئی نوجوان تھے۔ سب کی کہانی ایک دوسرے سے ملتی جلتی تھی۔ سونے سے پہلے وہ نیند کی گولی کھانا نہیں بھولا تھا۔

علی الصبح اسے نماز کے لیے اٹھایا گیا۔ باریش شخص نے اسے ناشتے کے لیے پوچھا۔ کوئی خاص چیز کھانے کا دل کر رہا ہو تو بتاؤ! ہم سب سے پوچھتے ہیں۔

اور جواب میں اس نے گھی لگی روٹی اور قہوے کی فرمائش کی تھی، باریش شخص مسکرا کر چلا گیا اور کچھ ہی دیر میں ناشتے کے ہمراہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوا۔

ناشتے کے بعد چاہو تو کچھ دیر آرام کرلو، پھر نہا کر تیار رہنا، میں ایک گھنٹے بعد دوبارہ آؤں گا۔۔۔وہ یہ ہدایات دے کر چلا گیا تھا

ایک گھنٹے بعد باریش شخص اس کے جسم پر بارود سے بھری جرسی باندھ رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے خانوں میں بارود بھرا تھا اور وہ بڑی مہارت سے اس کے جسم پر اسے نصب کر رہا تھا۔ درمیان میں وہ اسے آہستہ سے ہدایات بھی دے رہا تھا " ہلنا مت، اب گھوم جاؤ، داہنا ہاتھ اوپر اٹھاؤ اور وہ خاموشی سے اس کی ہدایات پر عمل کر رہا تھا۔ یوں بھی اس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، تربیتی کیمپ میں اپنے سامنے وہ ایسا ہوتے کئی بار دیکھ چکا تھا۔ شروع شروع میں تو ایک بار چھپ کر

یہ سب دیکھتے وقت استاد صاحب نے اسے ڈانٹ بھی دیا تھا لیکن وہاں سے گزرتے ہوئے امیر المومنین نے مشفقانہ لہجے میں انہیں ایسا کرنے سے روکا تھا۔"مت روکو اسے، ایک دن تو اسے بھی یہ کرنا ہے۔۔۔

اب تم بالکل تیار ہو۔۔باریش شخص نے اس پر ایک ناقدانہ نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔تمہیں کچھ نہیں کرنا پڑے گا، بس اس جگہ پہنچ کر لوگوں میں گھل مل جانا ، اور ان کے عین درمیان پہنچ کر ہاتھ اٹھا کر زور سے اللہ اکبر کا نعرہ لگانا، اس کے بعد چند ہی لمحوں میں تمہیں شہادت نصیب ہوجائے گی اور تم اپنی اس پسندیدہ جگہ پہنچ جاؤ گے جہاں تمہیں ہمیشہ کے لیے رہنا ہے۔

جرسی بڑی مہارت سے نصب کی جا چکی تھی، باریش شخص اپنے کام میں ماہر تھا۔ایک موقع پر اس نے اسے فخر سے بتایا کہ اس کی تربیت امیر المومنین کے ہاتھوں ہوئی ہے۔۔کام مکمل کر کے اس نے اسے کھڑے ہونے کو کہا تھا اور چاروں طرف سے مکمل جائزہ لینے کے بعد مطمئن ہو کر سر ہلایا۔ وزن زیادہ تو نہیں ؟

ٹھیک ہے۔۔۔۔ اس نے آہستگی سے کہا۔۔۔۔حالانکہ وزن زیادہ تو تھا ہی ۔ وہ بے چینی محسوس کر رہا تھا اور سانس لینے میں بھی دقت ہو رہی تھی ۔ اس نے اس سے قبل کسی جرسی والے کو اس طرح بے چین نہیں دیکھا تھا جیسی بے چینی وہ اس وقت محسوس کر رہا تھا لیکن اس کا اظہار کرنا اس نے مناسب نہیں سمجھا۔

زیادہ ہلنا جلنا مت، لیٹنا بالکل نہیں،ایک جگہ بیٹھے رہو، کچھ ہی دیر میں ہمیں روانہ ہونا ہے۔۔ باریش شخص یہ کہہ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ایک گھنٹے بعد اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے آواز لگائی۔ چلو، اٹھو، احتیاط سے۔۔ اور وہ باریش شخص کی ہمراہی میں گھر کے صحن سے گزرتا، وہاں بکھری مختلف چیزوں پر نظر ڈالتا باہر نکل آیا۔گھر کے باہر ایک ویگن کھڑی تھی ۔ یہ ایک عام سی گاڑی تھی جو عموماً اسکول کے بچوں کو لانے اور لے جانے کے کام آتی ہے۔ باریش شخص نے اسے آہستہ سے فی امان اللہ کہا ۔منزل پر وہ اس کے ساتھ نہیں جانئے گا، یہ بات وہ اسے گھر سے نکلنے سے قبل ہی بتا چکا تھا۔ ڈرائیور کی کرسی پر بیٹھے شخص نے اسے گاڑی کی عقبی جانب بیٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ چپ چاپ ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ گاڑی اپنی منزل کی طرف چل پڑی تھی اور وہ راستے میں بکھرے منظر کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔علی الصبح اسکول جاتے ہوئے چھوٹے بچے، سڑکوں کی صفائی کرتے خاکروب، پٹرول پمپ پر گاڑیوں کی

قطار۔۔۔پھر اچانک اس کی نظر پھولوں کے ایک جھنڈ پر پڑی جسے بڑی مہارت سے سنوارا گیا تھا، اس کے دل میں خوشی در آئی ۔۔یہ اس کا پسندیدہ منظر تھا۔ ڈرائیور بہت احتیاط سے گاڑی چلا رہا تھا: بلاآخر وہ ایک ایسی جگہ رک گئے جہاں سے کچھ فاصلے پر پولیس کی وردیاں نظر آ رہی تھیں۔ یہ مال روڈ پر ہونے والا ایک مظاہرہ تھا، ہر طرف کالے کوٹوں کی بھرمار تھی اور ان کو ڈنڈوں کے زور پر روکتے ہوئے پولیس والے۔ ڈرائیور نے اسے اترنے کا اشارہ کیا اور وہ آہستگی سے اتر کر پولیس والوں کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ کچھ ہی ساعت میں وہ نعروں کی آوازیں بلند کرتے مظاہرین کو روکتے پولیس والوں کے درمیان پہنچ چکا تھا، ایک پولیس والے نے ہاتھ سے پکڑ کر اسے روکنے کی کوشش کی لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی ، اس نے اپنا دوسرا ہاتھ فضا میں بلند کر کے اللہ اکبر کا زوردار نعرہ لگایا اور کان پھاڑ دینے والے خوفناک دھماکے نے فضا کو دہلا دیا۔ دھوئیں کے بادلوں سے فضا سیاہ ہو رہی تھی، کئی پولیس والوں کے چیتھڑے اڑ چکے تھے اور ان کے اعضاء دور دور تک بکھر چکے تھے۔

اگلے ہی لمحے اس نے خود کو ہوا میں اڑتے پایا، وہ تیزی سے ایک جانب اڑتا جا رہا تھا، اس کا بدن ہوا کی طرح ہلکا ہو چکا تھا۔اس کے اردگرد مناظر تیزی سے بدلتے جا رہے تھے۔ جلد ہی وہ ایک جگہ ایسی جگہ جا کر رک گیا جہاں ہر طرف ملگجا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس دھند لکے میں اس نے دیکھا کہ اس کے چاروں جانب جلے ہوئے پتھروں کا ڈھیر ہے، ایک عجیب سی بو اسے پریشان کر رہی تھی۔ ماحول سوگوار تھا۔ اس کی پسندیدہ ہریالی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ اچانک سامنے سے کوئی اس کی جانب آتا دکھائی دیا۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ میں اس وقت کہاں ہوں؟۔۔جواب میں اس شخص نے جو کہا، اسے سن کر اسے ایک جھٹکا سا لگا اور اس کا ذہن اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا۔۔۔۔

اس سے اگلی رات وہ استاد صاحب کے خواب میں آیا، وہ ہاتھ باندھے استاد صاحب کے سامنے کھڑا تھا اور گڑگڑاتی ہوئی آواز میں استدعا کر رہا تھا: حضرت! براہ کرم امیر المومنین تک یہ درخواست پہنچا دیں کہ خودکش جرسی میں بارود ذرا کم ڈالا کریں۔۔میں جنت سے پچاس کلومیٹر آگے نکل گیا ہوں۔

جے. جی. بیلارڈ
ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن

وقت کا باغ

شام ہوتے ہوتے جب پالا دیو کے اسلوب میں تعمیر شدہ ولا کا بڑا سایہ ٹیرس پر چھا گیا، کاؤنٹ ایکسل اپنے کتب خانے سے برآمد ہوا اور چوڑی، حد سے زیادہ منقش سیڑھیوں سے اترتا ہوا وقت کے پھولوں کے درمیان جا پہنچا، سیاہ مخملیں جیکٹ میں ایک قد آور، پُر دبدبہ صورت، جورج پنجم جیسی داڑھی کے نیچے سونے کی ٹائی پن دمکتی ہوئی، سفید دستانے میں ملفوف ہاتھ میں چھڑی اکڑے اکڑے انداز میں پکڑے ہوئے۔ اس نے کسی جذبے کے اظہار کے بغیر نفیس بلوریں پھولوں کا جائزہ لیا، اپنی بیگم کے ہارپسی کورڈ کی اُن آوازوں کو سنتا رہا، کہ وہ موسیقی والے کمرے میں موزارٹ کا ایک روندو بجا رہی تھی، جو شفاف پنکھڑیوں میں گونج بن کر پلٹ اور تھرتھرا رہی تھیں۔

ٹیرس کے نیچے ولا کا باغ کوئی دو سو گز ڈھلان کی صورت میں پھیلتا ہوا ایک منّی سی جھیل تک چلا گیا تھا جس کے آر پار ایک سفید پُل تھا اور پرلے کنارے پر ایک نازک سا پویلین۔ ایکسل شاذ ہی جھیل تک جانے کا جوکھم اٹھاتا؛ وقت کے بیشتر پھول ٹیرس کے عین نیچے ایک بنی میں کھلتے تھے، اس اونچی دیوار کی اوٹ میں جو جاگیر کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھی۔ ٹیرس پر سے ایکسل دیوار کے اوپر سے پرے واقع میدان کو دیکھ سکتا تھا، کشادہ زمین کا ایک مسلسل پھیلاؤ جو بڑے بڑے ابھاروں کی صورت میں اترتا چڑھتا افق تک، نظر سے اوجھل ہونے سے پہلے ذرا سا بلند ہو کر، دراز تھا۔ میدان نے گھر کو ہر طرف سے نرغے میں لے رکھا تھا جس کے بے رنگ خالی پن میں ولا کی الگ تھلگ حیثیت اور رچاؤ بھری شان نمایاں ہو گئی تھی۔ یہاں باغ میں فضا زیادہ روشن، دھوپ زیادہ گرم معلوم ہوتی تھی جب کہ میدان سدا بجھا بجھا اور دور افتادہ تھا۔

شام کو چہل قدمی کرنے سے پہلے کاؤنٹ نے جیسا کہ اس کا معمول تھا، میدان کے پار آخری ابھار کی طرف نظر دوڑائی، جہاں ماند پڑتے سورج کی وجہ سے افق کسی دور دراز اسٹیج کی مانند منور تھا۔ اِدھر موتزارٹ کی سریلی جھنکار، اس کی بیوی کے تجیلے ہاتھوں سے فضا میں لہرا رہی تھی، اُدھر ایکسل ایک عظیم الشان فوج کے ہراول کو آہستہ آہستہ افق پر متحرک دیکھ رہا تھا۔ پہلی نظر میں یوں لگتا تھا کہ طویل غول کے غول قرینے سے صفیں باندھے آگے بڑھ رہے ہیں۔ لیکن بغور معائنہ کرنے سے یہ عیاں ہوجاتا تھا کہ، گویا (Goya) کے کسی زمینی منظر کی مٹی مٹی تفصیلات کی طرح، یہ لشکر لوگوں کے ازدحام پر مشتمل تھا۔ مرد اور عورتیں، جن کے بیچ میں پھٹی پرانی وردیاں پہنے فوجی، سب ایک غیر منظم بہاؤ کی صورت میں مارا مار کرتے بڑھے چلے آرہے تھے۔ بعض ان بھاری بوجھوں تلے، جو گردنوں میں پڑے بے ڈول جووں سے لٹکے تھے، لڑکھڑا لڑکھڑا کر چلنے میں مشغول تھے۔ بعض بھاری بجر چوبی گاڑیوں سے، ان کے چوبی اروں کو ہاتھوں سے گھما پھرا کر، زور آزمائی کر رہے تھے۔ چند ایک تنہا ہی گھسٹ گھسٹ کر چلے جاتے تھے۔ مگر سب کے سب ایک ہی رفتار سے رواں تھے اور ان کی جھکی جھکی کمریں، تیزی سے رخصت ہوتے سورج سے، روشن تھیں۔

آگے بڑھتا ہوا ہجوم تقریباً اتنے فاصلے پر تھا کہ دکھائی نہ دیتا تھا، لیکن جتنی دیر ایکسل، جس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ لاتعلق ہونے کے باوجود بغور نگراں ہے، مشاہدہ کرتا رہا، ایک بہت بڑی بھیڑ محسوس انداز میں قریب آتی گئی۔ ایک عظیم ہجوم کا ہراول دستہ افق کے ذرا نیچے سے ظاہر ہوتا رہا۔ آخر جب دن کی روشنی دھندلا چلی تو ازدحام کا اگلا سرا افق کے نیچے کے پہلے ابھار کی چوٹی تک آپہنچا اور ایکسل ٹیریس سے پلٹا اور وقت کے پھولوں کے درمیان چلنے لگا۔

پھول بڑھ کر کوئی چھ فٹ اونچے ہوگئے تھے۔ ان کی نازک ڈنڈیاں کانچ کی نلکیوں سے مشابہ، جن پر کوئی درجن بھر پتے لگے ہوئے۔ پنکھوں جیسے پتے جو کبھی شفاف تھے، اب پتھرائی رگوں کی وجہ سے ایسے گویا پالا زدہ ہوں۔ ہر ڈنڈی کی پھننگ پر وقت کا پھول لگا ہوا، سائز میں گلابی کے برابر، باہر کی غف پنکھڑیاں بلوریں دل کو گھیرے میں لیے، ان کی الماسی چمک دمک ہزاروں پہل کی حامل۔ بلوریوں لگ رہا تھا جیسے فضا کو روشنی اور تحرک سے خالی کیے دے رہا ہو۔ جب شام کی ہوا میں پھول یوں ہی سے ہلتے تو اس طرح جگمگا اٹھتے جیسے شعلوں سے مشابہ سنانوں والی برچھیاں ہوں۔

بہت سے ڈنٹھلوں میں اب پھول نہیں آرہے تھے اور ایکسل نے ان سب پر غور سے نظر

ڈالی اور مزید کلیوں کو تلاش کرتے وقت کبھی کبھی امید کی کیفیت اس کی آنکھوں میں آتی جاتی رہی۔ بالآخر اس نے ایک ایسی ڈنڈی سے جو دیوار سے قریب ترین تھی، ایک بڑا پھول چنا، دستانے اتارے اور مضبوط انگلیوں سے اسے چٹ سے توڑ لیا۔

جوں ہی وہ پھول کو لیے لیے ٹیرس پر لوٹا تو پھول دمک اٹھا اور آب آب ہو چلا، مرکز میں جکڑی روشنی آخر کار آزاد ہو گئی۔ رفتہ رفتہ بلور تحلیل ہوا، صرف بیرونی پنکھڑیاں صحیح سلامت رہ گئیں اور ایکسل کے ارد گرد کی فضا روشن ہوئی اور لو دے اٹھی، ترچھوں کرنوں سے رچی بسی، جو آناً فاناً چمک دکھا کر ماند پڑتی دھوپ میں گم ہو چلیں۔ عجیب ادلا بدلی نے وقتی طور پر شام کی کایا پلٹ دی، لطیف انداز میں اس کے زمان و مکان کی جہتوں کو تبدیل کر دیا۔ مکان کا تاریک ہوتا پیش دالان، جس کا پرانے وقتوں کا زنگار بچ کھچ کر اتر چکا تھا، ایک عجیب آسیبی سفیدی میں بدل کر منظر پر چھا سا گیا جیسے اچانک کسی خواب میں یاد آ گیا ہو۔

سر اٹھا کر ایکسل نے دوبارہ دیوار سے جھانکا۔ افق کا صرف بعید ترین کنارہ سورج سے روشن تھا اور وہ عظیم ازدحام جو قبل ازیں تقریباً چوتھائی میدان کے آر پار پھیلا ہوا تھا، اب افق تک پسپا ہو گیا تھا۔ وہ تمام اجتماع وقت کے کسی یک لخت الٹ پھیر کے نتیجے میں پیچھے ہٹ چکا تھا اور بظاہر رکا رکا معلوم ہوتا تھا۔

ایکسل کے ہاتھ میں پھول سمٹتے سمٹتے انگشت بھر جام کے برابر رہ گیا۔ پنکھڑیاں ناپید ہوتے قلب کے ارد گرد سکڑتی گئیں۔ قلب میں ایک مدھم سی چمک ٹمٹمائی اور بجھ گئی اور ایکسل کو ہاتھ میں پھول اوس کے برفیلے قطرے کی طرح پگھلتا محسوس ہوا۔

جھٹپٹا، اپنے لمبے لمبے سائے میدان پر بچھاتا ہوا، گھر پر ہر طرف سے گھر آیا۔ افق اور آسمان گھل مل کر ایک ہو گئے۔ ہارپسی کورڈ خاموش ہو چکا تھا اور وقت کے پھول، جو اب اس کی موسیقی کو پلٹا نہیں رہے تھے، کسی حنوط شدہ جنگل کی طرح بے حس و حرکت استادہ تھے۔

چند منٹ تک ایکسل جھک کر باقی رہ جانے والے پھولوں کو گنتا رہا۔ پھر ٹیرس کو پار کر کے آنے والی اپنی بیوی کو خوش آمدید کہا، جس کا بادلے کا بنا شام کا لباس آرائشی ٹائلوں پر سرسراتا رہا۔

''کتنی خوب صورت شام ہے، ایکسل'' اس نے جذبات بھرے لہجے میں کہا، جیسے وہ لان پر پھیلی بڑی بڑی بجیلی پرچھائیوں اور پُرتاب تاریک فضا کے لیے شوہر کا ذاتی طور پر شکریہ ادا کر رہی ہو۔ اس کے چہرے سے طمانیت اور ذہانت عیاں تھی؛ بالوں کو، جنہیں کہیں کہیں سے روپہلے پن

نے چھولیا تھا، پیچھے کی طرف سمیٹ کر مرصع بکسوے سے کس دیا گیا تھا۔ اس نے جو لباس پہن رکھا تھا اس کا گریبان خاصا کھلا تھا۔ اس کی صراحی دار گردن اور اونچی ٹھوڑی نظر آ رہی تھی۔ ایکسل نے پُرشوق فخر سے بیگم کا جائزہ لیا۔ اس نے اپنی بانہہ سے اسے سہارا دیا اور سیڑھیاں اتر کر دونوں باغ میں چلے آئے۔

''اس موسم گرما کی طویل ترین شاموں میں سے ایک شام'' ایکسل نے تائید کی اور مزید کہا: ''میری جان، میں نے حدِ کمال کو پہنچا ہوا ایک پھول توڑا، نگینہ ہی سمجھو۔ قسمت نے یاوری کی تو کئی دن تک ہمارا ساتھ دے گا۔'' اس نے تیوری چڑھائی اور دیوار کی طرف بے اختیارانہ دیکھا: ''اب تو ہر بار یہی لگتا ہے کہ وہ اور نزدیک آ پہنچے ہیں۔''

بیوی حوصلہ دلانے کے انداز میں ایکسل کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور اس کے بازو کو اور بھی کس کے پکڑ لیا۔

دونوں کو معلوم تھا کہ وقت کے باغ پر نزع کا عالم ہے۔

تین شاموں کے بعد، جیسا کہ اس نے اندازہ لگایا تھا (اگرچہ اس وقت سے کہیں پہلے جس کی اسے چوری چھپے امید تھی)، کاؤنٹ ایکسل نے وقت کے باغ سے ایک پھول اور توڑا۔

جب پہلے پہل اس نے دیوار سے پرے جھانکا تھا تو قریب آتا ارزل بھیڑ بھڑکا، جس سے میدان کا پرلا نصف اٹا پڑا تھا، ایک جم غفیر کی صورت میں، جس میں کہیں ذرا سی بھی چھیڑ نہ تھی، افق کے اس پار سے اُس پار تک پھیلا ہوا تھا۔ اسے لگا کہ وہ دھیمی، ادھوری سدھوری آوازوں کا شور سن سکتا ہے جسے خالی فضا اس تک پہنچا رہی تھی۔ ایک روٹھی روٹھی بھنک، جس میں کہیں کہیں چیخیں اور چلاہٹیں در آئی تھیں۔ لیکن اس نے جلد ہی خود کو باور کرا لیا کہ یہ اس کا وہم ہے۔ خوش قسمتی سے اس کی بیوی ہارپسی کورڈ لیے بیٹھی تھی اور باخ کے ایک فیوگ کی پُرتکلف باہم جڑتی ٹکراتی طرازوں کی وجہ سے، جو آہستہ آہستہ ٹیریس کے آر پار چڑھاؤ اتار کا سماں باندھ رہی تھیں، باقی آوازیں دب کر رہ گئی تھیں۔

مکان اور افق کے درمیان میدان چار بہت بڑے ابھاروں میں منقسم تھا جن میں سے ہر ایک کی چوٹی ترچھاتی روشنی میں صاف نمایاں تھی۔ ایکسل نے خود سے عہد کیا تھا کہ انہیں کبھی نہیں گنے گا لیکن وہ تعداد میں اتنی کم تھیں کہ ان سے نظر کا چوک جانا ممکن ہی نہ تھا، بالخصوص جب وہ بڑھتے لشکر کی پیش گامی کی اتنی قطعی طور پر نشان دہی کر رہی ہوں۔ اس وقت تک اگلی صف پہلی چوٹی

پار کرنے کے بعد دوسری چوٹی تک کا راستہ اچھا خاصا طے کرچکی تھی۔ جم غفیر کے اصل حجم نے جو پیچھے پیچھے دھکا پیل کرتا چلا آ رہا تھا، چوٹی کو بلکہ اس سے کہیں بڑے بھاری دھڑلے کو چھپا لیا تھا جو افق سے آگے تک پھیلا ہوا تھا۔ مرکزی جسد کے دائیں بائیں نگاہ ڈال کر ایکسل لشکر کے بظاہر بے حد وحساب پھیلاؤ کو دیکھ سکتا تھا۔ ابتدا میں جو مرکزی ہجوم معلوم ہوا تھا وہ ایک مختصر ہراول سے زیادہ نہ تھا اور اس جیسے متعدد بازو میدان کے آر پار پھیلے ہوئے تھے۔ اصل مرکز ابھی نمودار نہ ہوا تھا لیکن پھیلاؤ کی شرح کو مدنظر رکھتے ہوئے ایکسل نے قیاس کیا کہ جب وہ بالآخر میدان میں وارد ہوگا تو وہاں چپہ بھر جگہ بھی خالی نہ رہے گی۔

ایکسل نے زیادہ بڑی گاڑیوں یا مشینوں کی تلاش میں نظر دوڑائی لیکن ہر شے ہمیشہ کی طرح بے شکل اور نامربوط تھی۔ نہ پرچم تھے نہ پھریرے نہ کوئی ایسی شے جسے نیک فال سمجھ کر ساتھ رکھا گیا ہو نہ نیزہ بردار۔ ہجوم، سر جھکائے، آسمان کی طرف سے ناآگاہ، ریلتا پیلتا چلا آ رہا تھا۔

اچانک، عین اس لمحے جب ایکسل ہٹنے کو تھا، بھیڑ کا اگلا سرا چوٹی پر ظاہر ہوا اور وہاں سے اتر کر میدان پر چھاتا گیا۔ ایکسل اس بات پر حیران ہوا کہ نظر سے اوجھل رہنے کے دوران میں ہجوم نے کتنا ناقابل یقین فاصلہ طے کرلیا تھا۔ لوگ اب دگنے بڑے نظر آنے لگے تھے اور ہر کسی کو واضح طور پر ملاحظہ کیا جاسکتا تھا۔

ایکسل جلد جلد ٹیریس سے اترا، باغ سے وقت کا ایک پھول چنا اور ڈنٹھل سے جھٹک کر توڑ لیا۔ جب پھول اپنی گتھی ہوئی روشنی خارج کرچکا تو ایکسل ٹیریس پر لوٹ آیا۔ جس وقت پھول سمٹ کر اس کی ہتھیلی پر منجمد مروارید جتنا رہ گیا تو اس نے میدان کی طرف دیکھا اور یہ ملاحظہ کرکے تسکین حاصل کی کہ لشکر دوبارہ افق کی طرف پسپا ہوگیا ہے۔

پھر اس پر انکشاف ہوا کہ افق پہلے کی بہ نسبت کہیں زیادہ قریب آ گیا ہے؛ اور جسے وہ افق سمجھ رہا تھا وہ پہلی چوٹی ہے۔

جب وہ شام کی چہل قدمی کی خاطر کاؤنٹیس کے ساتھ ہولیا تو اس نے ان باتوں کا ذکر تک نہ کیا لیکن وہ دیکھ سکتی تھی کہ ایکسل کی اوپری بے پروائی کس امر کی غماز ہے اور اس کی پریشانی کو رفع کرنے کے لیے جو کرسکتی تھی کرتی رہی۔

سیڑھیوں سے اترتے ہوئے اس نے وقت کے باغ کی طرف اشارہ کیا: ''کیا ہی شان دار جلوہ گری ہے، ایکسل۔ ابھی اتنے بہت سے پھول باقی ہیں۔''

ایکسل نے سر ہلایا، بیوی اس کا اعتماد بحال کرنے کے لیے جو سرگرمی دکھا رہی تھی، اس پر آپ ہی آپ مسکرایا۔ بیوی نے ''ابھی'' کا جو لفظ برتا تھا اس سے ظاہر تھا کہ وہ لاشعوری طور پر پہلے سے بھانپ چکی ہے کہ خاتمہ قریب ہے۔ حقیقت میں ان سیکڑوں پھولوں میں سے، جو باغ میں کھلے ہوئے تھے، محض درجن بھر باقی رہ گئے تھے اور ان میں سے بھی کئی کلیوں سے یونہی سے بڑے تھے— صرف تین چار پوری طرح شگفتہ نظر آتے تھے۔ جب وہ ٹہلتے ہوئے جھیل کی جانب گئے اور کاؤنٹیس کا لباس خنک گھاس پر سرسراتا رہا تو ایکسل نے یہ فیصلہ کرنے کی کوشش کی کہ آیا بڑے پھولوں کو پہلے توڑ لیا جائے یا آخر تک باقی رکھنا چاہیے۔ قطعی طور پر بہتر یہ ہوتا کہ نسبتاً چھوٹے پھولوں کو بڑے ہونے اور پوری طرح کھلنے کے لیے مزید وقت دیا جاتا لیکن وہ اگر زیادہ بڑے پھولوں کو، حتمی تعویق کی خاطر، جیسی کہ اس کی آرزو تھی، آخر تک باقی رہنے دیتا تو یہ فوقیت خاک میں مل جاتی۔ بہرحال جلد ہی اس کی سمجھ میں آ گیا کہ دونوں صورتوں میں سے کوئی بھی اختیار کی جائے فرق کم ہی پڑے گا۔ باغ کا کام جلد ہی تمام ہوجائے گا اور نسبتاً چھوٹے پھولوں کو اپنے فشردہ مرکزی حصوں میں وقت کو مجتمع کرنے کے لیے جتنا زیادہ عرصہ درکار تھا اتنا وہ انہیں دے نہیں سکتا تھا۔ زندگی بھر پھولوں میں بڑھوتری کی کوئی واحد مثال بھی اس کے دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ بڑے پھول ہمیشہ ہی پوری طرح شگفتہ نظر آتے تھے اور کلیوں میں سے کسی ایک نے بھی خفیف ترین افزائش کا ثبوت نہیں دیا تھا۔

جھیل کے پار پہنچ کر ایکسل اور اس کی بیوی نے نگاہیں جھکا کر ساکت سیاہ پانی میں اپنی پرچھائیوں پر نظر کی۔ فاصلے پر ولا کو دیکھ کر اور ایک طرف سے پولیین اور دوسری طرف سے باغ کی اونچی دیوار کی پناہ میں آ کر ایکسل کو خاطر جمعی اور تحفظ کا احساس ہوا۔ میدان میں نزدیک آتا بھیڑ بھڑ کا ایک خواب پریشاں لگا جس سے وہ سلامتی کے ساتھ بیدار ہوگیا تھا۔ اس نے بیوی کی چکنی کمر میں بازو حمائل کیا اور محبت بھرے انداز میں بھینچ کر اسے کندھے سے لگا لیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کئی سال سے بیوی سے ہم آغوش نہ ہوا تھا، اگرچہ ان کی ساتھ گزاری ہوئی زندگی زمانے کی قیود سے آزاد رہی تھی اور ایکسل کو یہ کل کی بات معلوم ہو رہی تھی جب وہ پہلی مرتبہ اسے رہنے سہنے کے لیے لے کر ولا آیا تھا۔

''ایکسل،'' اس نے سنجیدگی کے ساتھ دریافت کیا، ''باغ کے مرجانے سے پہلے... آخری پھول میں توڑ لوں؟''

اس کی التجا کی کنہ کو سمجھ کر ایکسل نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔

آنے والی شاموں کے دوران میں ایکسل نے ایک ایک کر کے باقی ماندہ پھول توڑ لیے۔ بیوی کے لیے صرف ایک چھوٹی کلی رہنے دی جو ٹیریس کے عین نیچے لگی ہوئی تھی۔ وہ پھولوں کو، گننے یا روزانہ کسی حساب سے توڑنے سے منکر ہو کر، الل ٹپ توڑتا رہا اور جب ضروری محسوس کیا تو بیک وقت دو تین چھوٹی چھوٹی کلیوں کو بھی لگا نہ رہنے دیا۔ حویلی کی طرف بڑھنے والا ہجوم، ایڑی چوٹی کا زور لگاتی انسانیت کا ایک زبردست جمگھٹ جس کی اوٹ میں آ کر افق غائب ہو چکا تھا، اب دوسری اور تیسری چوٹی تک آ پہنچا تھا۔ ایکسل کو ٹیریس سے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ جان کھپاتی، گھسٹ گھسٹ کر چلتی، صفیں اس پیالہ نما نشیب میں اترتی جا رہی ہیں جس کے بعد آخری چوٹی واقع تھی اور کبھی کبھی ان کی آوازوں کی بھنک اس تک پہنچ جاتی تھی جس میں طیش آلودہ چیخم دھاڑ اور کوڑوں کی پھٹکار رلی ملی ہوتی۔ جہاں تک ایکسل کی سمجھ کام کرتی تھی اس بھیڑ بھاڑ میں کسی ایک فرد کو بھی یہ خبر نہ تھی کہ اصل میں انہیں کس طرف جانا ہے۔ کچھ ایسا تھا گویا ہر کوئی اندھا دھند بڑھ کر اپنے سے آگے کے شخص کی ایڑیوں تلے زمین سے ذرا پیچھے قدم جماتا آ رہا ہو اور صرف ایک ہی وحدت نظر آتی تھی کہ سب کے سب اجتماعی طور پر ایک سمت میں رواں ہیں۔ کسی تُک کے بغیر ایکسل نے امید لگا لی کہ اصل مرکز، جو کہیں افق سے پیچھے تھا، شاید کسی اور سمت میں بڑھ رہا ہو اور یہ کہ ٹھٹ کا ٹھٹ بتدریج اپنا راستہ بدل کر، ولا سے کترا کر نکلتا ہوا، پلٹے جوار کی طرح میدان سے ہٹتا ہٹتا کسی اور طرف ہو لے گا۔

آخری شام سے ایک شام پہلے جس سے اس نے وقت کا پھول توڑا نا بکار بھیڑ بھڑ کے کا اگلا سرا تیسری چوٹی تک پہنچ چکا تھا اور اتر کر اس سے آگے جہاں تہاں چڑھا آ رہا تھا۔ کاؤنٹیس کا انتظار کرتے ہوئے ایکسل نے باقی بچے دو پھولوں کو دیکھا، دونوں چھوٹی چھوٹی کلیاں جو اگلی شام صرف چند منٹ تک ان کا ساتھ دے سکیں گی۔ مردہ پھولوں کے کانچ کے ڈنٹھل اکڑاہٹ کے ساتھ فضا میں سربلند تھے لیکن سارے کا سارا باغ اپنی رونق کھو چکا تھا۔

ایکسل نے اگلی صبح سکون سے اپنے کتب خانے میں گزاری اور گیلریوں کے درمیان رکھے شیشے کے ڈھکنوں والے بڑے خانوں میں کم یاب ترقلمی نسخوں کو مہر بند کرتا رہا۔ اس غلام گردش کو، جس میں پورٹریٹ لگے ہوئے تھے، ہر تصویر کو احتیاط سے چمکاتے ہوئے، آہستہ آہستہ طے کیا۔ پھر

اپنے ڈیسک پر ہر چیز قرینے سے رکھی اور باہر آ کر دروازہ مقفل کر دیا۔ سہ پہر کے دوران میں اس نے، مخل ہونے کا ثبوت دیے بغیر، بیوی کا ہاتھ بٹایا جو ان کے زیورات کو چمکاتی اور گل دانوں اور نیم قد مجسموں کو سیدھا کر کے رکھتی رہی۔

شام ہوتے ہوتے جب سورج ڈھل کر مکان کے عقب میں جا چکا تھا، وہ دونوں تھک گئے تھے، گرد میں اٹے ہوئے تھے اور دونوں نے دن بھر آپس میں بات تک نہ کی تھی۔ جب بیوی موسیقی کے کمرے کی طرف جانے لگی تو ایکسل نے اسے واپس بلا لیا۔

''آج رات، جانِ من، ہم ساتھ ساتھ پھول توڑیں گے'' ایکسل نے تحمل سے کہا۔ ''ایک میرا، ایک تمہارا۔''

اس نے دیوار سے پرے صرف اچٹتی سی نظر ڈالی۔ وہ آدھے میل سے بھی کم دوری پر، چھٹڑیا فوج کے گھٹے گھٹے شور، لوہے اور کوڑوں کا دھڑاکا، سن سکتے تھے، جو گھر کی طرف ہیلا مارتی بڑھتی آ رہی تھی۔

ایکسل نے جھٹ سے اپنا پھول توڑا، ایک کلی جو کسی طرح نیلم سے بڑی نہ تھی، جتنی دیر وہ سج سج ٹمٹمائی باہر کا غوغا لمحاتی طور پر پسپا ہوتا گیا اور پھر دوبارہ برپا ہونے لگا۔

اس ادھم کی طرف سے کان بند کر کے ایکسل نے ولا کا جائزہ لیا، پیش دالان میں نصب چھ ستونوں کو گنا، پھر لان کے اس پار جھیل کے روپہلے قرص، جس کی پیالہ نما شکل شام کی جاتی روشنی کو منعکس کر رہی تھی، اور ان سایوں پر نظر ڈالی جو بلند و بالا درختوں کے درمیان متحرک تھے اور خوش تراشیدہ تختۂ گیاہ کے آر پار پھیلتے جا رہے تھے۔ اس کی نظر ذرا سی دیر اس پل پر ٹھٹکی جہاں کتنی بہت سی گرمیوں میں وہ اور اس کی بیوی، بانہوں میں بانہیں ڈالے، جا کھڑے ہوا کرتے تھے۔

''ایکسل!''

باہر مچا ہوا ادھم فضا میں چنگھاڑ کی طرح بلند ہوا، ہزار آوازیں جو صرف بیس تیس گز کی دوری سے دہاڑ رہی تھیں۔ دیوار کے پاس سے ایک پتھر اڑتا ہوا وقت کے پھولوں کے درمیان آ گرا جس سے کئی کھڑنک ڈنٹھل چٹ سے ٹوٹ گئے۔ کاؤنٹیس اس کی طرف دوڑی تو ایک اور باڑھ دیوار کو اِدھر سے اُدھر تک دھڑ دھڑاتی چلی گئی۔ پھر ایک بھاری ٹائل ان کے سروں پر سے گھمگھماتی ہوئی گزری اور اس نے پودوں کی حفاظت کے لیے بنے شیشہ خانے کی کھڑکیوں میں سے ایک کو جا پھوڑا۔

''ایکسل!'' ایکسل نے اسے بانہوں میں سمیٹ لیا اور اپنے ریشمی گلوبند کو سیدھا کیا کہ

کاؤنٹیس کا کندھا اس کے کوٹ کے لیپلوں کے درمیان ہلکے سے جا لگا تھا۔

''جلدی سے، میری جان، آخری پھول!'' وہ اسے لے کر سیڑھیاں اترا اور باغ میں سے گزرا۔ ڈنٹھل کو اپنی مرصع انگلیوں سے پکڑ کر کاؤنٹیس نے پھول کو صفائی سے توڑا اور پھر اپنی انجل میں سنبھال لیا۔

ایک لمحے کے لیے شور غل ذرا سا کم پڑا اور ایکسل نے اپنے حواس بجا کیے۔ اس بھڑکیلی روشنی میں جو پھول سے پھوٹی پڑ رہی تھی اس نے بیوی کی سفید، دہشت زدہ آنکھوں کو دیکھا۔ ''میری جان، جب تک ذرہ بھر چمک بھی باقی ہے تم، جہاں تک تم سے بن پڑے، اسے تھامے رہنا۔''

ٹیرس پر وہ ساتھ ساتھ کھڑے رہے۔ کاؤنٹیس نے تابندہ، ماند پڑتے، نگینے کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ جوں جوں باہر آوازیں بلند ہوتی گئیں فضا ان کے گرد سمٹتی چلی آئی۔ ہجوم بھاری بھرکم آہنی پھاٹکوں پر دھڑا دھڑ ضرب لگا رہا تھا اور اودھم کی وجہ سے پورا ولا لرز اٹھا تھا۔

اُدھر تو روشنی کی آخری جھلمل تیزی سے ناپید ہوئی اِدھر کاؤنٹیس نے اپنی ہتھیلیاں فضا میں بلند کیں، جیسے کسی غیبی پرندے کو رہا کر رہی ہو۔ پھر دلیری کے آخری ابال کے تحت اپنے ہاتھ شوہر کے ہاتھوں میں دے دیے۔ اس کی مسکراہٹ میں ویسی ہی تاب ناکی تھی جیسی غائب ہو جانے والے پھول میں تھی۔

''اوہ ایکسل!'' وہ پکاری۔

تاریکی، تلوار کی طرح، جھپٹ کر گری اور ان کے آر پار ہو گئی۔

ڈھوتے ڈھواتے اور واہی تباہی بکتے ہجوم کے بیرونی سرے جا گیر کے گرد کھنچی دیوار تک آ پہنچے جو ٹوٹ پھوٹ کر گھٹنوں گھٹنوں اونچی رہ گئی تھی۔ اپنے چھکڑوں کو، ان آثار کے اوپر سے کھینچ کر، وہ پہیوں سے بنی ان خشک لیکوں پر لے چلے جو کبھی گاڑیوں کی آر جار کی پر تکلف راہیں تھیں۔ کھنڈر سے، جو پچھلے وقتوں میں وسیع و عریض ولا تھا، انسانوں کی اس ختم نہ ہونے والی چڑھائی میں مشکل سے کوئی خلل واقع ہوا۔ جھیل سوکھ چکی تھی، گرے ہوئے درخت اس کی تہ میں پڑے گل سڑ رہے تھے، ایک پرانا پل زنگ خوردہ ہو کر گرنے کو تھا۔ لان میں اگی لمبی لمبی گھاس میں اڑا ہا پھبک پھبک کر آرائشی روشوں اور سنگی تراشیدہ جالیوں پر پھیلتا جا رہا تھا۔

بیشتر ٹیرس ڈھے چکی تھی اور ہجوم کا اصل حصہ، اندر سے جلے ولا سے پرے پرے رہ کر لان سے ناک کی سیدھ میں گزرتا گیا لیکن اکا دکا زیادہ متجسس آدمی چڑھ کر اوپر گئے اور خالی ڈھانچ

کوٹو ہنے لگے۔ کواڑ قبضوں میں لگے لگے گل چکے تھے اور فرش ٹوٹ کر نیچے جا پڑے تھے۔ موسیقی کے کمرے میں ایک قدیم ہارپسی کورڈ کو چیر پھاڑ کر جلانے جوگی چھپٹیوں میں تبدیل کر دیا گیا تھا لیکن ساز کی چند ایک چابیاں ابھی تک دھول میں پڑی تھیں۔ کتب خانے میں تمام کتابیں الماریوں سے الٹ کر نیچے پھینک دی گئی تھیں، تصویروں کے کینوس چیر ڈالے گئے تھے اور فرش پر سنہرے ملمع والے فریم جابجا بکھرے ہوئے تھے۔

جیسے ہی ازدحام کا اصل جسد ولا تک پہنچا اس نے دیوار کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہر جگہ سے پار کرنا شروع کر دیا۔ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے، سوکھی جھیل میں ٹھوکریں کھا کر چلتے لوگ ہر سمت سے ٹیریس پر چڑھ دوڑے اور گھر میں دھکم پیل کرتے شمال کی جانب کھلے دروازوں کی طرف بڑھتے گئے۔

صرف ایک جگہ ایسی تھی جو اس ختم نہ ہونے والے تموج کے سامنے ڈٹ کر کھڑی رہی۔ ٹیریس کے عین نیچے، ٹوٹی ہوئی بالکنی اور دیوار کے درمیان ایک گنجان، چھ فٹ اونچی، بجر کٹیلی جھاڑی اگ آئی تھی۔ یہ پُر خار ہریاول ایک ناقابل گزر حجم بن گیا تھا اور گزرنے والے لوگ، یہ دیکھ کر کہ زہریلا بیلا ڈونا شاخوں میں الجھا ہوا ہے، اس سے احتیاط سے بچ کر قدم رکھتے تھے۔ ان میں سے بیشتر سڑک پر بچھائی جانے والی سلوں پر، جو اب اوندھی سیدھی پڑی تھیں، پھونک پھونک کر قدم رکھنے میں اتنے مصروف تھے کہ سر اٹھا کر کٹیلی جھاڑیوں کے وسط کی طرف نظر ہی نہ ڈال سکے جہاں دو سنگی مجسمے، پہلو بہ پہلو استادہ، اپنی محفوظ نظارہ گاہ سے گھر کے اردگرد کھلے میدانوں کو دیکھ سکتے تھے۔ ان میں نسبتاً بڑی شکل ایک باریش مرد کی تجسیم تھی جس نے اونچے کالر کی جیکٹ پہن رکھی تھی، بغل میں چھڑی دبی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک عورت تھی، پورے سائز کی آراستہ سکرٹ پہنے، جس کے پتلے، پُرسکون چہرے پر ہوا اور بارش نے کوئی نشان نہ چھوڑا تھا۔ بائیں ہاتھ میں اس نے آرام سے ایک گلاب تھام رکھا تھا جس کی نازک نازک پنکھڑیاں اتنی مہین تھیں کہ تقریباً شفاف معلوم ہو رہی تھیں۔

جب گھر کے پچھواڑے سورج نے دم توڑا تو روشنی کی ایک کرن نے ایک شکستہ کنگنی سے جھانکا، گلاب کو چھوا، پنکھڑیوں کے مرغولے سے منعکس ہو کر مجسموں پر پڑی اور سرمئی پتھر کو اس طرح روشن کر دیا کہ ایک گریزپا لمحے کے لیے پتھر میں اور مجسموں کی اصل صورتوں کے مدتوں پہلے فنا ہوئے گوشت پوست میں تمیز کرنا ممکن نہ رہا۔

غازی صلاح الدین

وقت بہت کم ہے

لڑکپن کے دنوں میں ہم چند دوستوں نے ایک منصوبہ یہ بنایا کہ کیوں نہ ہم سب بڑے آدمی بن جائیں اور اس کارنامے کو راز میں رکھیں۔ کسی کو پتہ نہ چلے کہ ہم کتنے عظیم ہیں۔ ایسی باتیں ہم اپنی دانش وری کے زعم میں سوچا کرتے تھے۔ کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ یک طرفہ عشق بھی چل رہے تھے۔ راتوں کو جاگتے تھے اور آنے والی زندگی، لاعلمی کی دھند میں لپٹی ہوئی، بے انتہا پراسرار اور پُرخطر دکھائی دیتی تھی۔

ہاں، ایک منصوبہ اور بھی تھا، یہ کہ ابھی سے اپنی پوری زندگی کی کہانی لکھ لیں اور پھر اسی کے مطابق جی کر دیکھیں۔ جیسے کسی فلم کا اسکرپٹ ہوتا ہے۔ جاگتے میں دیکھے جانے والے سارے خواب اس اسکرپٹ میں سجا دیں اور انہیں سچ کر دکھائیں۔

اب وہ زمانہ ایک دو نہیں، دس بیس نہیں، چالیس پچاس سال پیچھے رہ گیا۔ اتنی مسافت طے کرنے کے بعد یہ سوچنا کہ اب آگے کیا کریں گے بہت عجیب لگتا ہے۔ جو راستہ طے کرنا باقی ہے وہ تو اب بہت مختصر ہے۔ زندگی کی غیر یقینی تو عمر کی ہر منزل پر ساتھ چلتی ہے لیکن طبعی عمر اگر اتنی ہو جائے تو موت کی قربت ایک یقین بن جاتی ہے۔ صرف چند سال کی بات ہے۔ یوں تو ساری زندگی لوگوں سے، چیزوں سے، جگہوں سے رخصت ہونے کا سلسلہ جاری رہتا ہے لیکن یہ کب ہوگا، کیسے ہوگا، ''کس طرح آئے گی، جس روز قضا آئے گی؟'' ہر گزرتا ہوا دن جیسے کسی خستہ دیوار کی چند مزید اینٹیں گرا دیتا ہے۔

میں نے جس لڑکپن کا حوالہ دیا ہے اس سے نسبت ان چند پرانے دوستوں کے سہارے ابھی قائم ہے جو زندہ ہیں اور جن سے ملاقات بھی رہتی ہے۔ یادوں کو اگر ہم تصویریں سمجھیں تو مجھے

لگتا ہے کہ یہ تصویریں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ بلکہ اب بھی کچھ تصویریں بالکل نئی نئی سی دیکھنے کو، یا سوچنے کو ملتی ہیں۔ ایک دوست نے کہا تمہیں یاد ہے جب ہم 'انداز' دیکھنے کے لیے چھ آنے والی لائن میں کھڑے تھے تو تم نے کہا تھا کہ —— اور مجھے قطعی کوئی ایسی بات یاد نہیں تھی —— یادداشت میں اس طرح کے اضافے، خواہ وہ کسی کی فراموشی کی اختراع ہوں، جیسے میری اپنی زندگی کے تجربے میں اضافہ بن جاتے ہیں۔ یعنی زندگی کا ایک ایسا حصہ بھی ابھی باقی ہے جسے میرے دوستوں اور ساتھ چلنے والوں نے اپنے پاس رکھ لیا تھا اور جو اتفاقاً کبھی کبھی مجھے مل جاتا ہے۔

سارا کھیل ہی حافظے کا ہے۔ جو یاد نہیں پتہ نہیں تھا بھی یا نہیں۔ جو یاد ہے وہ اگر نہیں بھی تھا تب بھی ہے۔ وہ لوگ مجھے حیران کرتے ہیں جنہیں بہت پرانی ملاقاتوں کے مکالمے بھی یاد ہوتے ہیں۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ ان یادوں میں پوری صداقت کبھی نہیں ہوتی۔ یہ تو روز کی بات ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ کسی ایک واقعے کو واقعے میں شامل افراد بھی مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں اور نہ اپنے اور نہ دوسروں کے کہے ہوئے جملے انہیں صحیح یاد آتے ہیں۔ تو پھر گزری ہوئی زندگی، جو سچ تھی، وہ بھی ایک افسانہ ہے اور جو میری زندگی تھی، وہ صرف میں نے نہیں گزاری، میرے دوستوں اور عزیزوں نے بھی گزاری ہے۔

ایک اور دنیا بھی ہے جس میں میں رہتا رہا ہوں۔ کتابوں اور فلموں اور سنائے ہوئے واقعات کی دنیا۔ نوجوانی میں تو اس تصوراتی دنیا میں کھو جانے کا احساس بھی رہتا تھا۔ اپنی غریبی اور حالات کی سختی سے فرار ایک جذباتی ضرورت بھی تھا۔

ایک کہانی میں نے پڑھی تھی۔ ایک امیر گھرانے میں آتش دان کے اوپر ایک بڑی تصویر آویزاں تھی جس میں ایک دیہاتی منظر میں ایک لوہار کو دہکتے ہوئے لوہے کو کوٹتے دکھایا گیا تھا۔ صاحب خانہ کو اس تصویر پر بڑا ناز تھا اور وہ اپنے مہمانوں کو یہ بتاتے تھے کہ یہ تصویر تو اتنی حقیقی لگتی ہے کہ آپ اس میں داخل ہو جائیں۔ ان کا سات آٹھ سال کا بیٹا یہ جملہ کئی بار سن چکا تھا۔ ایک دوپہر، جب وہاں کوئی نہیں تھا وہ ایک اسٹول پر کھڑے ہو کر اس تصویر میں چلا گیا۔ گھر والوں نے اسے نہیں پایا تو کہرام مچ گیا۔ بہت تلاش کیا، اخباروں میں خبریں چھپیں۔ پولیس والے تفتیش کرتے رہے۔ بچہ نہیں ملا۔ کئی دن بعد اس کے نڈھال باپ نے اس تصویر کو دیکھا تو وہاں، لوہار کے ساتھ ایک بچہ بھی کھڑا تھا۔ اس بچے کی شکل بھی اس کے بیٹے سے مل رہی تھی اور حیرت کی بات تو یہ کہ پہلے تو اس تصویر میں وہ بچہ تھا ہی نہیں —— مصوری کے فن کے ماہرین کو بلوایا گیا کہ یہ کیا راز ہے۔

ان کا خیال تھا کہ وہ بچہ ہی تو دراصل اس تصویر کا مرکز تھا۔ اس کے بغیر تو وہ تصویر ادھوری بلکہ کسی کام کی نہ رہتی—

تو اسی طرح میں بھی کہانیوں میں گھس جانے کی ایک ذہنی مشق کرتا۔ فلموں کے مناظر میں اپنے آپ کو ڈھونڈ نکالتا اور اس کردار کی طرح سوچنے کی کوشش کرتا۔

یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ جو زندگی میں نے گزاری ہے اس میں بے عملی اور خوابوں میں کھو جانے کا عمل کافی نمایاں رہا— کالج میں داخلہ لیا تو امتحان نہیں دیا۔ کیا بننا ہے۔ کیا سیکھنا ہے۔ اس کا فیصلہ نہیں کیا۔ بے ارادہ، ادھر سے اُدھر بھٹکتا رہا۔ کچھ اتفاقات ایسے ہوئے کہ صحافی بن گیا۔ مطلب صرف یہ ہے کہ بڑی حد تک وقت کی اطاعت کی۔ خود جو کچھ ہوتا گیا، اسے قبول کیا— یعنی انتظار کیا۔

اور اب، جب وقت بہت کم ہے، اس کم ہمتی کا عذاب سہنا پڑ رہا ہے۔ سب سے پہلا عشق کیا اور اس میں ناکامی ہوئی، تو جی چاہا کہ کوئی ایسی صورت ہو کہ چند سال ایک نیم بیداری کے عالم میں گزر جائیں اور جب میں یہ دکھ سہہ سکوں تو پھر دل لگانے کی ہمت پیدا ہو۔ جب بھی گزرے ہوئے وقت نے آزردہ کیا یا مشکل میں ڈالا تو یہی خیال آیا کہ کسی طرح یہ وقت گزر جائے۔ یہ تو کہتے بھی ہیں نا کہ وقت مرہم ہے۔ ہر گھاؤ کو بھر دیتا ہے— ضرور— لیکن کم بخت گزر بھی تو جاتا ہے اور انتظار کرنے والوں نے جو وقت گزار دیا اس کا ازالہ کیسے ہوگا—؟

کہانیوں میں بھی اور سچ مچ بھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی کو پتہ چلے کہ اس کی زندگی کے صرف چند ماہ یا سال باقی رہ گئے ہیں۔ کوئی ایسی بیماری ہے جو جان لیوا ہے اور اگر مریض کو یہ معلوم ہو کہ مثلاً اس کے پاس صرف چھ ماہ یا ایک سال کا وقت باقی بچا ہے تو وہ کیا کرے گا؟ یہاں موت و حیات کے بارے میں فلسفے کے قضیے بھی کھڑے ہوجاتے ہیں۔ مریض کے اپنے مزاج اور جذباتی صحت کا معاملہ بھی اہم ہوجاتا ہے۔ مذہب سے لگاؤ اور ایمان کی قوت سے بھی موت کے استقبال کو ایک باوقار انداز میں نبھایا جاسکتا ہے۔ ایک روّیہ زندگی سے نفرت اور دنیا کو دیوانگی کے عالم میں ٹھکرا دینے کی کوشش کا بھی ہوسکتا ہے۔ فلموں میں تو ہیرو اپنے باقی ماندہ دن دوسروں کو خوشیاں بانٹنے میں گزار دیتا ہے— یا اپنی حسرتیں نکالنے میں کہ اپنا سارا اثاثہ بیچ کر دنیا گھومے، عیش کرے۔ وہ کچھ کرے جس کے خواب اس نے اپنے لڑکپن میں دیکھے تھے۔

یہ تو کہانی کی یا بدنصیبی کی بات ہوئی کہ کسی اچھے بھلے، صحت مند شخص کو یہ معلوم ہوجائے کہ

اب وہ مرنے والا ہے۔ لیکن یہ تو زیادہ عمر کے ہر فرد کی اٹل تقدیر ہے کہ وقت بہت کم ہے اور اب وہ اپنی باقی زندگی کیسے گزارے۔

تو اپنی گزشتہ سالگرہ کے دن میں نے سوچا کہ اب پانی سر سے اونچا ہوا چاہتا ہے۔ کیا کرنا ہے۔ کیا ہے دل میں— جو وقت گزر گیا، اس کے امکانات بھی مفقود ہو گئے۔ انٹرویو کرنے والے ایک سوال کرتے ہیں یا آپ خود اپنے آپ سے یہ پوچھ سکتے ہیں کہ اگر یہی زندگی آپ دوبارہ گزاریں تو آپ اسے کس طرح گزاریں گے— کیا کریں گے اور کیا نہیں کریں گے۔ میرے خیال میں یہ ایک انتہائی فضول اور غیر ضروری سوال ہے۔ بالکل اسی قسم کا کہ کوئی کہے کہ اگر آپ اس ملک کے صدر بن جائیں تو آپ کیا کریں گے— بالآخر تو ہم وہی ہیں کہ جو ہیں— جو جسمانی، ذہنی اور جذباتی ورثہ ہمیں ملا اور جن حالات و واقعات میں ہم نے زندگی گزاری اسی کے حساب سے ہم نے فیصلے کیے۔ وہی بات ہوئی نا کہ اسکرپٹ ہم نے خود نہ لکھا ہو لیکن شاید کہیں نہ کہیں لکھا ہوا رکھا ہے۔ اور یہ جو فیصلہ کرنے کی بات ہے تو اس کی استعداد بھی تو بڑی حد تک مشروط ہوتی ہے۔

انگریزی شاعری کا وہ مشہور حوالہ بھی تو ہے کہ ویرانے میں ایک دوراہا آیا اور میں نے وہ راستہ چنا جو بہت کم لوگوں کی گزرگاہ تھا اور یوں میری زندگی بدل گئی— یہ دوراہے والی بات تو کسی نہ کسی حد تک روزمرہ کے کئی چھوٹے بڑے فیصلوں پر محیط ہے اور بے شمار فیصلے ایسے ہوتے ہیں جن سے زندگی بدل جاتی ہے۔ میری الجھن یہ ہے کہ ہر فیصلہ کرنے والا اپنے مزاج، اپنی ہمت یا بزدلی اور اپنی صلاحیت اور تجربے کا اسیر ہوتا ہے اور اس الجھن سے یہ مشکل سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا، عمر کے آخری سالوں میں کوئی اپنے آپ کو اتنا بدل سکتا ہے کہ وہ گویا ایک بالکل نئی زندگی جئے۔ لوگ حیران رہ جائیں۔ کوئی کہے ارے کیا تم پاگل ہو گئے ہو اور کوئی اور داد دے کہ بھئی واہ— تم نے تو کمال کر دیا۔

کتابوں کی دکانیں اپنے آپ کو بدلنے کے نسخوں سے اٹی پڑی ہیں۔ ایک پورا شعبہ وزن کم کرنے اور صحت مند غذا سے متعلق ہے۔ میلوں ٹھیلوں میں جو شعبدے باز مجمع لگا کر اپنی امرت دھارا جیسی جڑی بوٹیوں والی دوائیں بیچتے ہیں، مغربی اشاعت گھر اسی طرح اپنے اپنے دسترخوان سجاتے ہیں۔ پُرسکون زندگی گزارنے کے روحانی ضابطے بھی کافی مقبول ہیں۔ لیکن زیادہ توجہ دنیاوی کامیابی کے حصول پر دی جاتی ہے۔ کامیاب لوگوں کے گُر سمجھائے جاتے ہیں۔ اپنی ذہنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور زیادہ دولت کمانے کے راستے بتائے جاتے ہیں۔ وہ سالہا سال پرانی مشہور کتاب بھی تو

ہے کہ" پریشان ہونا چھوڑیے اور زندہ رہنا شروع کیجیے۔" اب یہ آپ پر ہے کہ آپ زندہ رہنا کب سے شروع کرتے ہیں۔ کیا یہ کام زندگی کے آخری چند سالوں میں کیا جاسکتا ہے؟

ان تمام کتابوں، تحریکوں اور نصابی سرگرمیوں کی روح یہ ہے کہ آپ وقت کا استعمال کس طرح کریں۔ اپنے کام کو اور جو وقت آپ کے پاس ہے اسے کیسے خانوں میں تقسیم کریں اور مطلوبہ نتائج کا حساب رکھیں۔ مستقل یہ حقیقت دہرائی جاتی ہے کہ انسانی ذہن بے پایاں قوت اور صلاحیت کا منبع ہے اور ہم عام طور پر اس کا عشر عشیر بھی استعمال نہیں کر پاتے۔ قوت ارادی کو بڑھانے کے طریقے بھی موجود ہیں۔ ساتھ ساتھ دوائیں اور ٹوٹکے بھی دوکانوں میں رکھے ہیں۔

بنیادی طور پر تو تعلیم کا بھی یہی مقصد ہے کہ وہ آپ کو زندہ رہنے اور اپنے آپ کو بہتر اور کامیاب بنانے کی تربیت دے۔ علم واقعی کتنا بڑا اثاثہ ہے۔ دولت ہے۔ ہتھیار بھی ہے۔ اس کا تخلیقی استعمال آپ کی کتنی ہی تمناؤں کو پورا کرسکتا ہے۔ اگر آپ اضافی صفات کے حامل بھی ہوں تو پھر وہی ہو جو غریب محلوں کی دیواروں پر لکھے ہوئے اشتہار آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ محبوب آپ کے قدموں میں——

یہ جو محبوب کو اپنے قابو میں کرنے کا معاملہ ہے تو یہ بھی کامیابی اور کامرانی کا ایک اہم مظہر ہے اور جنسی آسودگی بھی زندگی کی ایک لازمی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں اس کا برملا ذکر اور اس موضوع کے مضمرات کی سنجیدہ تشریح مناسب نہیں سمجھی جاتی۔ لیکن بدن کی سچائی زندگی اور وقت اور اپنے اختتام کی طرف رواں عمر میں گندھی ہوئی ہے۔

نوجوانی میں جو عشق کیے تھے اور اب بھی جس جنسی اختلاط کی طلب زندہ ہے، ان میں کوئی تعلق ضرور ہے اور اگر اب یہ احساس دامن گیر ہے کہ زندگی کے دن بہت کم رہ گئے ہیں تو یہ خلش بھی آتشیں ہے کہ کتنی بہت سی محبتیں ادھوری رہ گئیں اور اب ان کا حساب کوئی کیسے چکائے گا—— زندگی کے جو تمغے لوگ اپنے سینوں پر سجاتے ہیں ان میں رومانوی اور جنسی فتوحات کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ لیکن اس تضاد کا کوئی کیا کرے کہ ایک پراعتماد ازدواجی زندگی اور بے غرض محبت سے سرشار خاندان ہی دراصل زندگی کا سب سے بڑا انعام اور سب سے آخری منزل ہے۔ زندگی کا سفر کتنا ہی طویل، کٹھن یا بامراد کیوں نہ ہو، ایک باوفا شریک حیات اور ایسی اولاد سے بہتر کہ جس پر آپ فخر کرسکیں کیا کوئی اور خواہش بھی ہوسکتی ہے؟ یعنی کیا ہو آپ کے پاس کہ آپ یہ کہیں کہ یہ بہت کچھ ہے اور اب سکون کے ساتھ مرجانے میں کوئی حرج نہیں۔ یا یہ کہ اب آرام سے موت کی

دستک کا انتظار کیا جاسکتا ہے۔

میری ہی عمر کے ایک بہت کامیاب اور کئی اداروں کو چلانے والے ایک صنعت کار نے ٹیلی وژن پر انٹرویو دیتے ہوئے اپنی اس حسرت کا ذکر کیا کہ کاش وہ تیس سال بعد پیدا ہوتے۔ یعنی اب ان کی عمر تیس سال کم ہوتی۔ ان کا خیال تھا کہ عالمی بازار میں ہلچل تو اب پیدا ہوئی ہے اور ذرائع ابلاغ کی نئی انقلابی اصلاحات نے تخلیقی ذہن کے لیے حیرت انگیز مواقع پیدا کیے ہیں۔ بے شمار نفع کمایا جاسکتا ہے۔ نئی دنیائیں آباد کی جاسکتی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اس حسرت میں ایک ذاتی نوعیت کی حرص بھی شامل تھی۔ جینے میں اتنے مزے آرہے ہوں، عیش و عشرت کی زندگی ایک لمحے کے لیے ساتھ نہ چھوڑتی ہو تو جی تو چاہے گا کہ دس بیس سال مزید چل جائیں۔ ویسے یہ بھی ممکن ہے کہ اس تبصرے میں نئے زمانے کے نئے امکانات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہو۔ زمانے کیسے بدلتے ہیں یہ بھی تو میری اور ان کی زندگی کا ایک تاریخی تجربہ ہے۔ ذاتی طور پر میں نے اکثر یہ سوچا ہے کہ اپنی عمر کے کس حصے میں مجھے کہاں ہونا چاہیے تھا۔ سن ساٹھ کی دہائی میں حالات حاضرہ سے میری گہری دلچسپی کا آغاز ہوا اور میں بے چین رہا کہ کیوں میں یورپ اور امریکہ میں نہیں تھا۔ سن ارسٹھ کی مئی میں پیرس میں نوجوانوں نے جو انقلاب برپا کیا تھا اس کے حالات پڑھ کر میرے خون کی گردش تیز ہوجاتی تھی۔ اس سے پہلے امریکہ میں صدر کینیڈی کی آمد، ان کا قتل، ان کے بھائی بوبی کا قتل، سیاہ فام رہنما مارٹن لوتھر کنگ کی ولولہ انگیز تحریک اور پھر ان کا بھی قتل — مجھے لگتا تھا کہ میں ان سارے واقعات میں شامل ہونے کا حق رکھتا ہوں۔ اس محرومی کا کچھ ازالہ پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کی عوامی سیاست سے تو ہوگیا لیکن اس کے بعد کے طوفانوں نے تو بے حال کردیا۔

بات یہاں سے چلی تھی کہ کوئی یہ سوچے کہ اسے زندہ رہنے کے لیے کون سا زمانہ یا عہد چاہیے۔ مستقبل کے بارے میں تو کوئی کیا کہے۔ اپنی پسند کے زمانے کا انتخاب تو تاریخ کے البم کو دیکھ کر ہی کیا جاسکتا ہے اور ذہنی مشق کے طور پر یہ سوال بھی پوچھا جاتا ہے کہ آپ ماضی کے کس دور میں پیدا ہونا یا زندہ رہنا پسند کرتے۔ آدمی سوچتا رہ جائے — ہالی وڈ کی تاریخی فلموں کے منظر ذہن کے پردے پر چلنے لگیں۔ میں نے اپنے دفتر کے ایک ساتھی کو 'الف لیلیٰ' کا چسکا لگا دیا اور وہ دنوں اور مہینوں تک طلسماتی عہد کے اس بغداد کو یاد کرتے رہے۔ ان سے تو کوئی سوال کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

ہاں، آج کل کے واقعات سے لوگوں کا ذاتی تعلق اسی نوعیت کا ہوگیا ہے — اور یہ نئے میڈیا کا اعجاز ہے کہ مسلسل یہ کھوج رہتی ہے کہ اب کیا ہوا۔ الیکشن کب ہوگا۔ کون جیتے گا۔ کون صدر بنے گا۔ امریکہ کا صدر کون بنے گا۔ موسموں میں تبدیلی کے عالمی اثرات کیا ہوں گے۔ نئی ایجادات ہم سب کی زندگیوں کو کیسے درہم برہم کر دیں گی اور ان حالات میں مجھ جیسے لوگ یہ سوچتے رہ جائیں کہ ہم تو چلے جائیں گے اور سرخیوں میں چلنے والے سیریل کے اگلے موڑ سے بے خبر رہیں گے۔ کسی وقت بھی جائیں، کئی کہانیاں ادھوری چھوڑ جائیں گے۔

میرے ساتھ بچپن سے یہ مسئلہ رہا ہے کہ جی چاہتا ہے کہ کہیں اور ہوتا۔ اب بھی یہی ہوتا ہے۔ جس طرح دوست یاد آتے ہیں، اسی طرح وہ مقام یاد آتے ہیں جن سے تھوڑی بہت شناسائی ہے۔ حالانکہ یہ جاننا تو ممکن نہیں کہ اس وقت دوستوں کی کس محفل میں کیا گفتگو ہو رہی ہوگی اور ان کے گلاسوں میں کون سا مشروب ہوگا یا اس وقت کس شہر کا کیا موسم ہوگا اور فلاں سڑک پر کس رنگ کی گہما گہمی ہوگی۔ یہ تڑپ اس کہاوت کا شاخسانہ بھی سمجھی جاسکتی ہے کہ جھیل کے اس پار کا سبزہ زیادہ سرسبز لگتا ہے اور کسی نے یہ بھی کہا تھا کہ جب بھی کوئی ریل اسٹیشن سے چلتی ہے، جی چاہتا ہے کہ ہم اس میں بیٹھے ہوتے۔ ویسے ریل کے سفر کی رومانویت اب باقی نہیں رہی۔ اب ہوائی اڈے کے لاؤنج، سفر کی حسرتوں کو بیدار کرتے ہیں۔

ایک خوش قسمتی کا میں ہمیشہ اعتراف کرتا ہوں۔ میں نے سفر بہت کیے۔ ایک صحافی کی حیثیت سے اور پھر کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کے لیے۔ عمر کے آخری سالوں میں البتہ ایک تو یہ خدشہ رہتا ہے کہ کوئی کب تک بلائے گا اور جو اپنی ہی اولاد سات سمندر پار جا بسی ہے تو اس تک جانے کی سکت کب تک رہے گی۔ لندن کے ہیتھرو ہوائی اڈے پر کئی فرلانگ چل کر پرواز بدلنے کے ہر موقعہ پر اب یہ خیال آتا ہے کہ صحت ٹھیک نہ رہی تو پھر کیا ہوگا۔ وہیل چیر میں بٹھا کر کوئی ڈھکیلتا رہے تو کتنی بے بسی کا احساس ہو اور سفر کتنا کٹھن ہوجائے اور سچی بات یہ ہے کہ یہ تو ہونا ہی ہے۔ میرے والدین اسی حال میں امریکہ اور کینیڈا گئے تھے اور یہ میری بہن کا ایسا مشن تھا جس سے ہم سب نے اختلاف کیا تھا۔ پھر جنوبی ایشیا سے باہر یہ ان کا پہلا سفر تھا۔ اس وقت جب میرے والد کی عمر اسی سے ذرا زیادہ تھی۔ لیکن اس سفر نے شاید ان کی زندگی تھوڑی سی اور بڑھا دی۔ مہینوں اس کی یادیں ان کی گفتگو کا مرکز بنی رہیں۔ (میری ماں کبھی نہ بھول پائیں کہ ایمسٹرڈم کے ہوائی اڈے پر ایک اُبلا ہوا آلو ہماری کرنسی میں کتنے روپوں کا تھا)

میں یہ کہہ رہا تھا کہ سفر کے معاملے میں میرا تجربہ بہت وسیع ہے۔ البتہ دنیا کم بخت اتنی بڑی ہے کہ جن مقامات کو دیکھنے کی آرزو نوجوانی میں کی تھی اور ان کی ایک باقاعدہ فہرست بھی بنی تھی، ان میں سے بھی چند ابھی باقی ہیں (مثلاً وکٹوریہ آبشار اور سائبیریا کے برف زاروں کو عبور کرنے والا ریل کا سفر) اس سیاحت مین ایک دفعہ دو سال کے لیے اور دوسری دفعہ ایک سال کے لیے امریکہ میں باقاعدہ قیام بھی شامل ہے۔ پھر بھی دو حسرتیں ایسی ہیں جو اب پوری ہو ہی نہیں سکتیں، اس لیے بھی کہ اب وہ رعنائی خیال بھی تو باقی نہیں۔ یہ دو حسرتیں کیا تھیں؟ ایک ایک سال لندن اور نیو یارک کے مین ہٹن کے جزیرے میں اس طرح رہنے کی کہ شہر کے وسط میں قیام ہو اور تھیٹر دیکھنے، کتابیں خریدنے اور مہنگے ریستورانوں اور شراب خانوں میں وقت گزارنے کے وسائل موجود ہوں۔ عمر ایک خاص حد سے تجاوز کر جائے تو پھر وسائل کے باوجود ایسی زندگی سے لطف اندوز ہونے کی سکت باقی نہیں رہتی۔

میری عمر کے ایک دوست نے اس دن اپنے گھر ایک ضیافت کے لیے مدعو کیا۔ میں نے پتہ پوچھا۔ کہنے لگے گھر وہیں ہے جہاں آپ چار پانچ سال پہلے آئے تھے لیکن اب میں نے پرانے گھر کو گرا کر ایک نیا گھر تعمیر کروا دیا ہے، میں نے سوچا اب بس مزے کریں گے۔ یہ ''اب بس مزے کریں گے'' والی کیفیت جانی پہچانی ہے۔ لیکن میں نے جن حضرات کو اس مرحلے سے گزرتے دیکھا ہے ان کی زندگی کے خالی پن پر ترس آنے لگتا ہے۔ اگر عشق کی سرحدوں کو چھونے والا کوئی مشغلہ پاس نہ ہو تو بھرپور زندگی گزارنے والوں کے آخری دن مشکل میں گزرتے ہیں۔ اس منزل پر پہنچ کر لکھنے پڑھنے والوں اور درس و تدریس کے شعبے سے تعلق رکھنے والوں کو کرکٹ کے کھلاڑیوں پر فوقیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اب یہ معلوم نہیں کہ آخری عمر میں اپنی ذہنی صحت کو بچا لینے سے کیا ایک خاموش اور پس منظر میں گزری ہوئی زندگی کی تلافی ہو جاتی ہے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد کچھ نہ کرنے کا طویل عرصہ —— وہ عرصہ جو مختصر بھی ہو تو طویل لگے —— بظاہر کبھی آرام سے نہیں گزرتا۔ صحت کے مسائل گھمبیر ہونے لگتے ہیں۔ اولاد کی اولاد سے یقیناً دل بہت بہلتا ہے لیکن اب ہم جیسے بیش تر لوگوں کی اولاد پردیس میں آباد ہے اور اولاد کی اولاد سے مکالمہ اس وقت دشوار ہو جاتا ہے جب بچے بولنا سیکھ لیتے ہیں۔ دیواروں پر سجی تصویریں، چیختی چنگھاڑتی ہوئی تنہائی کی خاموش تماشائی بنی رہتی ہیں۔

ایک کوشش بچپن کے دوست مظہر نے کی ہے۔ آخری عمر میں خوش اور آرام سے رہنے

کی — اس کے اپنے حالات کافی غیر معمولی ہیں۔ سالوں پہلے وہ امریکہ جا بسا۔ وہاں ایک ہسپانوی زبان بولنے والی خاتون سے شادی کر لی۔ کوئی اولاد نہیں ہے۔ چند سال پہلے جب وہ لاس اینجلز میں ایک بینک میں ملازمت کر رہا تھا تو ایک دو ہیجان انگیز واقعات ہوئے۔ ایک ڈاکے میں اسے بے قابو کیا گیا۔ پھر وہ بیمار ہو گیا۔ ایسی بیماری جو آسانی سے سمجھ میں نہ آئے۔ ایک ڈاکٹر نے اس سے کہا جناب آپ کا جسم آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ کیا کہنا چاہتا ہے؟ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ اس کا جسم اس سے یہ مطالبہ کر رہا تھا کہ جس اعصابی دباؤ کی زندگی اس کا معمول بن گئی تھی، اس سے نجات ملے۔ حصولِ معاش کی تگ و دو کچھ عرصے کے لیے تھم جائے۔ تو جناب مظہر میاں نے اپنے کمپیوٹر پر اپنی ساری جمع پونجی اور وسائل کا زائچہ کھینچا۔ ان کی بیگم بھی ملازمت کر رہی تھیں۔ ان کے مالی حالات کو بھی جمع تفریق کے خانوں میں رکھا۔ مستقبل میں ہونے والی آمدنی یعنی پنشن قسم کی رقومات کا بھی حساب لگایا۔ اس سارے عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان دونوں نے اپنی نوکریوں سے استعفیٰ دیا۔ اپنا گھر بیچا اور سان ڈیاگو کے ایک نئے محلے میں ایک بہت اچھا گھر خریدا۔ اسے آراستہ کیا اور ایسا انتظام کیا کہ باقی زندگی وہ پوری آسودگی کے ساتھ گزار دیں۔ اپنے گھر میں انہوں نے مہمانوں کے لیے ایک خواب گاہ سجائی اور اس کی تصویر اپنے دوستوں کو بھیجی کہ یہ وہ کمرہ ہے جس میں ہم تمہیں ٹھہرائیں گے۔ آؤ اور ہمارے ساتھ گھومو پھرو — اور وہ دونوں یہی کرتے ہیں۔ کمپیوٹر ایک کھلونا ہے۔ پڑوس کے بچوں سے گہری دوستی ہے۔ فلمیں دیکھتے ہیں۔ بحری جہازوں کے 'کروز' پر جاتے ہیں۔ ہاں، صحت کے مسائل اب بھی چلتے رہتے ہیں۔

ایک اور بندوبست انہوں نے ایسا کیا ہے کہ ان دونوں کے بعد ان کا قیمتی گھر بھی ان کے کسی وارث کے ہاتھ نہیں آئے گا۔ وہ ابھی سے ایک انشورنس کمپنی کی ملکیت ہے اور ایک طرح سے کمپنی انہیں اپنے ہی گھر میں رہنے کا کرایہ بھی دیتی ہے۔ گویا، خالی ہاتھ دنیا سے جانے کی ایک شکل یہ بھی ہے جب کہ جب تک زندگی ہے، جیب کے خالی ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ آخری عمر میں سب سے بڑا خرچ علاج کا ہوتا ہے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ کسی جائزے میں یہ اندازہ لگایا گیا تھا کہ ایک عام شخص ساری زندگی ڈاکٹر، دوا اور اسپتال کی مد میں جتنی دولت خرچ کرتا ہے اتنی ہی رقم اس کی زندگی کے آخری سال کے لیے درکار ہوتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ والدین پر جان چھڑکنے والی اولاد، ان کی آخری سانس تک انہیں چند روز روکنے کے لیے کیا کیا جتن کرتی ہے۔ جہاں مناسب طبی انشورنس اور علاج کے سرکاری سہارے نہیں ہوتے — جیسا کہ ہمارا ملک ہے،

وہاں یہ مرحلہ خاندان پر کتنا بڑا بوجھ بن جاتا ہے۔

تو مظہر کی مثال، جیسا کہ میں نے کہا، اچھوتی ہے۔ وہ لوگ جو ایک بڑے یا مختصر خاندان کے درمیان اپنے آخری دن گزارتے ہیں ان کی صورت حال بہت مختلف ہوتی ہے۔ ایک مسئلہ وراثت کا بھی ہوتا ہے۔ اس کی ایک مادی شکل ہوتی ہے اور ایک روحانی اور جسمانی — اب تحقیق نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ ہم اپنی ذہنی اور جسمانی ساخت اور عمر کے مختلف مراحل میں حملہ آور ہونے والی بیماریوں تک کا ایک اٹل پروگرام لیے پیدا ہوتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں، یہ بھی ایک سوانح عمری ہے جو لکھی جا چکی ہے۔ یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ ہمارا کردار کیا ہوگا، ہمارا جسم اپنی پوری تفصیل کے ساتھ کیسے نمو پائے گا اور کیسے اپنی بہار اور اپنی خزاں کے مراحل سے گزر کر بے جان ہو جائے گا۔ بشرطیکہ کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔ کوئی آسمانی عذاب نازل نہ ہو۔ دیوانگی کی موروثی خصوصیات لے کر پیدا ہونے والے رہنما کسی جنگ کا الاؤ نہ روشن کردیں۔

مطلب یہ ہوا کہ ہم انفرادی طور پر ہر طرح سے پابند سلاسل ہیں۔ بزدلی کا زہر ہو یا جرأت و اختراع کی روشنی یہ سب ہمیں قدرت کی طرف سے ترکے میں ملتا ہے۔ کوئی اپنی اعلیٰ تربیت، قوت ارادی اور ماحول کی مدد سے اپنی بزدلی یا دوسری خامیوں کو زیر کر کے تھوڑی بہت کامیابی حاصل کر لے تو یہ شاید اس سے بڑا کارنامہ ہوگا کہ کوئی جھولی بھر ہمت اور اعتماد لے کر پیدا ہونے والا، سامنے والی پہاڑی پر کھڑے ہو کر اپنا علم لہرا دے۔

اتنی بہت سی باتیں ایک ساتھ جمع ہوگئیں۔ ایک تو یہ کہ اپنے بچوں اور اپنے بہن بھائیوں سے محبت اور ان کی رفاقت، سفر کے آخری مرحلے میں زاد راہ کے طور پر کتنی قیمتی ہے اور یہ تسلی کہ ہماری زندگی کا ایک معنوی تسلسل قائم رہے گا کیسے ایک سہارا بن سکتی ہے۔ دوسری شاید زیادہ اہم، یہ بات ہے کہ ہم اپنے آپ پر اپنے حالات پر قابو رکھنے کی بہت مشکوک صلاحیت رکھتے ہیں۔ کوئی اپنی تمباکو نوشی سے چھٹکارا نہیں حاصل کر پاتا۔ کسی کو اپنی غصے پر قابو پانا نہیں آتا (یا کسی اور کے غصے پر پیار آنے کی لت پڑ جاتی ہے۔) کوئی ذرا سی فکر لے کر ساری رات کروٹیں بدلتا ہے اور کوئی مصائب کے طوفان میں گھرا، میٹھی نیند سوتا ہے۔ ڈر ڈر کر یا سر اٹھا کر، سب جی لیتے ہیں اور سب مر جاتے ہیں اور میں ابھی ہوں اور اپنے سفر کے باقی ماندہ فاصلوں کو ہنس کر، یا جس حد تک ممکن ہو خوش رہ کر گزارنے کی خواہش رکھتا ہوں۔ خواہش ہی نہیں، ایک شعوری جدوجہد کا ارادہ بھی ہے۔

خوش رہنے کی خواہش بھی ہے اور کئی کئی دن ایسے گزرتے ہیں کہ مسلسل دل ڈوبا سا رہتا

ہے۔ ایک زمانے میں یہ میرا تکیہ کلام سا بن گیا تھا کہ "دل گڈھے میں ہے" اور یہ جملہ مذاقاً کہا جاتا تھا۔ لیکن یہ جو ایک افسردگی کی کیفیت دل و دماغ پر دھند کی طرح چھا جاتی ہے اسے "ڈپریشن" ہی کہا جاسکتا ہے۔ یہ شاید وہ مریضانہ احساسِ بے چارگی ہے جو ایک نفسیاتی مرض کے طور پر بہت عام ہے۔ ہمارے ملک میں ہی نہیں بلکہ ہر ملک میں— یہ بھی ممکن ہے کہ مغربی معاشروں میں یہ زیادہ عام ہو کہ وہاں دولت کمانے اور کامیابی کے حصول کے لیے کی جانے والی مسابقت سے لوگوں میں تنہائی اور بے گانگی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ یوں بھی وہاں خاندان اور رشتوں کے سہارے بہت کمزور ہو چکے ہیں (اور اب ہمارے یہاں بھی شہری زندگی کے فروغ اور روزگار کے لیے نقل مکانی کی وجہ سے رشتے کمزور ہو رہے ہیں۔)

میں کیوں گاہے گاہے کسی انجانی افسردگی کا شکار رہتا ہوں؟ کیا عمر کے آخری مرحلے میں بیش تر لوگوں کی یہی کہانی ہوتی ہے؟ جب میں اپنی بیوی سے یا دونوں میں سے کسی ایک بیٹی سے اپنی اداسی کا ذکر کرتا ہوں تو ہمدردی کے بجائے وہ غصے اور ناراضگی کا اظہار کرتی ہیں۔ میری مشکل یہ ہے کہ ان کا اعتراض بالکل بجا ہے۔ ایسی کوئی وجہ ہی نہیں ہے کہ میں بوریت یا اس سے بڑھ کر قنوطیت کا شکار ہو جاؤں۔ اپنی خوش نصیبی کے بارے میں سوچتا ہوں تو حیرت بھی ہوتی ہے کہ اتنا کچھ میرے پاس ہے۔ کوئی حادثہ ہو جائے، کوئی آفت آجائے تو صورت حال فوراً تبدیل ہو سکتی ہے۔ میں اِدھر اُدھر ایسا ہوتے دیکھتا بھی ہوں۔ لیکن فی الحال تو زندگی کے اتنے احسانات ہیں کہ ان کو بیان کرنے سے ڈر لگتا ہے۔ لوگ دیکھ کر رشک کرتے ہوں گے۔

تو پھر میں افسردہ کیوں رہتا ہوں؟ ایک وجہ اس کی یہ ہو سکتی ہے کہ مجھ میں خوش ہونے کی صلاحیت ذرا کم ہے۔ آپ اسے ناشکری بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ تو میں کہہ چکا ہوں کہ شروع ہی سے گزرتے وقت سے یہ میرا رشتہ کچھ غیر رسمی سا رہا ہے۔ کچھ کرنے سے انتظار کرنا زیادہ بھلا لگتا تھا۔ اندر سے یہ یقین سا تھا کہ کوئی باطنی قوت میری حفاظت کرے گی اور مجھے ان دیکھی آفات سے کبھی دوچار نہ ہونا پڑے گا۔ کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ قسمت مجھ پر بہت مہربان رہی۔ جب بھی حساب لگایا، خود کو نفع میں پایا۔ اس لیے بھی کئی ایسی چیزوں کی تمنا ہی نہیں کی جو کم ظرف یا لالچی لوگوں کو عزیز ہوتی ہیں۔ پتہ نہیں کیوں، نوجوانی کے زمانے میں بھی میں نے کبھی ستاروں کو چھو لینے کی تمنا نہیں کی اور بڑی حد تک جو چاہا وہ پا لیا۔ ایسی خوش نصیبی کا دعویٰ کتنے لوگ کر سکتے ہیں۔

اس خوش نصیبی کے ساتھ ساتھ یہ افسردگی بھی ہے کہ جیسے کسی ایسی چیز کی طلب ہے جس کا

مجھے علم بھی نہیں — میں آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں۔ کیا چاہیے بھائی تم کو —؟ ہاں، کچھ ایسی وحشی خواہشات ہو سکتی ہیں کہ جن کے پورے ہونے سے میری زندگی عذاب بن جائے — مثلاً میں کسی کم عمر حسینہ کے عشق میں دیوانہ ہو جاؤں اور یہ وبال اور بھی جان لیوا بن جائے کہ اگر یہ محبت یک طرفہ نہ رہے پھر کیا ہوگا؟ کیا سب کچھ، اتنا پیارا گھر، محبتوں سے سرشار یہ خاندان، ریزہ ریزہ نہ ہو جائے گا؟

نفسانی خواہشات ہر ایک کے دل میں چھپی ہوتی ہیں لیکن میں نے اپنے ذہنی سکون اور اپنی خانگی زندگی کے تقدس کی خاطر خود کو کئی لغزشوں سے بچائے رکھا ہے۔ میں اسے اپنی سمجھ داری کہتا ہوں۔ یہ معاشیات کا ایک تصور ہے کہ ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ یعنی ہر فیصلے یا جذباتی عمل کی بھی ایک قیمت ہوتی ہے۔ کچھ چیزیں دوکان میں سجی اچھی لگتی ہیں۔ آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہیں۔ بازار کا نظام بھی ایسا ہوتا ہے کہ کئی اشیاء، سچی ضرورت کے نہ ہوتے ہوئے بھی، ایک اضطرابی کیفیت میں اٹھالی جاتی ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا۔

مجھے خوشی ہے یا اب مجھے اس کا ملال ہے؟ لیکن نہیں۔ میری افسردگی ذرا زیادہ گہری ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ کئی بار میں فیصلہ نہیں کر سکا کہ اپنی زندگی کس طرح گزاروں۔ برٹینڈرسل نے اپنی خودنوشت کی پہلی سطروں میں ان تین جذبوں کا ذکر کیا کہ جو ان کی نظر میں ان کی پوری زندگی پر چھائے رہے۔ ایک محبت کی شدید تمنا، دوسرے علم کی جستجو اور تیسرے انسانیت کو جو مصائب درپیش ہیں ان کے لیے ناقابلِ برداشت رنج اور ہمدردی۔ انہوں نے لکھا: ''یہ جذبے، طوفانی ہواؤں کی طرح مجھے اِدھر سے اُدھر اُڑاتے رہے ہیں اور کرب کے ایک گہرے سمندر کو عبور کر کے یہ مجھے مایوسی کی آخری حدوں تک لیے جاتے رہے ہیں۔''

محبت کی طلب کو انہوں نے یوں مقدم جانا کہ یہ ایک والہانہ سرشاری اور سرمستی کو جنم دیتی ہے۔ ان کی نظر میں اس سرشاری کی شدت اتنی گہری تھی کہ وہ صرف چند گھنٹوں کے لیے اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے اپنی باقی زندگی کو قربان کر دیتے۔ ایک اور وجہ اس محبت کی تلاش کی انہوں نے یہ بیان کی کہ اس سے احساسِ تنہائی میں کچھ کمی آجاتی ہے۔ اس خوفناک احساسِ تنہائی سے جو ایک ذی شعور کو زندگی کی سرحدوں سے پرے ایک لامحدود گہرائی کا منظر دکھاتی ہے۔

برٹینڈرسل اسی انداز میں بات آگے بڑھاتے ہوئے اپنی شاندار اور حیات افروز زندگی کی تفصیلات پیش کرتے ہیں۔ میں نے جب بہت سالوں پہلے ان کی خودنوشت سوانح حیات پڑھی تو

یہ جان کر میں حیرت زدہ رہ گیا کہ ایک شخص صرف ایک زندگی میں کتنا کچھ کرسکتا ہے۔ محبت بھی، علم کا حصول بھی اور بنی نوع انسان کی بھلائی اور بقاء کی جدوجہد بھی — لیکن یہاں ان کا ذکر اس لیے مناسب ہے کہ وہ اپنی آخری عمر میں بھی سرگرم عمل رہے۔ جیے بھی بہت — تین چار سال اور جی لیتے تو سو برس کے ہو جاتے اور آخری وقت تک انہوں نے اپنی ذہانت اور فکر کو تابندہ رکھا۔ فلسفی بھی تھے اور ریاضی داں اور ادیب اور اپنی عمر کے آخری سالوں میں، ایٹم بم کے خلاف عالمی تحریک کے روحِ رواں بھی — اپنی خودنوشت ہی انہوں نے عمر کے آخری سالوں میں لکھی۔

تو کیا عمر کے جو چند سال باقی ہیں ان میں کچھ بڑے کام بھی کیے جاسکتے ہیں؟ اس ضمن میں برٹینڈ رسل کی مثال شاید جائز نہیں کیونکہ انہوں نے تو اپنی نوجوانی ہی میں بڑے بڑے کام کرلیے تھے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں کاہلی اور کام چوری اور ٹال مٹول کے ایک لمبے سفر کے بعد، اس آخری پڑاؤ پر اپنے روز و شب کا حساب کر رہا ہوں۔ رسل کے علاوہ بھی کئی نام ہیں جو یہ امکان جگاتے ہیں کہ آخری عمر میں بھی اہم تخلیقی کام کیے جاسکتے ہیں۔

ہمارے اپنے ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی بھی تو تھے۔ جب اسّی سال سے زیادہ ان کی عمر تھی تو وہ سارے سارے دن تجربہ گاہ میں کھڑے ہوکر کام کرتے تھے۔ ایک مسئلہ تو صحت کا ہے کہ کوئی آخری عمر میں کام بھی کرے اور چل پھر بھی سکے۔ لیکن میری نظر میں زیادہ اہمیت ذہنی صحت کی ہے۔ یہ خوف دہلا دیتا ہے کہ حافظے کو تاراج کردینے والی کوئی بیماری اچھے بھلے صحت مند جسم کو کھلونا بنا دے۔ سٹھیا جانے کا مسئلہ بھی اپنی جگہ ہے گو اس بوجھ کے ساتھ رو دھو کر جیا جاسکتا ہے۔ جسے 'الزائمر' کہتے ہیں وہ بیماری خود مریض کے لیے ہی نہیں، اس کے عزیزوں اور چاہنے والوں کے لیے ناقابلِ برداشت عذاب بن جاتی ہے۔ حافظہ اور فراموشی، یہ ایک الگ موضوع ہے اور ادب اور فن میں اس کا حوالہ بار بار ملتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کو میں نے اس لیے یاد کیا کہ ان کی طویل العمری دونوں معنوں میں بامراد تھی۔ یہ ریسرچ ہوئی ہے کہ وہ افراد جو اپنی ذہنی صلاحیتوں کا مسلسل استعمال کرتے رہتے ہیں، فراموشی کی یلغار سے زیادہ محفوظ رہتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اب سائنس داں ہمیں یہ بتا رہے ہیں کہ ہماری پوری زندگی کی صحت کا نقشہ ان جنیات میں ہوتا ہے جنہیں ہم لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ اگر کوئی بم کے دھماکے میں یا کار کے حادثے میں قبل از مرگ نہ مرجائے تو سارا منظرنامہ پہلے سے تیار ہے کہ کس عمر میں دل کی دھڑکن میں خلل پیدا ہوگا یا ہڈیوں کے جوڑ کھڑکھڑانے لگیں گے یا خون

میں شکر کی افراط ہو جائے گی یا گردے ہمت ہار بیٹھیں گے۔ یہ ایک نیا استعارہ ہے تقدیر کا—

ہاں، تو ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی— مجھے یاد ہے۔ انیس سو اسی کے آس پاس، ایک دعوت میں میں نے ان سے پوچھا تھا کہ ان کی طویل العمری اور اس عمر میں بھی کام کرتے رہنے کا راز کیا ہے۔ کتنے پیار اور دھیمے لہجے میں وہ بات کرتے تھے۔ تین باتوں کا انہوں نے خاص طور پر حوالہ دیا تھا۔ پہلی بات یہ کہ محبت کرو— شدت کے ساتھ۔ دوسری محنت کرو— اور تیسری یہ کہ کسی سے حسد نہ کرو۔ کتنا اچھا فارمولا ہے جیسے وزن کم کرنے کے لیے ڈاکٹر مقررہ غذا کا ایک نظام تجویز کرتے ہیں یہ عمر بڑھانے کا ایک روحانی نسخہ ہے۔ محبت کرنے کی جو انہوں نے بات کی تھی— شاید عشق کا لفظ بھی انہوں نے استعمال کیا تھا۔ تو اس کا احاطہ بظاہر برٹینڈ رسل کی محبت سے وسیع تھا۔ ہاں، اس میں جسمانی اختلاط کی اولیت تو واضح تھی۔ یعنی صنف مخالف سے (بہت کم لوگوں کے لیے ہم جنس سے) ایک دیوانہ وار محبت۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ حسن سے، اپنے نظریات سے، انسانیت کی اعلیٰ قدروں سے بھی ایک جذباتی لگاؤ— اس کے بعد جو محنت کرنے والی بات انہوں نے کی، تو وہ بھی واضح ہے۔ لیکن اس شعبے میں، میں نے سوچا میری کارکردگی بہت اچھی نہیں۔ عادتیں، بیش تر نوعمری ہی میں پروان چڑھتی ہیں اور میں نے عمر کا وہ عرصہ ایک حیرت انگیز لاپرواہی میں گزار دیا۔ رہی کسی سے حسد نہ کرنے کی بات تو اس ضمن میں میں خود کو کیسے پرکھ سکتا ہوں۔ حسد اور رشک کے فرق کو جانے دیجیے۔ کسی سے جلنا— یا حرص کرنا یا صرف للچاتی ہوئی نظروں سے کسی چیز کو یا کسی کی حیثیت کو دیکھنا— کیا یہ بالکل فطری بات نہیں ہے کہ کسی نہ کسی انداز میں، اپنے ظرف اور ضبط کے باوجود کوئی ان چیزوں کی تمنا کرے جو اس کے پاس نہیں ہیں؟

خیالات کے اس الجھاؤ سے قطع نظر، میری سمجھ میں ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کی بات اچھی طرح آ گئی۔ یہ مزاج کا معاملہ ہے اور اس کی ایک اخلاقی جہت بھی ہے۔ جسے ہم نفسِ مطمئنہ کہتے ہیں وہ اس مزاج کا نقطۂ عروج ہے۔ یہ ایک انتہائی اہم بات ہے کہ کوئی اپنے آپ کو حسرتوں اور خواہشات کی یورش سے بچائے رکھے۔ بڑی حد تک میں اس عمل میں خود کو کامیاب سمجھتا ہوں۔ مثلاً اگر کوئی بہت قیمتی کار میں بیٹھتا ہو اور عالیشان گھر میں رہتا ہو تو اس سے کبھی حسد پیدا نہیں ہوتا۔ کوئی اقتدار میں ہو، سرداری کا تاج پہنے ہو تو حسد تو دور کی بات ہے، اچھا لگتا ہے کہ ہم ایسے نہیں— پھر بھی کئی لوگ ہیں جن کو دیکھ کر اپنے اندر ایک خلا سا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کیا کمی مجھ میں رہ گئی۔ یہاں تو میں ہار گیا اور یہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کے اہم فیصلے بے جھجک کر بیٹھتے ہیں۔ جو اپنی

تخلیقی صلاحیتوں سے سب کو حیران کردیتے ہیں۔ جو برٹرینڈ رسل بن جاتے ہیں۔ سلیم الزماں صدیقی بن جاتے ہیں۔ میں بہت متاثر ہوتا ہوں ان لوگوں سے جو ہجرت کرتے ہیں اور کسی نئے ملک میں ایک نئی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔ جو انجانے میں چھلانگ لگا دیتے ہیں۔ جو خطرات سے کھیلنا جانتے ہیں۔

مسئلہ اب میرے لیے یہ ہے کہ کیا اب یقینی طور سے تھوڑے سے بچے وقت میں، ان محرومیوں کا ازالہ کیا جاسکتا ہے؟ اس سوال کا آسان اور صحیح جواب تو یہی ہے کہ نہیں — اور اس جواب کو تسلیم کرلینے کے بعد میں اس میں ترمیم کرکے اسے دوبارہ اسکرین پر پھیلانا چاہتا ہوں۔ نیا سوال یہ ہے کہ جو بچا ہوا وقت ہے، اس کے انتہائی امکانات کیا ہیں اور کیا میں ان کو حاصل کرسکتا ہوں؟

یہاں مجھے انگریزی کا وہ جملہ یاد آ گیا جو میں کئی بار اپنے کالموں میں استعمال کرچکا ہوں۔ یہ کہ پُر امیدی کے ساتھ سفر کسی مقام تک پہنچنے سے بہتر ہے۔ اقبال نے بھی تو کہا تھا کہ ''حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں۔'' جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ ہمیں کہیں پہنچنا ہے۔ کوئی ہدف حاصل کرنا ہے تو بات غیر اہم ہوجاتی ہے کہ اس راہ میں ہم پر کیا گزرے گی۔ پردیس میں خاص طور پر امریکہ میں، کسی ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کا نقشہ بنایا جاتا ہے تو یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ راستہ کم سے کم وقت میں طے ہو یا شجر سایہ دار سے آراستہ ہو اور رکنے اور ستانے اور منظر کو نگاہوں میں سمو لینے کی مہلت بھی ملے۔

وہ جو حسد والی بات ہے، اس کا ایک پہلو وہ کشمکش ہے جو ساری زندگی تنگ کرتی رہی ہے۔ اس کا تعلق اس ہمہ گیر اور تاریخی سوال سے ہے جو مذہب اور فلسفے اور انسان کی نفسانی طلب پر محیط ہے۔ یہ کہ آخر ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے اور ہم اسے کس طرح گزاریں کہ اس کا حق ادا ہوجائے۔ جو کشمکش والی بات ہے اس کا حوالہ برٹرینڈ رسل کی ان خواہشات میں موجود ہے جنہوں نے اس کی زندگی کو ایک ہیجان میں زندہ رکھا۔ اگر محروم لوگوں کی اذیت بھی آپ اپنے دل میں محسوس کریں اور ایک اچھی، مہذب اور حسن ونغمہ سے معمور زندگی کی تڑپ بھی آپ محسوس کریں تو پھر کیا کیا جائے — ؟ لندن اور نیویارک میں تھیٹر دیکھنے اور وہاں کے مے خانوں میں شامیں گزارنے کا ارمان بھی ہو اور اپنے ملک میں سماجی انصاف اور آزادی کی تحریکیں بھی آواز دے رہی ہوں تو ...... اور کشمکش کا نتیجہ یہی رہا کہ اُدھر بھی رہے اور اِدھر بھی رہے اور گھر میں رہے تو پردیس بلاتا رہا اور پردیس گئے تو گھر یاد آتا رہا —

اب کیا کیا جائے؟ اپنے ہم عمروں میں سے کئی کو دیکھتا ہوں تو انھوں نے تو فیصلہ کرلیا ہے۔ ان میں سے ایک کا یہ جملہ یاد آیا: ''اب آرام کریں گے۔'' اس آرام کی منزل پر پہنچنے سے پہلے انھوں نے ایک بڑا گھر بنایا۔ بچوں کو امریکہ میں آباد کیا۔ اپنے اور اپنی بیوی کے لیے ملازموں کی خدمات حاصل کیں۔ کبھی برج، کبھی گالف، کبھی جزیرے، کبھی پہاڑ۔ ظاہر ہے کہ یہ مواقع ہر ایک کو حاصل نہیں۔ لیکن میرا مسئلہ یہ ہے کہ کیا زندگی سے رخصتی کا یہ انداز ایسا ہے جس کی تیاری کی جائے؟ اور اگر میں بھی یہ کرسکوں، تو کیا یہ ایک اچھا فیصلہ ہوگا؟ ہاں، میری اپنی کہانی کا منظر نامہ شاید اس طرح مختلف ہو کہ برج کی جگہ کتابیں ہوں اور یہ فیصلہ تو اہم ہے کہ جو کچھ بچا ہے اسے چرائے ہوئے مال کی طرح اڑا دیا جائے۔ چرایا ہوا مال؟ یہاں تو لگتا ہے کہ زندگی ہی وہ مال ہے جو چرایا ہوا ہے اور پتہ نہیں کس لمحے یہ پوری کی پوری خرچ ہو جائے۔

(ناتمام)

زہرا نگاہ

میں بچ گئی ماں

میں بچ گئی ماں
میں بچ گئی ماں
ترے کچے خون کی مہندی
میری پور پور میں رچ گئی ماں
میں بچ گئی ماں

گر میرے نقش ابھر آتے...
وہ تب بھی لہو سے بھر جاتے
مرا قد جب تھوڑا سا بڑھتا
مرے باپ کا قد چھوٹا پڑتا

مری آنکھیں جب روشن ہوتیں
تیزاب کا سرمہ لگ جاتا
ہر خواب ادھورا رہ جاتا

سٹے وٹے میں بٹ جاتی
یا کاری میں کام آجاتی

کبھی چنی سر سے ڈھلک جاتی
تو بھائی کی پگڑی گر جاتی

تری لوری سننے سے پہلے
میں اپنی نیند میں سو گئی ماں
انجان نگر سے آئی تھی
انجان نگر میں کھو گئی ماں

میں بچ گئی ماں
ترے کچے خون کی مہندی
میری پور پور میں رچ گئی ماں۔

کشور ناہید

برگد، فاختہ اور میں

لارنس گارڈن، کریملن اور کینڈی میں
بوڑھے برگد کے نیچے لٹکتی ہوئی داڑھیاں
اوپر پھیلی شاخوں میں جھولتے پرندوں کی
چہچہاہٹ، آج کا صحیفہ کھولتی ہیں
اور بوڑھی لٹکی داڑھیاں ہڈ بیتی سناتی ہیں
سناتی ہیں کہ گلابی لہراتے دوپٹے
پینگ بھرتے بھرتے
کیسے سفید دوپٹوں میں تحلیل ہو گئے
ریشمی خوابوں کی طنابیں ڈھیلی پڑتے پڑتے
گانٹھیں باندھنے کے باوجود
کوئی بھی وعدہ نبھانے کی دہلیز پہ نہ آ سکی
چنگیر میں رکھی تازہ روٹیوں کی طرح
گرم لمس میں لپٹے بدن
کب کے ڈھول میں اٹے سائے بن چکے ہیں
آج باسی اور بھوسلی رنگتوں کو پہنے
اکیلے بیٹھے، یادوں کی جمع پونجی سنبھالتے
سنبھالتے،

نظر اٹھاتی ہوں، تو بوڑھی فاختہ میری طرح تک رہی ہے
برگد نے ہر کہانی کو اپنے بازوؤں میں لیا ہوا ہے
بوڑھی فاختہ اور سائے میں بیٹھی میں اور وہ سب لوگ
اپنی اپنی عمروں کی زنبیل کھولتے ہوئے
گزرے ہوئے کل کے سوالیہ نشان بنے ہوئے ہیں۔

لمبی مختصر کہانی

کیا مغرب میں بیٹے ماؤں سے پیار کرتے ہیں
نہیں
تو پھر مائیں بیٹوں سے پیار کرتی ہیں
نہیں
پاکستان میں بیٹے ماؤں سے پیار کرتے ہیں
نہیں
تو پھر مائیں بیٹوں سے پیار کرتی ہیں
ہاں
سبب
بڑھاپے میں سہارا بنیں گے
انجام
اولڈ پیپلز ہوم!

سیڑھیوں پہ ٹھہری عمر

زندگی کے سال ایسے بڑھتے ہیں
جیسے جنگلوں میں خودرو گھاس
جیسے ساحلوں پہ ٹوٹی ہوئی کشتیاں
جیسے لکڑی کے بوسیدہ دروازے کی چرچراہٹ

جیسے زردائے کاغذ پہ پھیکے پڑے ہوئے حرف
جیسے ہر کمرے میں بکھری ہوئی یادیں
جیسے آنکھوں پہ لگے چشمے کا بڑھتا ہوا نمبر
جیسے ہڈیوں میں بھربھرے پن کا احساس
جیسے ریت میں منتقل ہوتے دریا

زندگی کے سالوں کو سمیٹو تو
مونگ پھلی چھیلتے ہوئے
قہقہوں کی بارش
آتشدان میں دہکتی لکڑیوں کی گرمائش
سردیوں کی راتوں میں لپٹے ہوئے جسموں کے سائے
چنار کی طرح دہکتے رخسار
اور سمندر کے جھاگ کی طرح پیروں سے لپٹے ہوئے لمحات
اتنے سارے لمحات کو پکڑتے پکڑتے
میں تھکتی نہیں ہوں
مرجھاتی نہیں ہوں
ریت میں بھنتے ہوئے مکئی کے دانوں کی طرح
میں کھل اٹھتی ہوں۔

فہمیدہ ریاض

قِصّہ ریمنڈ ڈیوس

آیا تھا ریمنڈ ڈیوس بدنہاد و بدلقا
زعم جس کو قوّت و ثروت پہ امریکہ کی تھا
قتل پاکستان کے فرزند دو اس نے کیئے
وہ بھی سب کے سامنے، ناگفتنی تھا ماجرا
جوش و جذبے سے مگر تھرّا گئی ملّت تمام
قوم کی رَگ رَگ میں غیرت سے لہو تھا کھولتا
آ گئے سڑکوں پہ نعرے مارتے سب مرد و زَن
بچہ بچہ قوم کا اَب طالبِ انصاف تھا
کتنے دن تک گونجتے نعروں سے لرزا آسماں
''اس لعین الدہر امریکہ کو ہم دیں گے سزا''
بعدازاں قصاص دے کر وہ تو رُخصت ہوگیا
مخمصے میں لوگ تھے اِن وارثوں کا کیا ہوا
یہ خبر آئی کے وارث لے کے اپنے گرین کارڈ
سوئے امریکہ روانہ ہو چکے ہیں برملا
اب نہیں دیتا تھا پاکستانیوں کو گرین کارڈ

گویا امریکہ کے مُنھ پر اس طرح جوتا پڑا
تھی کروڑوں کی رقم قصاص کی کس کو ملی؟
کہتے ہیں ان میں بڑی وارث نہ تھے جو یاخدا!
اس رقم سے سچ ہے کچھ ہم کو نہ حاصل ہو سکا
خیر اوّل روز سے مقصد ہمارا یہ نہ تھا
ہم کو ہے ہر گام پر اللہ بس باقی ہوس
اعتکافوں میں بسر کرتے ہیں شاہیں باصفا

کہہ گئے مولانا رومؔی عاقلوں کے واسطے
ایسے ہی موقعوں کی خاطر قولِ دانا ہے بنا
''دور سے آیا نظر جب ہم کو اپنا مہ جبیں
ہاتھ میں ساغر لیے، چہرہ لیے خورشید سا
شور و شر و نفع و ضر و خوف و امن و جان و تن
آیا اک سیلاب اور سب کچھ بہا کر لے گیا
نیم شب آئی سحر، اُٹھا مؤذن، بانگ دی
عاشقو اُٹھو کرو اپنی نمازیں پھر اَدا''

خواجہ رضی حیدر

عداوت کی تھکن

مجھے احوال لکھنا ہے
گزشتہ عمر کے بے فیض لمحوں کا
مگر الفاظ نم آلود کاغذ پر
اُبھرتے ہی نہیں ہیں
بے ثمر معنیٰ کسی مفہومِ تازہ کے
کفن میں خوں چکیدہ ہو چکے ہیں
دل میں اک زخمی خموشی گونجتی ہے
اور کہتی ہے... چلو چھوڑو
قلم کو ہاتھ سے رکھ دو
تم اپنے عہدِ وحشت کا
کہاں تک رائیگاں احوال لکھو گے
کہیں ایسا نہ ہو
اپنے سخن میں
تم ہی آخر موردِ الزام ٹھیرو
راہِ بے منزل تذبذب کا
عجب صحرا ہے جس میں
دل سنبھلنے کا کوئی رستہ نہیں ہوتا

تمھاری موجِ آزردہ خیالی پر
شبِ گریہ کناں میں کون ہنستا ہے
قلم کو ہاتھ سے رکھ دو
گزشتہ عمر کے احساسِ کلفت آشنا سے
نرم خو باہر نکل آؤ
محبت کے تحیّر خیز صحرا سے
اٹھاؤ جسم کو اپنے
کہ اس تنہا مسافت میں
عداوت کی تھکن اکثر ہلاکت خیز ہوتی ہے
قلم کو ہاتھ سے رکھ دو
تعلق بے تعلق ہو رہا ہے

صبر کی آگ

مجھے کچھ لوگ ہر دم صبر کی تلقین کرتے ہیں
مگر وہ ذائقے سے صبر کے واقف نہیں ہیں
صبر کی تلخی مرے احساس میں
سہمی ہوئی اک انتقامی آگ ہے
جس کو مقدس لفظ
ٹھنڈا کرنے کی کوشش میں اب
معدوم ہوتے جا رہے ہیں
اس فضا میں صبر کی تلقین
آنکھوں میں اُداسی گھولتی ہے
اور پیہم انتقامی آگ
سرکش ہو رہی ہے

المدد یا کاشفِ قلب ونظر!
اے قوتِ بے قوتاں
معبودِ برحق المدد!
اَب صبر کا دامن
مرے ہاتھوں سے چھوٹا جا رہا ہے

جد و جہد

ہم لوگ اگر خاموش رہیں گے تو
یہ خاموشی تقدیر ہماری ہو جائے گی
ایسی صورت میں ضروری ہے
ہم شور مچائیں
دشمن کو اپنے ہونے کا احساس دلائیں
ورنہ دشمن خاموشی کو
ہماری ہار تصور کر کے
خود کو مضبوط سمجھ بیٹھے گا
اس جنگ میں
خود کو مجبور سمجھنا
اک ایسی غلطی ہو گی
جس کا انجام فقط موت ہے
شور ہمارے وجود اور ہمارے
جذبات میں شامل
جہدِ مسلسل کی آگ کا
موہوم شرارہ ہے
یعنی اب ہمارا انتہائی سہارا ہے

کلینکل ڈیتھ

صرف اک دل ہے جو حرکت کر رہا ہے
اور سناٹا بدن میں منجمد ہے
حرفِ ناگفتہ خموشی کا کفن پہنے
کسی اظہار کی ساعت سے ملنا چاہتے ہیں
بند آنکھوں میں گزشتہ رونقیں
سر کو جھکائے منتظر ہیں
ایک ایسی روشنی کی
جو نئے منظر جگادے
ذہن کے بارے میں اب تک
کوئی رائے سامنے آئی نہیں ہے
ایک کمرے میں معالج
تجزیوں میں وقت اپنا کاٹتے ہیں
اور نرسیں سرد ہونٹوں پر
لپسٹک کے دبیز استر سجائے گھومتی ہیں
میں بھی اس ماحول میں خاموش سا بیٹھا ہوا
اندازوں کے دلدل میں دھنستا جارہا ہوں
زندگی اور موت کے مابین سب ساکت کھڑے ہیں
صرف ایک دل ہے جو حرکت کر رہا ہے
بے نتیجہ لڑ رہا ہے

تنویر انجم

سورج نکلنے سے پہلے

پرندہ مل گیا مجھے شاخ پر بیٹھا
کہا میں نے اس سے
چلے چلو میرے ساتھ سمندر کی طرف
اگر تمہیں فرصت ہے
وعدہ کیا ہے اس نے آسمان سے ملانے کا
مگر مجھے تو جانا ہے گلہری کے پاس
پرندے نے کہا
وعدہ کیا تھا اس کے ساتھ وقت گزارنے کا
راستے میں پڑے گا اس کا گھر
کہو تو لے لیں اسے بھی ساتھ
ہاں کیوں نہیں
میں خوش ہوگئی
مگر اداس ہوگیا درخت
سمندر کے پاس تو تم بہت وقت لگا دو گے
آ جاؤ گے کیا میرے سونے سے پہلے
تھوڑا غصہ آ گیا پرندے کو
کیا قیامت آ جائے گی

اگر جاگ لو گے تم آج کچھ زیادہ رات تک
یا سونا چاہو تو سو رہنا
لے جا تو نہیں سکتے ہم تمہیں اپنے ساتھ
چھوڑ کر درخت کو اکیلا اور ناراض
ہم چلے گئے سمندر کے پاس
گلہری کو لیتے ہوئے
کیسے جائیں گے ہم آسمان سے ملنے
پوچھا میں نے سمندر سے تھوڑا پریشان ہو کر
تمہاری لہریں تو ہمارا وزن اٹھا نہیں پائیں گی
پریشان مت ہو، دلاسہ دیا سمندر نے
بلایا ہے میں نے ایک مچھلی کو
آتی ہی ہوگی
لے جائے گی تمہیں آسمان سے ملانے
وہ کہیں جاتا تھوڑا ہی ہے
اپنی جگہ ہی رہتا ہے
کھیلو جب تک تم لہروں کے ساتھ
اتنی بہت سی تو ہیں
کھیلتے رہے ہم لہروں کے ساتھ کچھ دیر تک
پھر آ گئی مچھلی گہرائیوں سے سمندر کی
برا سا منہ بناتی ہوئی
چلو بنا لو مجھے اپنی کشتی
لگتا ہے میں تو نوکر ہوں
سمندر اور اس کے مہمانوں کی
سمندر اس کی بات پر کچھ دیر کو ذرا بپھر سا گیا
ہم تو ڈر ہی گئے

مگر مچھلی کو کوئی ڈر نہیں تھا سمندر کا
بے خوف لے کر چلی وہ ہمیں اپنے ساتھ
ہوا کی آواز آئی
کیا پاگل ہوئے ہو
سمندر کی باتوں میں آ گئے
کبھی سنا ہے آسمان کسی سے ملا ہو
چلو واپس
درخت انتظار کر رہا ہے تمہارا
وہ پرندے سے مخاطب تھی
اڑ گیا پرندہ گلہری کو اپنے پنجوں میں سنبھالے
ہوا کی بانہوں کی طرف
مجھے بھی لے چلو
کہا میں نے ہوا سے
میرے لیے یہ ممکن نہیں، کہا ہوا نے
اور چھوڑ گئی مجھے
پرندے اور گلہری کو لیے
کیا میں آسمان سے ملوں گی
پوچھا میں نے مچھلی سے
ہنسنے لگی وہ
کس کی باتوں میں آئی ہو
کبھی ملتا ہے آسمان
زمین کے باسیوں سے
پھر کیا کر رہا ہے سمندر میرے ساتھ
اغوا کر رہا ہے تمہیں
میں رونے لگی

٭

مجھے واپس چھوڑ دو
میں نہیں کر سکتی یہ
میں تو غلام ہوں سمندر کی
لے جانا ہے تمہیں چٹانوں میں نیچے تہہ تک
پھر لگتا ہے پسیج گیا اس کا دل
کہنے لگی
سورج سے کہتے ہیں
باہر نکل آئے
اور اپنی آگ سے
جگا دے تمہیں۔

تمہاری بولی کی رنگینیاں

کتنے رنگوں کے نام ہیں
تمہاری بولی میں
دنیا تمہیں اتنی ہی رنگین نظر آئے گی

اپنی بولی میں موجود
سب درختوں کے نام یاد کرو
تا کہ بیٹھ سکو ہر دفعہ
مختلف نام کے سائے میں

برف کی کتنی قسموں کے نام جانتے ہو
اگر تم اسکیمو ہوتے
تو برف کی بیس قسموں کی پہچان کر پاتے

کہیں انسانی جذبات کی
بہت ساری قسمیں تو نہیں ہیں
تمہاری بولی میں
ایسا نہ ہو کہ جذبات کے سوا
کچھ نہ ہو تمہارے دماغ میں

اگر لوگ کم ہو گئے ہیں تمہارے آس پاس
تو رکھ لو ایک ہی شخص کے کئی کئی نام

اور محبت کے لیے ڈھونڈو
بہت سارے نام
میرے ساتھ مل کر
تا کہ ہم کر سکیں ہر دفعہ
نئے نام کی محبت

حاشیوں میں

کب تک کرو گے
دوسروں کے کمروں کے حاشیوں میں رنگ
دوسروں کے صحنوں کے حاشیوں میں نیند
دوسروں کے باغوں کے حاشیوں میں رونق
دوسروں کے شہروں کے حاشیوں میں دوڑ
دوسروں کے کھیلوں کے حاشیوں میں رقص
دوسروں کے صفحوں کے حاشیوں میں تبصرے

کب تک کرو گے
کب آخر ملے گی
دوسروں کی جنگوں کے حاشیوں میں موت

جب جاگ گیا وہ

بنائی میں نے اک تصویر
بہت سارا وقت لگا کر
پھر جاگ گیا وہ
پہلے دن غائب ہو گیا آسمان
دوسرے دن سمندر
تیسرے دن پہاڑ
چوتھے دن جنگل
پانچویں دن تم
اور چھٹے دن مَیں
ایک سفید کاغذ باقی رہ گیا فریم میں
دیوار پر سجا
پھر آرام کیا اس نے ساتویں دن
اور مَیں بھی سو گئی۔

جب سوچ رہی تھی مَیں اک نظم

جب سوچ رہی تھی میں اک نظم
وہ نکل گئی برابر سے
ناراضگی سے مجھے دیکھتی۔

توجہ نہیں دے سکی میں
ان کی دانش مندانہ باتوں پر

پڑھا تاریخ گزرنے کے بعد
اہم ملازمت کا اشتہار

وہ بھوکا رہ گیا رات بھر
چلا گیا ہمیشہ کے لیے

نہیں مل سکیں انہیں بروقت
سلائی کی مشینیں

لوٹ لیا انہوں نے سارا خزانہ
دونوں ہاتھوں سے

گر گئی بوسیدہ دیوار
اسکول کے بچوں پر

وہ پھیل گئے ہر طرف
خود کو اور دوسروں کو بموں سے اڑانے

کیوں سوچ رہی تھی میں اک نظم۔

اسکریبل آن لائن اجنبی کے ساتھ

جب میں اک پرانے دوست کو اک کھیل کے لیے ڈھونڈ رہی تھی مجھے اک اجنبی مل گیا اور بار بار دعوت دی اک کھیل کے شروع کرنے کی۔

اس کی باری پہلے آئی اور اس نے شروع کیا کچھ بے ہنگم انداز میں ایک صرف سہ حرفی لفظ "MAN" سے۔ میرے پاس بھی کچھ اچھے حروف نہ آئے اور اس کے لفظ کو بڑھا کر میں نے کردیا "WOMAN"۔ اس کی قسمت نے ساتھ دیا۔ "M" کے ساتھ لگا کر اس نے بنا لیا "MARRIAGE" اور اپنے ساتوں حروف استعمال کرنے پر اسے پچاس اضافی نمبر ملے۔

میرے پاس "S" تھا مگر "MARRIAGE" کو "MARRIAGES" بنانے کی جگہ نہیں تھی اس لیے میں نے "R" کو استعمال کرتے ہوئے بنایا "REASON"۔

اس نے "S" کے ساتھ لکھا "SEX" اور ٹرپل لیٹر پر "X" سے حاصل کر لیے پھر بہت سارے نمبر۔ میں نے بھی "X" کو استعمال کیا اور لکھا "EXIT"۔

قسمت سے اسے پھر "S" ملا اور میرے لفظ کے آگے "S" لگا کر اس نے مزید بنایا "SLUT"۔

مجھے یہ لفظ اچھا نہیں لگا اور میں نے "U" سے بنایا "UNFIT"۔ اس نے میرے "F" کے چار نمبر زائد حاصل کے جب اس نے "F" سے بنایا وہ چار حرفی لفظ جو ہم شریفانہ گفتگو میں استعمال نہیں کرتے۔ میں نے بھی جواباً "C" سے لکھا ایک ایسا ہی لفظ جس میں "N" تھا اور "T"

اس کے پاس آیا پھر بہت کارآمد "S" جس سے اس نے میرے لفظ کی جمع بنا کر اسے مزید بے ہودہ بنا دیا اور مزید لکھ دیا ایک سات حرفی لفظ "LUSTFUL" اور دوسری بار حاصل کر لیے پچاس اضافی نمبر۔

میں کھیل میں بری طرح ہار رہی تھی سو میں نے فیصلہ کیا اپنے تمام بے کار حروف بدل دینے کا جس کے لیے مجھے اپنی باری چھوڑنا پڑی۔

اس نے پھر لکھا ''LOSER'' اور استعمال کرلیا آخری ''S''۔

میں نے بلینک ٹائل کو ''S'' کے طور پر استعمال کرتے ہوئے ''LOSER'' کو بنایا ''LOSERS'' اور لکھا ''STUPID''۔

اسے جیسے ہی ''D'' ملا اس نے لکھ دیا ''DIVORCED'' اور ایک بار پھر حاصل کرلیے پچاس اضافی نمبر۔

میرے لیے اب کھیل میں کچھ باقی نہیں بچا تھا پھر بھی ہار مان لینا مجھے اچھا نہیں لگا۔ کھیل ادھورا چھوڑ کر میں نے اسے پیغام لکھ دیا۔ ''ہم اب اجنبی نہیں رہے۔ ہم پھر ملیں گے اور کھیل کو یہیں سے شروع کریں گے۔''

فہیم شناس کاظمی

امیر علی ٹھگ کی خدمت میں

(بصد ادب)

بابِ رسوائی کھلا
قصے کا آغاز ہوا
اور تاریخ نگوں سار کٹہرے میں کھڑی
کھل کے تہذیب کی پگڑی اپنی گردن میں پڑی
''پان ''لاؤ یا ''تمبا کو'' لاؤ
کوئی ''راماس'' سمجھتا ہی نہیں
اور اشارے پہ اشارہ ہے کہ تقریب کرو
تھوٹ اور ٹھگ تو ہیں چاق و چوبند
بیلوں کی گھنٹیاں آواز دیئے جاتی ہیں
اور رہوار ٹھہرتے ہی نہیں
گردنیں تھوڑی نظر آتی ہیں
جسم بھی مٹی فرقت میں گلے جاتے ہیں
کھال چہروں سے اُڑی جاتی ہے
قبریں تنہائی کی وحشت سے ہیں اُکتائی ہوئی
زندگی گھبرائی ہوئی
''بھیلیا'' گم ہے کہاں

کوئی "سوتھانی" نہیں

یعنی اب کچھ بھی ہو حیرانی نہیں

اب یہاں دُور تلک سایہ نہیں پانی نہیں

دل کی دھڑکن میں ہے کُہرام بپا

ایسی وحشت کبھی دیکھی نہ سنی

دُھوپ بارش کی طرح برسی ہے

آنکھ سائے کے لیے ترسی ہے

دُور تک کوئی نہیں کوئی نہیں

گدھ ہی گدھ چار طرف اُترے ہیں

اک بعد ایک فسانے کا وہ کردار بنے

یعنی ٹھگ اپنے شہریار بنے

کل کے دلاّل ہوئے آج اُولی الامر اپنے

ان کی تہذیب پہ تضحیک بھی شرمندہ ہے

پہلے پوشیدہ تھے اب صاف نظر آتے ہیں

ٹھگ ہی ٹھگ، منبر و ایواں میں نظر آتے ہیں

"کرنل میڈوز" نہیں، کوئی نہیں

خوابِ غفلت میں گھرے قافلے والے سارے

بند رستے کو بڑھے جاتے ہیں

اپنے ہی ہاتھ سے خود اپنے گلے کاٹتے ہیں

اور ٹھگ سارے ہنسے جاتے ہیں

زندگی ڈھونڈے سے اب ملتی نہیں لوگوں میں

دلکشی ڈھونڈے سے اب ملتی نہیں راہوں میں

اب نہیں کوئی نہیں

درد کا درماں جو کرے

یار امیر

اب ہر اک سمت حکومت ہے تری

اور تُو جیسا بھی انصاف کرے

ہم ذلیل ابنِ ذلیل ابنِ ذلیل

علم کیا چیز، شرافت کیا ہے

اور تُو اعلیٰ نسب، اعلیٰ ترین

ٹھگ سہی، حکم ترا چلتا ہے

گدھ ہی گدھ چار طرف اُترے ہیں

اور سب لوگ ہیں زندہ اب بھی؟

واقعہ ہے کہ ہمیں حیرت ہے

کہ ترے ہوتے بھی سب زندہ ہیں

اور گدھ بھوک سے بے حال ہوئے جاتے ہیں

یار امیر، اب کوئی حیلہ وسیلہ کوئی

راماس......ٹھگوں کی زبان؛ پان یا تمبا کو کھانا......موت کے گھاٹ اتارنا؛

ٹھوٹ......ہلاک کرنیوالا ٹھگ؛ بھیلیا......اجتماعی قبریں کھودنے والا ٹھگ؛

سوتھانی......مخبر؛ کرنل میڈوز......ٹھگوں کو پکڑنے والے انگریز افسر کا نام

علی بابا

علی بابا

یہ عجلت ہمتوں کو پست کرتی ہے

محبت راستے میں موت کو تجویز کرتی ہے

ہوس تیری گھنے جنگل سے چوروں کو

مری بستی میں لے آئی

وہ چالیس چور

بستی کے گلی کوچوں میں اب مقتل سجاتے ہیں

علی بابا

خزانہ پانے کی عجلت

ترے ماضی کی محرومی کا

ابتر شاخسانہ ہے

یہ تیری بدنصیبی سے بھی بدتر، اک فسانہ ہے

تری اچھی کنیزوں میں نہیں مرجینا بھی کوئی

جو بستی کو بچا لیتی

سلامت ہے نہ تیرا گھر

نہ میرا دل

نہ اب دربارِ شاہانہ

تجھے کیا ہے؛ ہوس تیری رہے باقی

یہ بستی آگ کی تصویر ہو جائے

اگر یہ راکھ کا ہی ڈھیر ہو جائے

تجھے کیا ہے

کنیزوں، خاصہ داروں اور غلاموں سے

تجھے فرصت نہیں ملتی

وہی بغداد، جس کے سب گلی کوچے

کبھی تھے مہ وشوں کے

گل رُخوں کے آئینہ خانے

ستارے آسماں سے جھک کے جن کو روز تکتے تھے

جو اوراقِ مصور تھے

وہاں پر دھول اُڑتی ہے
ہر اک جانب اجل کی حکمرانی ہے
زمیں پر آگ جلتی ہے
علی بابا
خزانہ پانے کی مسرت سے زیادہ اب
اذیت ہے
خزانہ پانے کی عجلت
ہوس تیری
گھنے جنگل سے چوروں کو مری بستی میں لے آئی
کوئی سم سم
کوئی بھی اسمِ اعظم اب
ہماری مشکلیں آساں نہیں کرتا
کوئی درماں نہیں کرتا

ڈاکٹر طاہر مسعود

ایک خیال

جانتے ہو ایک بات
زندگی اچھی نہیں
موت بھی اچھی نہیں
عمر بھی ہے رائگاں
درد بھی بے کار ہے
گردش سیارگاں
صرف اک تکرار ہے
اس بری دنیا میں اب
زندگی دشوار ہے۔

وعدہ خلافی

ابا!
تم نے مجھ سے کہا تھا
میں آؤں گا
اور تمہارے واسطے
اک چلتا ہوا بھالو لاؤں گا
تیس برس کی دوری پر
کتنے وعدے
یادوں میں مدفون ہوئے
لیکن میرے دھیان میں اب تک
وہ وعدہ یوں ہی زندہ ہے

حاصل

شاعری سے کیا ملا؟
اک البیلا نشہ
اک عجب سی سرخوشی
اک عجب سی تشنگی
دُکھ تو دنیا میں بہت ہیں
شاعری سے سُکھ ملا

دن اب کتنے باقی ہیں

دن اب کتنے باقی ہیں
سایۂ عمر کے ڈھلنے میں

کتنے موسم یاد آئے تھے
عشق کے رنگ بدلنے میں

کتنے پت جھڑ حائل تھے
شمعِ بہاراں جلنے میں

اب کے ہم نے دیر لگا دی
قریۂ دل سے چلنے میں

ذاتی مسئلہ

ان سے جنگ میں کیسے کروں
جن سے نفرت ہے ہی نہیں

ان سے شکوہ کیسے کروں
جن سے محبت ہے ہی نہیں

ان کی پرستش کیسے کروں
جن سے عقیدت ہے ہی نہیں

ان سے مل کر کیسے رہوں
جن سے اخوت ہے ہی نہیں

ان کو طعنہ کیسے دوں
جن میں حمیّت ہے ہی نہیں

ان پہ بھروسہ کیسے کروں
جن میں شجاعت ہے ہی نہیں

آنا احمتووا
ترجمہ: احمد مشتاق

تنہائی

بہت پتھر مارے گئے ہیں مجھے
اتنے کہ اب میں نے خوف زدہ ہونا چھوڑ دیا ہے
اور گڑھا ایک مستحکم مینار بن گیا ہے
سارے میناروں سے اونچا
میں اسے تعمیر کرنے والوں کی مشکور ہوں
خدا کرے پریشانی اور اُداسی اُنہیں چھو کر نہ گزرے۔

یہاں سے میں ہر صبح سورج کو طلوع ہوتے دیکھوں گی
یہاں سورج کی آخری شعاع ناچے گی
اور میرے کمرے کی کھڑکیوں میں سے
شمال کی ٹھنڈی ہوائیں آئیں گی
اور میرے ہاتھ میں سے ایک فاختہ گندم کے دانے چگے گی۔

جہاں تک میرے ناتمام صفحے کا تعلق ہے
فن کی دیوی کا
پُرسکون اور نازک چمپئی ہاتھ
اسے تمام کرے گا۔

ایک گیت کے بارے میں گیت

پہلے تو یہ سُن کر دیتا ہے
ایک برفیلی ہوا کی طرح
اور پھر دل میں گرتا ہے
ایک نمکین آنسو کی طرح

اور ظالم دل کو پچھتاوا لگ جاتا ہے کسی بات کا
ملول ہو جاتا ہے اور اس معمولی سے دُکھ کو بھول نہیں پاتا
میرا کام صرف بونا ہے
کاٹنے والے اور ہوں گے
برکت دے اے خدا
کٹائی کرنے والے اس گروہ کو
جو خوشی سے پھولا نہیں سماتا

اور تیری شکر گزاری کی خاطر
میں لگی لپٹی رکھے بغیر کہوں گی
عطا کرنے دے مجھے اس دنیا کو
محبت سے زیادہ لافانی کوئی شے۔

دو نظمیں

(۱)

تکیے کی دونوں طرفیں
پہلے ہی گرم ہیں
اب تو دوسری موم بتی بھی بجھنے والی ہے
اور کوّوں کی کائیں کائیں

بلند، اور بلند ہوتی جا رہی ہے
میں ساری رات نہیں سوئی
اور اب بہت دیر ہو چکی ہے نیند کے خیال کو بھی
کتنی ناقابلِ برداشت حد تک سفید ہے
جھلملی، سفید کھڑکی کی
ہیلو۔

(۲)

وہی آواز، وہی نظریں
وہی سن جیسے بھورے بال
ہر چیز ویسی ہی ایک برس پہلے والی
کھڑکیوں کے پٹوں میں سے
دوپہر کے سورج کی شعائیں رنگ بکھیر رہی ہیں
سفیدی کی ہوئی دیواروں پر
تازہ کلیوں کی خوشبو
اور تمہاری بے تکلف باتیں۔

مچھیرا

کہنیوں سے اوپر ننگے بازو
آنکھیں برف سے زیادہ نیلی
اور تمہاری جلد، جلتی ہوئی تارکول کی تیز بُو کی طرح
تمہاری نیلی جیکٹ ہمیشہ کھلی رہتی ہے
اور مچھیرنیں تمہیں دیکھ کر شرماتی ہیں، آہیں بھرتی ہیں
اور وہ چھوٹی سی لڑکی بھی
جو شہر میں مچھلیاں بیچتی ہے
ایک گمشدہ روح کی طرح بھٹکتی ہے

ہر شام، پانی کے کنارے
اُس کے رُخسار زرد ہیں
ہاتھ کمزور، نظریں پریشان اور گہری
ریت پر رینگتے ہوئے کیکڑے
اُس کے پیروں کو گُد گُدا کر گزر جاتے ہیں
لیکن وہ اُن کو ہاتھ بڑھا کر پکڑتی نہیں
خواہش کے مارے جسم میں
لہو اور بھی تیزی سے دوڑتا ہے۔

فرار

''ہمیں صرف کنارے تک پہنچنا ہے میری پیاری''
''خاموش''
اور ہم سیڑھیاں اُترنے لگے
پُھولے ہوئے سانسوں کے ساتھ چابیاں تلاش کرتے ہوئے
قریب سے گزرے اُن عمارتوں کے
جہاں کبھی ہم نے شراب پی تھی اور رقص کیا تھا
سینیٹ کی عمارت کے سفید ستونوں کے قریب سے
جہاں اُس وقت اندھیرا تھا— اندھیرا
کیا کر رہے ہو تم؟ پاگل تو نہیں ہو گئے
نہیں۔ میں صرف تم سے محبت کرتا ہوں
یہ پُرشور ہوا جہاز پر اور بھی شاندار لگے گی
میرا دم گُھٹا جاتا تھا خوف سے
ہم ایک کشتی میں بیٹھ گئے
تارکول بھری تاروں کی تیز بُو سے
میرے لرزتے ہوئے نتھنے جھلس رہے تھے

بتاؤ مجھے۔ تم جانتی ہو، کیا میں سو رہا ہوں؟
یہ خواب ایسا لگتا ہے
چپو برابر چھپ چھپ کیے جا رہے تھے نیوا کے پُرشور پانیوں پر
اور تاریخ آسمان چمک اُٹھا تھا۔
پُل پر سے کسی نے ہاتھ ہلائے
اور دونوں ہاتھوں سے بھینچ لیا میں نے
سینے پر پڑی صلیب کی زنجیر کو
میں ڈھیر ہوگئی تمہاری بانہوں میں
ایک دوشیزہ کی طرح
اور تم اُٹھا کر لے گئے مجھے
سفید جہاز کے عرشے پر
لازوال دن کے اُجالے سے ملانے۔

تعارف وتراجم: شاہدہ حسن

نزار قبانی

مشرقِ وسطیٰ اور اسلامی دنیا میں ایسی بہت سی سچی اور توانا شعری آوازیں موجود رہی ہیں جنہوں نے تحمل و برداشت، اجتماعیت اور انسانی وقار سے غیر مشروط محبت کا درس عام کیا ہے۔

بیسویں صدی کے جدید عرب شاعر اور نیشنلسٹ ''نزار قبانی'' کا تعلق ملکِ شام سے ہے۔ اپنے رومانوی اور حیاتی شعری اظہار کی بدولت وہ کئی نسلوں کے عربوں کے مقبول اور ممتاز شاعر رہے ہیں۔ وہ عربی زبان کے مشہور اخبار ''الحیات'' میں بھی شائع ہوتے رہے اس کے علاوہ ان کے تقریباً دو درجن شعری مجموعوں کو عوام وخواص میں بڑی پذیرائی حاصل رہی۔ ۱۹۵۴ء میں ان کا پہلا شعری مجموعہ ''Childhood of a Breast'' شائع ہوا تو اس کے رومانوی اور عاشقانہ موضوعات نے روایتی رومانوی شاعری کے قدیم انداز سے گریز کی بدولت، خصوصی توجہ حاصل کرلی۔ نزار قبانی کی بہن نے اک ایسے شخص سے روایتی شادی سے انکار کردیا تھا جس سے وہ بالکل محبت نہیں کرسکتی تھی۔ نتیجتاً اس نے خودکشی کر لی تھی۔ اس واقعے نے قبانی کو بہت متاثر کیا۔ انہوں نے ''مردانہ شاونزم'' کے خلاف اپنے غم و غصے کا اظہار شروع کردیا اور اکثر وہ خود عورتوں کے نقطۂ نظر کو پیش کرنے لگے اور عورتوں کی سماجی آزادی کی بھرپور وکالت کرنے لگے۔ ۱۹۶۷ء سے وہ مستقل طور پر لندن میں رہائش پذیر ہوگئے۔ مگر اپنے وطن ملکِ شام کا دارالخلافہ دمشق ہمیشہ اُن کی خوب صورت یادوں کا ایک اہم حوالہ بنا رہا۔ ۱۹۶۷ء میں عرب اسرائیل جنگ میں جب عربوں کو شکست ہوئی تو نزار قبانی نے لندن میں اپنا پبلشنگ ہاؤس قائم کرلیا اور عربوں کے حقوق کو نمایاں کرنے کے لیے ایک بہت موثر شعری آواز کے طور پر مقبول ہونے لگے۔ اُن کی شاعری اور دیگر تحریروں میں، جن میں اُن کے مضامین اور صحافتی تحریریں بھی شامل ہیں، قبانی ایک واضح سیاسی

نقطۂ نظر کے حامل نظر آتے ہیں اُن کی تحریروں میں اکثر رومانوی اور سیاسی دُکھوں کا ایک خوبصورت ملاپ موجود ہوتا ہے۔ نزار قبانی کو خلیل جبران، محمود درویش، پابلو نرودا، فیض احمد فیض اور اُن جیسے اس عہد کے دیگر اہم شعراء نے پڑھا اور سراہا۔ قبانی کی دوسری شریکِ حیات بلقیس الراوی ایک عراقی ٹیچر تھیں جن سے ان کی ملاقات بغداد کی ایک محفل میں ہوئی تھی۔ وہ بیروت میں ہونے والے بم کے ایک حملے میں ماری گئیں۔ یہاں وہ عراقی وزارت کے کلچرل سیکشن میں کام کرتی تھیں۔

نزار قبانی کا انتقال لندن میں جلاوطنی کے عالم میں ۱۹۹۸ء میں ہوا۔ اس وقت ان کی عمر ۷۵ برس تھی۔ وہ دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ ملکِ شام کے فوجی صدر حافظ الاسد نے اپنے ذاتی طیارہ میں اُن کا جسدِ خاکی لندن سے منگوایا اور دمشق میں دفن کیا۔ یہ ایک حیرت انگیز بات تھی کیونکہ نزار قبانی ساری عمر فوجی آمریت کے خلاف شدت سے آواز اٹھاتے رہے تھے اور جمہوری آزادی، انسانی حقوق اور بطور خاص عورتوں کے حقوق کی بھرپور حمایت کرتے رہے تھے۔

رات کے مہمان

رات، دن سے کچھ کم پُراسرار نہیں
اگرچہ جب ہم
اپنی نیند میں جاگ رہے ہوں
دھوکا کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے

ہم اپنی قبروں کے دوسری طرف لے جائے جاتے ہیں
اپنی پرچھائیوں سے باتیں کرتے
اور روحوں سے کھیلتے ہیں

گزشتہ شب وہ آئی......
میں اُسے پہچان نہ سکا
میں نے بس یہ دیکھا

جیسے ہوا کے کینوس پر، اپنی زندہ انگلیوں کے ساتھ، وہ بیٹھی ہو
اور اُس کی تھوڑی، اُس کی ہتھیلی پر ٹکی ہو
اُس نے کہا......
میں نہ جانے کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی
تم کہاں رہ گئے تھے؟
تم نے اتنی دیر کیوں کر دی؟

یہاں بہت شور ہے اور ہوا بہت تیز ہے
آؤ میرے ساتھ دوسری جانب چلو — مجھے اپنی کہانی سناؤ
مجھے بتاؤ،
یہ سب کیا ہے، کب ہے اور کیوں ہے!
مجھے بتاؤ،
تم نے اپنی سوچیں کس کے سپرد کر دیں!
مجھے بتاؤ
وہ کون سا وقت تھا، جب تم نے اپنے دل کو دھوکہ دیا
مجھے بتاؤ
وہ کون سا وقت تھا، جب تم بھرپور یقین کے ساتھ کھڑے رہے

رات گزرے بہت دیر ہو چکی ہے
اب دن اپنے پورے کمال پر ہے
مگر اُن تاریک خیالی پیکروں میں
میں روشنی کی ننھی سی کرن دیکھتا ہوں
جو مجھے راہ دکھاتی ہے کہ ایسا کیوں ہے
اس کا مطلب کیا تھا
اس کا انجام کیا تھا؟

میں دنیا کو لفظوں سے جیت لیتا ہوں

میں دنیا کو لفظوں سے جیت لیتا ہوں
میں اپنی ماں بولی کو جیت لیتا ہوں
فعل، اسم، جملوں کی ساخت — سب کو
میں شروعات سے تیزی کے ساتھ گزر جاتا ہوں
اور ایک نئی زبان میں
جس میں آبِ رواں جیسا آہنگ ہو
اور آگ جیسا پیغام......
میں آنے والے زمانے کو روشن کر دیتا ہوں
اور وقت کو، تمہاری آنکھوں میں ٹھہرا دیتا ہوں
میں اُس لکیر کو مٹا دیتا ہوں
جو وقت کو، اس اکیلے لمحے سے
جدا کر دیتی ہے۔

ایک مختصر سا عشقیہ خط

اے میری جان!
بہت کچھ ہے میرے پاس کہنے کے لیے
اے بہت قیمتی ہستی!
کہاں سے شروع کروں، میں اپنی بات

تم میں جو کچھ ہے — سب بہت شاہانہ ہے
تم — جو میرے لفظوں کو معنی عطا کر کے
انہیں اطلس و ریشم میں ڈھال دیتی ہو

یہ میرے نغمے ہیں، یہ میں ہوں

اس چھوٹی سی کتاب میں، ہم دونوں ہیں
جب آنے والے کل میں، میں اس کے اوراق پلٹوں گا
اک چراغ افسردہ ہو جائے گا
اک بستر گیت گائے گا

اس کے حروف، خواہشوں کی شدت سے
سبز رنگ میں ڈھل جائیں گے
اس کے اعراب، پَر لگا کر اڑنے لگیں گے

مت کہو: کیوں یہ جوان میری باتیں کرتا ہے
بل کھاتی سڑکوں اور ندیوں سے
بادام کے درخت اور کنول کے پھول سے
کیا دنیا نگرانی کرتی رہتی ہے جدھر جدھر میں جاتا ہوں
مت کہو: وہ یہ نغمے کیوں گاتا ہے؟

اب آسمان پر کوئی ستارہ نہیں

جو میری خوشبوؤں سے مہک نہ رہا ہو
آنے والے دنوں میں لوگ مجھے اُس کی نظموں میں دیکھیں گے
اے شراب کے ذائقے سے آشنا
تم لوگوں کی باتوں پر دھیان نہ دینا
تم صرف میری عظیم محبت کی بدولت عظیم ہو گے
اگر ہم دونوں نہ ہوتے
یہ دنیا کیسی لگتی
اگر تمہاری آنکھیں موجود نہ ہوتیں
یہ دنیا کیسی لگتی!

اپنی ماں کے لیے پانچ حرف

صبح بخیر، اے میری محبوب ہستی
صبح بخیر، اے میرے پیار کے مقدس وجود

اے ماں!
دو برس ہو چکے
وہ لڑکا اپنے بحری سفر پر نکلا تھا
ایک افسانوی سفر پر
چھپا کر رکھ لیا تھا اپنے سامان میں اُس نے
اپنے وطن کا سرسبز سویرا
اُس کے روشن ستارے
اُس کی ندیاں اور آبِ رواں
اُس کی خشخاش اور پوست کے سرخ پودے

چھپالی تھی اپنے ملبوس میں اُس نے
صعتر اور پودینے کے گچھوں کی خوشبو
اور ایک بنفشی پھول دار پودا

میں تنہا ہوں ماں،
وبالِ جان ہے میرے لیے یہ سگریٹ کا دھواں
یہاں تک کہ میرے بیٹھنے کی جگہ بھی۔
میرے دکھ، اُڑتے پرندوں کے اُس جھرمٹ کی طرح ہیں
جو رُت کے فصل آور کسی میدان کو کھوجتے ہوں
مانوس ہوں میں، یورپ کی عورتوں سے

اور اُن کی تھکی ہوئی تہذیب سے بھی

میں نے سیر کی ہے
انڈیا اور چین کی
اور ساری مشرقی دنیا کی
مگر کسی جگہ بھی نہ ملی مجھے کوئی ایسی عورت
جو میرے سنہرے بالوں میں کنگھی کرتی
جو اپنے پرس میں میرے لیے، چینی کی مٹھائی چھپاتی
میرے برہنہ جسم کو لباس پہناتی
اور جب گر پڑتا میں، تو مجھے جھک کر اٹھا لیتی

ماں،

میں وہی بیٹا ہوں تمہارا جو سفر پر نکلا تھا
اور اب تک اپنی چینی کی مٹھائی کی تمنا کرتا ہوں
پھر کس طرح اور کیونکر ماں
میں باپ بن سکتا ہوں
اور کبھی بڑا نہیں ہو سکتا۔

اے ماں، میڈرڈ کے ساحلوں سے صبح بخیر
مجھے بتاؤ
فلاح کیسی ہے
میں التجا کرتا ہوں، تم اُس کا خیال رکھنا
وہ جو ایک بچی کی بچی ہے
بہت پیاری تھی اپنے باپ کی وہ
اُس نے اُسے بھی بگاڑ دیا تھا، اپنی بیٹی کی طرح

وہ عادی تھا، اُسے صبح کی کافی پر مدعو کرنے کا
دودھ اور پانی پلانے کا
اُسے اپنے پیار کی وارفتگی سے ڈھک دینے کا

جب وہ مر گیا، وہ اُس کی واپسی کے خواب دیکھا کرتی تھی
اُسے اپنے کمرے کے کونوں میں تلاش کرتی پھرتی
اُس کے لباس کے بارے میں پوچھتی
اُس کے اخبار کے بارے میں پوچھتی

جب گرما کا موسم آیا
اُس نے اس کی نیلی آنکھوں کے بارے میں سوال کیا
تاکہ وہ اُس کی ہتھیلیوں پر سنہرے سکے رکھے

ماں! میں اپنا بہترین احترام بھیج رہا ہوں
اُس گھر کے لیے
جس نے ہمیں محبت اور رحم سکھایا
اور تمہارے سفید پھولوں کے لیے
جو اردگرد کے علاقوں میں سب سے بے مثال تھے
اور اپنے بستر کے لیے
اپنی کتابوں کے لیے
اُس تنگ گلی کے تمام بچوں کے لیے
اُن تمام دیواروں کے لیے جنہیں ہم
اپنی تحریروں سے اُٹھتی آوازوں سے ڈھک دیتے تھے
اور اُس سست رفتار بلی کے لیے
جو ہماری بالکنی پر سوتی رہتی تھی

اور بنفشی پھول دار جھاڑیوں کے لیے
جو ہمارے پڑوسیوں کی کھڑکیوں پر پھیل جاتی تھیں

اب تو
دو برس کا طویل عرصہ ہو گیا ہے ماں
دمشق کا چہرہ، کسی پرندے کی طرح لگتا ہے
جو میرے ضمیر کو کھودتا رہتا ہے
میرے گھر کے پردوں کو نوچتا رہتا ہے
اور اک نرم سی چونچ سے
میری انگلیوں سے دانہ چگتا رہتا ہے۔

دو برس ہو گئے ماں،
دمشق کی راتیں،
دمشق کی خوشبوئیں
دمشق کے مکانات
ہمارے تصور میں گھومتے رہتے ہیں

اور اس کی مساجد کے ستون کی روشنیاں
ہمارے جہازوں کے بادبانوں کو راستہ دکھاتی ہیں
بالکل ایسے جیسے اماوی کے ستون ہمارے دلوں کے اندر نصب ہوں
جیسے اُس کے باغات ہمارے باطن میں ابھی تک خوشبوئیں بکھیر رہے ہوں
جیسے روشنیوں اور پتھروں نے بھی ہمارے ہمراہ سفر کیا ہو!

ماں، یہ ستمبر ہے
یہ مہینہ میرے لیے دُکھوں کے ملفوف تحفے بھیج رہا ہے

میرے دریچے پر اس کے آنسو، اس کی فکریں بکھری ہیں
یہ ستمبر ہے
دمشق کہاں ہے
میرا باپ، اور اُس کی آنکھیں کہاں ہیں؟
کہاں ہیں اُس کی نرم نگاہوں کے ریشم؟
کہاں ہے اُس کی گرم کافی سے اٹھتی خوشبو؟
اللہ اُس کی قبر پر رحمت نازل کرے
کہاں ہیں ماں،
ہمارے وسیع و عریض گھر کی وسعتیں
کہاں ہے اُس کا آرام
کہاں ہے زینے والا کنواں
جو شگوفوں کے چٹکنے پر مسکرا اُٹھتا تھا
کہاں ہے میرا بچپن
جب میں بلی کی دم پکڑ کر کھینچا کرتا تھا
اور انگور کی بیل سے توڑ توڑ کر انگور کھاتا تھا
اور بنفشی پودوں کے روندتا رہتا تھا

اے دمشق، اے دمشق!
ہم نے اپنی آنکھوں کے اندر
کیا کیا نظمیں لکھ رہی ہیں!
ہم نے کتنے خوبصورت بچے کو سولی پر لٹکا رکھا ہے!
ہم اُس کے قدموں میں جھکے رہے
اور جوشِ عقیدت سے پگھلتے رہے
یہاں تک کہ ہم نے اُسے
محبت سے مار دیا۔

ن۔م۔دانش

☆

مجھے اتار کے خوش تھا وہ باغِ دنیا میں
میں اس کا خواب تھا چشم و چراغِ دنیا میں

بس ایک شخص جو بیٹھا تھا خاکِ ہستی پر
نکل کے آیا تھا میں تو سراغِ دنیا میں

جہاں سے دل کے اندھیرے نظر بھی آجاتے
کہاں تھی روشنی اتنی چراغِ دنیا میں

وہ اک طلسم حیاتِ فسونِ خواب ہی تھا
کوئی تماشہ نہ تھا باغ و راغِ دنیا میں

بر دل اداسی و تنہائی کا اک عالم تھا
اسے بھی ڈال دیا ہے ایاغِ نیا میں

ہزارہ شیوۂ ہستی ہزار جلوہ گری
ہزار رنگ طلسمِ چراغِ دنیا میں

نتیجہ یہ ہے کہ اپنا نشاں نہیں ملتا
نکل کے آئے تھے ہم تو سراغِ دنیا میں

ایک ایسی بھیڑ میں زندہ کہ دم الجھتا ہے
عجب تنگیٔ جاں ہے فراغِ دنیا میں

میں کس سے بات کروں کوئی فرش پر ہی نہیں
عجب فتور ہے دانشِ دماغِ دنیا میں

☆

زندگانی نے کہیں کا نہیں رکھا ہم کو
اس کہانی نے کہیں کا نہیں رکھا ہم کو

جو میرا رنج تھا وہ کوئی سمجھتا ہی نہ تھا
خوش بیانی نے کہیں کا نہیں رکھا ہم کو

وہ طبیعت ہے کہ رکتی ہی نہیں جا کے کہیں
اس روانی نے کہیں کا نہیں رکھا ہم کو

اپنی بربادی کا رونا بھی تو آساں نہ رہا
بے زبانی نے کہیں کا نہیں رکھا ہم کو

وہ کہیں ہے ہی نہیں اس کے تجسس میں رہوں
جس کے ثانی نے کہیں کا نہیں رکھا ہم کو

جب اٹھا پاؤں تو دھرنے کو نہیں کوئی زمیں
بے مکانی نے کہیں کا نہیں رکھا ہم کو

رائیگاں ہی تھا یہ سب کچھ تو بھلا پھر کیوں تھا
رائیگانی نے کہیں کا نہیں رکھا ہم کو

☆

خبر ہے کر رہی ہے زندگانی رائیگاں مجھ کو
نہیں دیتی ہے مرنے لذتِ کارِجہاں مجھ کو

کوئی بتلاؤ ہوتے ہیں نہ ہونے کے معنی کیا
کوئی سمجھاؤ وہ کیسے کرے گا بے نشاں مجھ کو

کہیں کونے میں اک پاؤں پسارے لیٹ جاتا ہوں
کبھی پڑ جاتے ہیں وحشت میں کم دونوں جہاں مجھ کو

میرا مصرف کوئی گر ہے تو استعمال ہونے میں
اب اُس پر ہے وہ کر لے جس طرح بھی رائیگاں مجھ کو

میں اسے تنگنائے ذہن میں اب قید ہوں جس میں
دکھائی دیتا ہے کھڑکی برابر آسماں مجھ کو

اگر وہ شخص افکارِ جہاں سے لاتعلق ہے
دکھائی دیتا ہے کیوں ہر طرف سے درمیاں مجھ کو

مجھے جو بات کہنی ہے اشاروں میں ہی ممکن ہے
بیاں کے کھوکھلے پن نے کیا ہے بے زباں مجھ کو

☆

غصہ کسی بھی طور یہ دل کا نکال دیں
ہم آسماں کی سمت ہی جوتا اچھال دیں

اب کون سی فضا ہے یہاں سیر کے لیے
اب کون سی بہشت کو دوزخ میں ڈال دیں

یہ زندگی ہے کیوں میرے در پہ کھڑی ہوئی
کوئی بہانہ کرکے اسے یاں سے ٹال دیں

یہ قافیوں کا کھیل بہت ہوچکا ہے اب
اس شاعری کے جسم کو کوئی خیال دیں

موقع محل و حسبِ ضرورت کہیں بھی آپ
جب چاہیں خود کو اور ہی پیکر میں ڈھال دیں

یہ ساتواں سوال ہی کیوں آخری ہوا
ہم آٹھویں کو کیوں نہ کہانی میں ڈال دیں

پنہاں

☆

ساتویں سمت پانچواں موسم
کیسے کیسے کہاں کہاں موسم

مرحلے نو بہ نو نفس بہ نفس
مختلف ہیں یہاں وہاں موسم

اصل جو شے ہے وہ تو ہے مٹی
اس پہ آتے ہیں جسم و جاں موسم

خواب کیا کیا دکھاتے رہتے ہیں
خود فریبی کے خوش گماں موسم

بیج پھل پھول شاخ میں جڑ میں
زندگی کا رواں دواں موسم

ان کی نظریں بدل گئی ہوں گی
ہوگئے تند مہرباں موسم

بس زمیں پیرہن بدلتی ہے
جب بدلتا ہے آسماں موسم

کر گیا دل سے روح تک شاداب
عشق انساں کا جاوداں موسم

ساتویں سمت میں ہے دل پنہاں
عشق دنیا کا پانچواں موسم

☆

زندگی ہے ارتعاشِ حرفِ کن
دھڑکنوں میں ہے اسی نغمے کی دھن

حسن اپنی ذات میں خود عشق ہے
آئینہ ہونے کا مٹی میں ہے گن

آدمی معصوم اتنا بھی نہیں
جانتا ہے پاپ کیا ہے کیا ہے پن

آپ زیرِ دام آجائے نہ تو
یوں نہ دل میں خواہشوں کے جال بن

کیا ہے تو کیا تھا، تجھے ہونا ہے کیا
اپنی منزل اپنا رستہ آپ چن

عقل کی باتیں کرے دیوانہ اک
سن کے دل کی ہوگیا ہے ذہن سن

رازِ ہستی رازِ پنہاں کیوں رہے
بس غزل کی ایک ہی ضد ایک دھن

☆

جانے کیسے دل سے دل ایسے ملے
سر کوئی جیسے کسی لے سے ملے

ایک انجانا فسوں ہے درمیاں
ان کی نظروں سے نظر کیسے ملے

اب زمیں پر بھی تو ملنا ہے ہمیں
آسمانوں پر کبھی جیسے ملے

عشق کا یہ روگ تو جاتا نہیں
چین اب دل کو مرے کیسے ملے

کیا تمہیں ہم سا کوئی مخلص ملا
لوگ ملنے کو بہت ویسے ملے

عشق میں اور زندگی کے کھیل میں
شہہ وہی ہے مات جس شے سے ملے

دل میں اور نے میں خلائیں مشترک
نغمہ زارِ جاں کسی نے سے ملے

زندگی کے زہر کا مجھ کو نشہ
مے کشوں کو جانے کیا مے سے ملے

جن کے رنگ و بو سے شرمائے گلاب
زخم کچھ دل کو مرے ایسے ملے

زندگی ہم کو اگر ایسی ملی
زندگی کو بھی تو ہم ایسے ملے

اب تو پنہاںؔ شاعری بھی کاروبار
ان کو شہرت اور انہیں پیسے ملے

احمد فواد

اسے بھی خاک سے اوپر اٹھانے آیا ہوں
میں اس زمین کی قسمت جگانے آیا ہوں

پرانی یادوں کی اک کان سے نکالے ہوئے
یہ آنسوؤں کے خزانے دکھانے آیا ہوں

نہ جانے کب میرا سورج اِدھر کو آ نکلے
میں اُس کی راہ میں تارے لُٹانے آیا ہوں

ہمیشہ چاہنے والوں کا دل دُکھاتے ہیں
اس آسمان و زمیں کو جلانے آیا ہوں

پرانے قصّے تو اب لوگ بھول بھال گئے
محبتوں کے نئے گیت گانے آیا ہوں

شکست مجھ سے میرا حوصلہ نہ چھین سکی
میں خود کو پھر سے یہاں آزمانے آیا ہوں

بھٹک رہے ہیں بہت دن سے ان خلاؤں میں
میں چاند تاروں کو رستہ دکھانے آیا ہوں

چھپا سکے گا کہاں مجھ کو خاک کا دامن
میں اک ستارہ ہوں یہاں جگمگانے آیا ہوں

یہ پیڑ پھول پہاڑ اور بادلوں کے پرے
انہیں میں اپنی کہانی سُنانے آیا ہوں

میں اجنبی ہوں یہاں کوئی میرے ساتھ چلے
میں اپنی قبر پہ آنسو بہانے آیا ہوں

وہاں تو چاروں طرف اُس کی یاد بکھری تھی
اب اِس دیار میں اُس کو بھلانے آیا ہوں

زمانہ بھول گیا ہے کسی پہ جاں دینا
جہاں کو پھر سے محبت سکھانے آیا ہوں

نکل کے خود سے تجھے ڈھونڈتا پھرا میں بھی
کہوں گا تجھ سے کبھی دل کا ماجرا میں بھی

ملے مجھے بھی یہاں آسماں ستارہ کوئی
تمام عمر ہوں اس خاک میں جلا میں بھی

جو خود میں رہتے ہیں تجھ سے کبھی نہیں ملتے
اسی خیال سے خود سے رہا جُدا میں بھی

جو بھول کر بھی کسی سے وفا نہیں کرتا
اُسی پہ اپنی حماقت سے مر مٹا بھی

کھلے گی تجھ پہ کہاں میرے دل کی گہرائی
ابھی نہ جان سکا اس کا مدّعا میں بھی

جہاں سے اُٹھتے ہیں یہ پھول یہ قدم تیرے
اُسی زمین پہ رہتا ہوں دلربا میں بھی

حدیثِ لطف کے چرچے ہیں سب زمانے میں
کبھی تو تجھ سے سنوں حرفِ آشنا میں بھی

جہاں سے ہونے کی سب بھیک لے کے آتے ہیں
اُسی کے در کا ہوں اے دوستو گدا میں بھی

مجھے تو صرف یہ بیگانگی کا درد ملا
اگرچہ ٹوٹ کے کرتا رہا وفا میں بھی

مجھے بھی کھوئے ہوئے یار کا سُراغ ملے
دیارِ شوق میں ہوں ایک قافلہ میں بھی

تیرا کرم تھا کہ خود ہونٹ سِل گئے میرے
اگرچہ مانگنے والا تھا کچھ صلہ میں بھی

جو ایک آہ سے دنیا تری جلا ڈالیں
اُسی قبیل کا ہوں ایک من چلا میں بھی

تری نگاہ سے جب تک نہ تھی علیک سلیک
سمجھ رہا تھا بہت خود کو پارسا میں بھی

نہ مجھ میں پھول کھلے ہیں نہ برگ و بار ملے
اگرچہ پیڑ بنانا چاہتا رہا میں بھی

صحرا سے نکاح کر لیا ہے
اے وائے غرورِ تشنہ کامی

جتنی بھی زمانہ گالیاں دے
منظور نہیں یہ نیک نامی

دل کا نہیں یہ قصور سارا
ہے اس میں دماغ کی بھی خامی

کم حوصلہ میں نہیں ہوں لیکن
ظالم یہ تری بلند بامی

اس دل سے نگاہ اب ہٹا لے
خالی نہیں یہاں کوئی اسامی

سورج کو اٹھائے پھینک دیں گے
اتنے یہ ستارے ہیں حرامی

سب لوگ پلٹ کے جا رہے ہیں
آہستہ، زمیں، یہ تیز گامی

اب اور کسی سے کیا گلہ ہو
خود میں بھی نہیں ہوں اپنا حامی

بھولا نہیں میرا یار مجھ کو
ہر پھول اُس کا ہے پیامی

خود کو بھی نہیں معاف کرتا
اتنا ہے مزاج انتقامی

ہر غنچہ خوشی سے ہنس پڑا ہے
دیکھی ہے صبا کی خوش خرامی

وحشت تھی کچھ انتظار کی بھی
وہ رات طویل بھی بہت تھی
کچھ مجھ میں تمیز کی کمی تھی
خلقت وہ ذلیل بھی بہت تھی
ہونٹوں کا یہ جام کیا کروں گا
آنکھوں کی سبیل بھی بہت تھی
اک بار شفق کو دیکھ لینا
اتنی سی دلیل بھی بہت تھی
اُس پر یہ نشہ کی لت الگ سے
وہ آنکھ علیل بھی بہت تھی
جتنی ہو زیادہ غم بڑھے گا
دنیا یہ قلیل بھی بہت تھی
آوارہ مزاج بھی تھی شاید
ماں باپ سے ڈھیل بھی بہت تھی
کب تک اُسے گھر میں باندھ رکھتے
لڑکی وہ رذیل بھی بہت تھی
کیا تنگ ہے یہاں اس آسماں کی
آنکھوں کی یہ جھیل بھی بہت تھی

یہ پھول نہیں جنابِ عالی
خوشبو کا چراغ جل رہا ہے
ان گہرے سمندروں کی تہ میں

دروازہ کوئی کھلا ہوا ہے
پھر سوچ کا نیلگوں پرندہ
آزاد فضا میں اڑ رہا ہے
سرگوشی ہے چاند اور سورج
شہوت کا بُلند قہقہہ ہے
نکلا تھا جو آسماں سے لڑنے
کہتے ہیں وہ شخص مر گیا ہے
بھولا نہیں ایک پل بھی پاگل
دل آج بھی تجھ کو ڈھونڈتا ہے
کیوں میری زمیں ہے خاک صورت
کیوں سر پہ یہ آسماں کھڑا ہے
دریاؤں کو کس لیے ہے جلدی
یہ آگ میں کون بولتا ہے
کر لے گا یہ کائنات تسخیر
انساں کا بُلند حوصلہ ہے

اجمل سراج

☆

دیوار یاد آگئی در یاد آگیا
آیا جو دشت سامنے، گھر یاد آگیا

کچھ کہنا چاہتے تھے کہ خاموش ہوگئے
دستار یاد آگئی، سر یاد آگیا

اپنے معاملات پہ جب بات آگئی
سب امتیازِ عیب و ہنر یاد آگیا

دنیا کی بے رُخی کا گلہ کر رہے تھے لوگ
ہم کو ترا تپاک مگر یاد آگیا

اجمل سراج ہم اُسے بھولے ہوئے تو ہیں
کیا جانے کیا کریں گے اگر یاد آگیا

☆

کون تیرے خیال میں گم ہے
ہر کوئی اپنے حال میں گم ہے

حُسن گُم ہے جمال میں اپنے
عشق اپنے کمال میں گُم ہے

آ گیا ہے قرار دل کو بھی
زخم یہ اندمال میں گم ہے

ناگہانی تجھ کو سامنے پا کر
حال خود عرضِ حال میں گُم ہے

ناز فرما رہا ہے وہ خود پر
بے مثالی مثال میں گُم ہے

گردشِ ماہ و سال بھی اجمل
گردشِ ماہ و سال میں گم ہے

عرفان ستار

☆

شگفتگی سے گئے، دل گرفتگی سے گئے
ہم آج خلوتِ جاں میں بھی بے دلی سے گئے

گلہ کریں بھی تو کس سے وہ نامرادِ جنوں
جو خود زوال کی جانب بڑی خوشی سے گئے

سنا ہے اہلِ خرد کا ہے دورِ آئندہ
یہ بات ہے تو سمجھ لو کہ ہم ابھی سے گئے

خدا کرے نہ کبھی مل سکے دوامِ وصال
جئیں گے خاک اگر تیرے خواب ہی سے گئے

ہے یہ بھی خوف ہمیں بے توجہی سے سوا
کہ جس نظر سے توقع ہے گر اُسی سے گئے؟

مقام کس کا کہاں ہے، بلند کس سے ہے کون؟
میاں یہ فکر کروگے تو شاعری سے گئے

ہر ایک در پہ جبیں ٹیکتے یہ سجدہ گزار
خدا کی کھوج میں نکلے تھے اور خودی سے گئے

سمجھتے کیوں نہیں یہ شاعرِ کرخت نوا
سخن کہاں کا جو لہجے کی دلکشی سے گئے؟

گلی تھی صحن کا حصہ ہمارے بچپن میں
مکاں بڑے ہوئے لیکن کشادگی سے گئے

برائے اہلِ جہاں لاکھ کجکلاہ تھے ہم
گئے حریمِ سخن میں تو عاجزی سے گئے

یہ تیز روشنی راتوں کا حسن کھا گئی ہے
تمہارے شہر میں ہم اپنی چاندنی سے گئے

فقیہ ِ شہر کی ہر بات مان لو چپ چاپ
اگر سوال اٹھایا، تو زندگی سے گئے

نہ پوچھیئے کہ وہ کس کرب سے گزرتے ہیں
جو آگہی کے سبب عیشِ بندگی سے گئے

اٹھاؤ رختِ سفر، آؤ اب چلو عرفان
حسیں یہاں کے تو سب خوئے دلبری سے گئے

☆

ہوکر وداع سب سے، سبک بار ہو کے رہ
جانا ہے کب خبر نہیں، تیّار ہو کے رہ

یہ لحہ بھر بھی دھیان ہٹانے کی جا نہیں
دنیا ہے تیری تاک میں، ہشیار ہو کے رہ

خطرہ شبِ وجود کو مہرِ عدم سے ہے
سب بے خبر ہیں، تُو ہی خبردار ہو کے رہ

شاید اتر ہی آئے خنک رنگ روشنی
چل آج رات خواب میں بیدار ہو کے رہ

کس انگ سے وہ لمس کُھلے گا، کسے خبر
تُو بس ہمہ وجود طلبگار ہو کے رہ

تُو اب سراپا عشق ہُوا ہے، تو لے دعا
جا سر بسر اذیّت و آزار ہو کے رہ

شاید کبھی اسی سے اٹھے پھر ترا خمیر
بنیادِ خواب ِ ناز میں مسمار ہو کے رہ

کچھ دیر ہے سراب کی نظّارگی مزید
کچھ دیر اور روح کا زنگار ہو کے رہ

اب آسمانِ حرف ہُوا تا افق سیاہ
اب طمطراق سے تُو نمودار ہو کے رہ

بس اک نگاہ دُور ہے خوابِ سپردگی
تُو لاکھ اپنے آپ میں انکار ہو کے رہ

وہ زمزمے تھے بزمِ گماں کے، سو اب کہاں
یہ مجلسِ یقیں ہے، عزادار ہو کے رہ

اندر کی اونچ نیچ کو اخفا میں رکھ میاں
احوالِ ظاہری میں تو ہموار ہو کے رہ

کیسے بھلا تُو بارِ مروّت اٹھائے گا
محفل ہے دوستوں کی، سو عیّار ہو کے رہ

بے قیمتی کے رنج سے خود کو بچا کے چل
بازارِ دلبری میں خریدار ہو کے رہ

فرمانروائے عقل کے حامی ہیں سب یہاں
شاہِ جنوں کا تُو بھی وفادار ہو کے رہ

تُو ہجر کی فضیلتیں خود پر دراز کر
خود اپنی راہِ شوق میں دیوار ہو کے رہ

لوگوں پہ اپنا آپ سہولت سے وا نہ کر
عرفان، میری مان لے، دشوار ہو کے رہ

ظفر اقبال

☆

ملتا ہوں اس سے اور بچھڑتا ہوں انتظار
ایسے ہی روز بنتا بگڑتا ہوں انتظار

ہوتی ہے صبح ایک نئے انتظار کی
کٹتی ہے رات اور نبڑتا ہوں انتظار

کرتا نہیں ہوں کوئی اضافی سفر کبھی
میں اپنے راستے ہی میں پڑتا ہوں انتظار

ایسا ثمر ہے شاخِ تماشا پہ کوئی دن
پکنے سے پیش تر ہی جو جھڑتا ہوں انتظار

بادل نہیں ہیں، اور گرجنے کی ہے صدا
آندھی نہیں ہے اور اکھڑتا ہوں انتظار

رہتی ہے شہر بھر کی خبر اس سے ہر گھڑی
اخبار ہی طرح سے پڑھتا ہوں انتظار

اس کی بلندیوں سے گروں گا بھی ناگہاں
سیڑھی سی آسماں کی جو چڑھتا ہوں انتظار

کوئی نتیجہ اس کا نکلتا نہیں ہے کیوں
لڑتا ہوں انتظار، جھگڑتا ہوں انتظار

جب سے مری سلائی پرانی ہوئی، ظفر
ہر روز ہی کہیں سے اُدھڑتا ہوں انتظار

☆

ویران کھیتیوں میں اُگاتا ہوں انتظار
اندر بھی ایک باغ لگاتا ہوں انتظار

میں بیٹھتا ہوں ٹیک لگا کر اسی کے ساتھ
بستر پہ بھی ہمیشہ بچھاتا ہوں انتظار

تبدیل کرتا رہتا ہوں اشیاء کی اصلیت
جو چیز بھی ہو اُس سے بناتا ہوں انتظار

لمحے اداسیوں کے گزرتے نہیں ہیں جب
نغمہ سا کوئی خود کو سناتا ہوں انتظار

ہوتا ہے انتظار مرا منتظر اک اور
میں جب بھی راستے سے ہٹاتا ہوں انتظار

اور آج کل تو کچھ بھی پتا چل نہیں رہا
آتا ہوں انتظار کہ جاتا ہوں انتظار

پھر تا کہ آڑے وقت میں کام آسکے کبھی
کچھ انتظار میں سے بچاتا ہوں انتظار

لگتا نہیں ہے جی تو بنا کر پتنگ سی
میں ساری ساری رات اُڑاتا ہوں انتظار

ہر بات کا جواب مرے پاس ہے ظفر
جو کچھ بھی پوچھیے، میں بتاتا ہوں انتظار

☆

ہونا مرا یہی ہے کہ ہوتا ہوں انتظار
ہنستا ہوں انتظار تو روتا ہوں انتظار

کس خواب کی امید ہے جو ٹوٹتی نہیں
راتوں کو جاگتا نہیں، سوتا ہوں انتظار

اس انتظار کے پس و پیش اور ہے کوئی
ایک انتظار جس میں سموتا ہوں انتظار

یہ فصل کاٹنا مری قسمت میں ہو نہ ہو
آنکھوں کی اس زمیں میں جو بوتا ہوں انتظار

جب رنگ بجھنے لگتا ہے اُس کے خیال کا
کانٹا سا آرزو میں چبھوتا ہوں انتظار

کرتا ہوں واپسی کے وسیلے سبھی تمام
سب کشتیوں کے ساتھ ڈبوتا ہوں انتظار

ان پانیوں کی پیاس رہی عمر بھر مجھے
سو بار جن میں آج بھگوتا ہوں انتظار

اس پر بھی چڑھ چکا ہے محبت کا میل کچھ
کپڑوں کے ساتھ ساتھ جو دھوتا ہوں انتظار

حاصل وصول کچھ بھی نہیں ہوگا، اے ظفر
پانی یہ رائگاں ہی بلوتا ہوں انتظار

☆

تکتا ہوں اُس طرف نہ لپکتا ہوں انتظار
بجلی سا دور دور چمکتا ہوں انتظار

رہتا ہوں آس پاس تمہارے فریب کے
پھنستا ہوں جال میں نہ پھڑکتا ہوں انتظار

دیوانہ وار تجھ سے لپٹ جاؤں گا کبھی
یہ جو بظاہر اتنا جھجکتا ہوں انتظار

طوطا ہے کوئی اور، ہوں جس کے نصیب میں
یہ شاخِ دوست ہے نہ پکتا ہوں انتظار

رہتا ہے وہ تو اور کسی کے بہاؤ میں
میں جس کے راستے میں اٹکتا ہوں انتظار

پکڑا بھی جاؤں گا کسی دن، یہ جو آکے روز
گھڑی سی بار بار اُچکتا ہوں انتظار

احباب میرے بجھنے سے مایوس ہو چلے
میں اتنی دیر سے جو بھڑکتا ہوں انتظار

لیتا ہوں کیا کسی کا، بھری بزم میں اگر
کانٹا سا اپنے دل میں کھٹکتا ہوں انتظار

مضبوط بھی بہت نظر آتا ہوں اے ظفر
اور درمیاں میں ٹوٹ بھی سکتا ہوں انتظار

☆

اندر کی ایک تہہ سے نکلتا ہوں انتظار
میں اپنے ساتھ ساتھ جو چلتا ہوں انتظار

دروازہ سا کھلا ہوا رہتا ہوں آج کل
جھوٹی کسی امید میں ڈھلتا ہوں انتظار

آئے تو اتنی بھیڑ میں پہچان لے مجھے
آنکھوں میں رکھ کے مُنھ پہ بھی ملتا ہوں انتظار

میں خود کو تھام لیتا ہوں گرنے سے پیشتر
اس فرشِ خواب سے جو پھسلتا ہوں انتظار

روکیں کبھی تو میرے کنارے مجھے کہیں
میں جن سے آئے روز اچھلتا ہوں انتظار

یہ پیڑ وہ ہے جس پہ نہ پھول آئیں گے نہ پھل
اس خاک میں فضول ہی پلتا ہوں انتظار

دامن سے اپنے خود ہی لگا لوں جسے کبھی
اُس آگ کی تلاش میں جلتا ہوں انتظار

شاید کہ آخری ہی نکل آئے ایک دن
میں اس لیے بھی روز بدلتا ہوں انتظار

آنسو نہیں ہیں اور شبِ گریہ ہے اے ظفر
آہٹ نہیں ہے اور دہلتا ہوں انتظار

☆

خود سے چھپ چھپا کے جو کرتا ہوں انتظار
ر کرتا ہوں انتظار کہ ڈرتا ہوں انتظار

اُس نے تو جیسے دل سے بھلا ہی دیا مجھے
اب کس کے آسماں سے اترتا ہوں انتظار

ملتا نہیں ہے کوئی نکلنے کا راستہ
یوں اپنے ارد گرد بکھرتا ہوں انتظار

کچھ اپنے آس پاس لرزتا ہوں رات دن
کچھ اُس کے درمیاں سے گزرتا ہوں انتظار

رُکتی ہوئی ہوا کو چلاتا ہوں چار سو
مچلتے ہوئے لہو میں ٹھہرتا ہوں انتظار

اک خواب اُچھالتا ہے مجھے آبِ سرخ سے
اک پاؤں ہے کہ خاک پہ دھرتا ہوں انتظار

اس کے بغیر میرا گزارہ ہی اب نہیں
خالی ہوں اپنے آپ میں بھرتا ہوں انتظار

پانی میں جا کے آپ بھی پانی ہوا ہوں میں
ہے یوں کہ ڈوبتا نہ اُبھرتا ہوں انتظار

لٹکا ہوا ہوں جیسے کہیں بیچ میں ظفر
جیتا ہوں انتظار نہ مرتا ہوں انتظار

فہمیدہ ریاض

وینس میں موت اور سیاسی پرچھائیاں

''وینس میں موت'' ٹامس مان کی ایک کافی پرانی (۱۹۱۲ء) بہت مختصر ناول ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ بھی ۱۹۲۸ء میں شایع ہو چکا تھا۔ زیادہ شہرت البتہ ساٹھ اور ستر کے عشروں میں ملی جب اس پر انگریزی میں فلم بنائی گئی۔ لیکن یہ بھی اب تو بہت پرانی بات ہوئی۔

مگر مان ایسے ادیب ہیں کہ آج بھی ''وینس میں موت'' پڑھنے والے کو مضطرب کر دیتی ہے۔ اس کی کہانی سے تو سب ہی واقف ہوں گے۔ ایک بوڑھا ادیب سیر و تفریح کے لیے وینس جاتا ہے۔ وہاں وہ ایک حسین لڑکے کو دیکھتا ہے اور اس پر ایسی وارفتگی سے عاشق ہو جاتا ہے جو شاید صرف بڑھاپے میں ہی ممکن ہے۔ جیسا کہ کہاوت ہے کہ سردیوں کی چوٹ بہت درد دیتی ہے۔ یہ بوڑھا بڑی حسرت اور اشتیاق سے اس حسین لڑکے کو دیکھا کرتا ہے اور اچانک موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔ اس طرح میرے ذہن میں یہ حسین لڑکا ''زندگی کی علامت کے طور پر محفوظ تھا جو اس بوڑھے کے ہاتھ سے پھسل رہی تھی، اور جو کہانی کی ایک سیدھی سادی اور سطحی تفہیم تھی لیکن آج غور سے پڑھنے پر اس کی جزئیات ایک نئی طرح رونمائی کرتی نظر آتی ہیں۔

مثلاً یہ کہ کہانی کا آغاز قبرستان سے ہوتا ہے۔ نامور بوڑھا ادیب آشنباخ چہل قدمی کرتا ہوا میونخ کے ایک مضافاتی گورستان میں جا پہنچا ہے جس کے سامنے ایک گورستانی چرچ ہے۔ چرچ کی سیڑھیوں کے اُوپر اسے ایک بدشکل آدمی کھڑا نظر آتا ہے جس کے بال سرخ ہیں اور دہانہ اس طرح چرا ہوا ہے کہ اس کے دانت اور مسوڑھے نظر آ رہے ہیں۔ وہ پست قد اور بدہیئت ہے مگر بڑے تحکمانہ انداز سے کھڑا ہے۔ یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ حالانکہ اس کا لباس مقامی ہے مگر وہ یہاں کا نہیں، کہیں اور کا ہے۔ (بویریا کا نہیں، مان نے لکھا ہے۔)

اس آدمی کو دیکھ کر بوڑھے آشنباخ کا دل اچانک کسی بالکل انوکھی جگہ جانے کے اشتیاق

سے لبریز ہو جاتا ہے وہ تصور کرتا ہے۔

"ایک ایسے بہت گرم دلدلی علاقے کا جس پر ایک بُو دار آسمان پھیلا ہے۔ ایسا علاقہ جس سے بھاپ نکل رہی ہے، جو ہیبت ناک ہے جیسے کرہ ارض کا ابتدائی مادہ ہو جس پر صنوبروں اور استوائی درختوں کے گھنے جھنڈ اور بے حد ہرے پتے والی جھاڑیاں ایک دوسرے میں گتھی ہوئی ہیں، موٹی موٹی گہری ہری شاخوں کی نمی پھٹی پڑتی ہے جن پر ناقابل یقین پھول کھلے ہیں۔ ٹیڑھے میڑھے درختوں کی ننگی جڑیں پانی میں لٹکی پڑ رہی ہیں جو بالکل ساکن ہے، جو ہڑ کے پانی کی طرح گہرا، ہرا کانچ، سایوں سے بھرا، جن میں بے انتہا بڑے بڑے دودھیا پھول کھلے ہیں اور جن پر بے حد بڑے بڑے اونچے شانوں اور عجیب و غریب چونچوں والے پرند بالکل ساکت اور خاموش بیٹھے نیم رخ ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔ گرہ دار باہم گتھے بانسوں کے جھنڈ کے پار کسی چیتے کی آنکھیں جھلملا رہی ہیں۔ آشنباخ نے اپنے دل کو دہشت اور ساتھ ہی ایک ناقابل وضاحت آرزو سے دھڑکتے محسوس کیا۔"

آشنباخ سفر کا فیصلہ کرتا ہے لیکن اس بڑھاپے میں وہ بہت زیادہ مہم جو نہیں ہے۔ وہ بہت دور مشرق بعید چیتے کے پاس نہیں جاتا بلکہ وینس جانے کا فیصلہ کرتا ہے۔

جب وہ اپنے چھوٹے سے بحری جہاز سے اُترتا ہے تو ایک گنڈولا اسے ہوٹل کی طرف لے چلتا ہے۔ مٹیالے بادلوں بھرے آسمان کے نیچے کھلے سمندر کے سینے پر آشنباخ گنڈولا کے ملاح کے ساتھ اکیلا ہے۔ اس ملاح کی شکل، حلیہ بلکہ چرا ہوا دہانہ تک بالکل اس آدمی کی طرح ہے جو اسے میونخ کے گورستانی چرچ میں نظر آیا تھا۔ یہ بات آشنباخ کو اس وقت یاد نہیں آتی۔ مگر وہ یہ ضرور محسوس کرتا ہے کہ یہ اکھڑ، تحکمانہ انداز میں بولنے والا شخص وینس کا یا اطالوی نہیں، کہیں اور کا ہے۔ آشنباخ اس آدمی کے ساتھ ہوٹل نہیں جانا چاہتا۔ وہ اس سے کہتا ہے کہ مجھے اسٹیمر پر لے چلو۔ لیکن ملاح کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اسے ہوٹل لے جاتا ہے۔

آشنباخ وینس کیوں آیا؟ ٹامس مان کے الفاظ میں وہ "relief" چاہتا ہے۔

ہوٹل میں آشنباخ کو یہ کم سن لڑکا نظر آتا ہے جو چودہ برس سے زیادہ نہیں اور اس قدر حسین ہے کہ آشنباخ اسے دیکھ کر دم بخود رہ جاتا ہے ساحل سمندر پر اس کی نگاہیں اس لڑکے کا تعاقب کرتی رہی ہیں جس کا نام آجدیو۔ یا تادزیو ہے۔ ایک بار وہ ہوٹل کی لفٹ میں تادزیو کو نزدیک سے دیکھتا ہے تو وہ اتنا نازک معلوم ہوتا ہے کہ شاید پوری عمر تک نہ جی سکے۔ اس اندازے پر

آشنباخ کو جو مسرّت محسوس ہوتی ہے، وہ اس پر شرمندہ ہوجاتا ہے اور پھر اسے علم ہوتا ہے کہ وہ اس لڑکے سے ایک مسرت بھرا عشق کرنے لگا ہے۔

ساتھ ہی اسے احساس ہونے لگتا ہے کہ وینس میں ہر طرف ایک تیز، ناگوار کاربولک ایسڈ کی بو آنے لگی ہے۔

دھیرے دھیرے، یعنی چند دنوں میں، اس عشق کی شدت اتنی بڑھتی ہے کہ آشنباخ حماقت بھری حرکتیں کرنے لگتا ہے جن کو دوسروں میں دیکھ کر وہ افسوس کرتا اور رحم کھاتا تھا۔ وینس آتے ہوئے بحری جہاز میں اس نے کچھ نوجوانوں کو خرمستیاں کرتے دیکھا تھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ ان میں سے ایک دراصل نوجوان نہیں تھی بلکہ ایک بوڑھا تھا جس نے وگ پہن رکھی تھی اور نقلی دانت لگا رکھے تھے اور چہرے پر رنگ و روغن لگا کر نوجوانوں کی سی حرکتیں کر رہا ہے۔ تب آشنباخ نے بڑی عبرت محسوس کی تھی، لیکن اب وہ خود ایک سنگھار گھر جا کر اپنے بال سیاہ رنگوا لیتا ہے، ہونٹوں پر سرخ رنگ ملواتا ہے اور چہرے پر رنگ و روغن اور پوڈر لگا کر جوان نظر آنے کی کوشش کرتا ہے۔

ایک رات ہوٹل میں گانے والوں کا ایک طائفہ آتا ہے۔ وہ بازاری مقبولِ عام قسم کے گیت گاتے ہیں لیکن ساحل سمندر پر آنے والے یورپ کے چھوٹے بڑے ممالک کے سیاح ان گیتوں کو بڑے شوق سے سنتے ہیں کیونکہ یہاں وہ صرف رونق میلہ دیکھنے آئے ہیں۔ اس طائفے کا سربراہ بالکل اس شخص کے چہرے مہرے کا ہے جسے آشنباخ نے میونخ کے گورستانی چرچ میں دیکھا تھا۔ یہ شخص نصف مسخرہ اور نصف دادا گیر ہے۔ ایک طرف مذاق کرتا ہے اور دوسری طرف دھمکاتا ہے۔ دیکھنے والے صاف بتا سکتے ہیں کہ یہ مقامی نہیں، کہیں اور کا ہے۔

محفل کا آخری گیت یہ شخص گاتا ہے۔ ایک ایسا گیت جو کسی اجنبی زبان میں ہے اور جس کے ٹیپ کا شعر الفاظ میں نہیں صرف ایک بلند حقارت بھرا مذاق اُڑانے والا قہقہہ ہے۔ جس میں طائفے کے سب لوگ شامل ہوجاتے ہیں۔ وہ ایک طرف مذاق کرتا ہے مگر دوسری طرف دھمکاتا نظر آتا ہے۔ مگر گیت کے دوران رفتہ رفتہ تمام تماشائی بھی قہقہے میں شامل ہونے لگتے ہیں، حالانکہ وہ انگلی سے ان کی ہی طرف اشارہ کر کر کے قہقہے لگا رہا ہے۔

اس شخص سے ایک تیز ناگوار کاربولک ایسڈ کی بو پھوٹ رہی ہے۔ یہ وہی بو ہے جو وینس کے پانی اور گلی کوچوں سے آرہی ہے کیونکہ وینس میں ایک خوفناک وبا پھیل چکی ہے جس سے سینکڑوں لوگ مر رہے ہیں جبکہ باہر سے آنے والے سیاحوں سے یہ بات بہت سختی سے چھپائی

جارہی ہے مبادا وہ وینس چھوڑ کر واپس چلے جائیں اور شہر کا سب کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جائے۔

وینس کے باسی سچ نہیں بتا رہے ہیں، لیکن راگ رنگ کی اس محفل کے دوسرے دن ایک سیاحتی ادارے کا انگریز ملازم آشنباخ کے پوچھنے پر اس کے بوڑھے چہرے پر اداس آنکھوں کا سامنا نہیں کرسکتا اور سچ اُگل دیتا ہے۔

''یہ ایشیائی کالرا ہے۔'' وہ کہتا ہے ''یہ وبا گنگا کے کنارے اس کی شاخوں کے درمیان بھاپ اُڑاتی دلدلوں میں پیدا ہوئی جہاں بے حد گھنے بانس کے جنگلوں میں چیتے دبکے بیٹھے ہیں ...... یہ وبا ہندوستان سے چین پہنچی اور خشکی کے تمام خطوں میں پھیل گئی۔ شام کی بندرگاہ سے یہ بحیرۂ روم پار کرتی یہاں تک پہنچ گئی ہے۔''

(اوہو! لیکن آشنباخ نے وہیں جانے کی حسرت تو کی تھی! ان دلدلوں (جیسے کرۂ ارض کا ابتدائی مادّہ ہو) کی بھاپ اُڑاتی سانس طویل سفر طے کرتی ہوئی اس تک وینس میں آ پہنچی ہے!)

انگریز آشنباخ کو پھر جو بتاتا ہے وہ میرے خیال میں بہت بامعنی ہے۔ وہ کہتا ہے۔

''ذمہ دار افسران خاموش ہیں اور مسلسل تردید کرتے جارہے ہیں۔ شہر کے میڈیکل افسر نے حقیقت چھپانے سے انکار کردیا تھا اس لیے اسے برطرف کردیا گیا اور ایک سمجھوتہ باز افسر اس کی جگہ رکھ لیا گیا۔ بالائی حلقوں کی بے ایمانیوں نے پورا ماحول مسموم کرڈالا ہے۔ پتہ نہیں چلتا کہ اب وبا کہاں پھوٹ پڑے گی۔ اس بدعنوانی نے شہر میں غنڈہ گردی بھی عام کردی ہے۔ چوری اور ڈاکہ زنی کی وارداتوں میں حد درجہ اضافہ ہوا ہے۔''

یہ سن کر وہ پہلا خیال جو آشنباخ کے ذہن سے گزرتا ہے یہی ہے کہ یہ حقیقت وہ تادزیو کے خاندان کو بتادے تاکہ وہ فوراً یہ شہر چھوڑ کر چلے جائیں ...... اور وہ خود؟ وہ خود بھی واپس چلا جائے۔ کم سن حسین لڑکے کو حسرت سے تکتے رہنے اور اس کا تعاقب کرنے کی دیوانگی سے چھٹکارا حاصل کرے، عقل سے کام لے اور دوبارہ اپنی جہد بھری زندگی کا آغاز کرے۔ جس کا ثمر وہ تحریریں ہیں جن کو لوگوں نے شاہکار قرار دیا ہے اور اس کی اتنی عزت و توقیر ہے۔ لیکن اس کے دل میں لالچ سما گئی ہے۔ وہ اس بات پر آمادہ نہیں ہوتا۔ ''نہیں! نہیں!'' وہ سوچتا ہے۔'' اس بات کا قطعی ذکر ہی نہیں کرنا چاہیئے۔ میں خاموش رہوں گا۔'' اور وہ خاموش رہتا ہے۔

اس رات آشنباخ ایک خوفناک خواب دیکھتا ہے جس میں بے حد شور وغل ہے۔ چیزوں کے توڑے جانے کے دھماکے ہیں۔ مرد اور عورتیں دانت نکوسے شہوت بھرا ناچ ناچ رہے ہیں۔

عورتیں دونوں ہاتھوں میں اپنے پستان پکڑ کر انہیں جھنجوڑ رہی ہیں۔ نوجواں بھالے اٹھائے بکریوں اور ایک دوسرے کے گوشت میں گھونپ رہے ہیں اور انسانی خون چاٹ رہے ہیں، اس منظر میں گوشت کی تیز بو ہے لیکن اس دوزخ کے منظر میں ایک نہایت سریلی بانسری بجے چلی جا رہی ہے جو سننے والے کو پوری طرح اپنے سحر کی گرفت میں لے لیتی ہے۔

اور بار بار نعروں کی آواز آ رہی ہے۔ نیم دیوانے وحشی کچھ پکار رہے ہیں۔ کوئی ایسا لفظ جس کے آخر میں ای یو (آئی یو) کی آواز آتی ہے۔

اس دوران یہ بھی ہوا ہے کہ آشنباخ کی طبیعت خراب رہنے لگی ہے۔ وبا کے جراثیم اس پر اثر کر گئے ہیں، لیکن وہ اس بارے میں سوچتا تک نہیں اور اپنا روزانہ معمول جاری رکھتا ہے۔

وینس آہستہ آہستہ سیاحوں سے خالی ہو رہا ہے۔ لوگوں کو حقیقت کا پتہ چلتا جا رہا ہے اور وہ جا رہے ہیں۔ ایک صبح آشنباخ ہوٹل کی لابی میں تادزیو کے خاندان کا سامان بندھا ہوا رکھا دیکھتا ہے۔ ''اچھا تو یہ لوگ بھی جا رہے ہیں۔'' اسے معلوم ہوتا ہے۔ ''کب؟'' وہ پوچھتا ہے۔ ''دوپہر کے کھانے کے بعد۔'' ہوٹل کا منتظم اسے بتاتا ہے۔

آشنباخ ساحل پر اپنی مخصوص کرسی پر آ بیٹھتا ہے۔ کچھ فاصلے پر تادزیو موجود ہے اور اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ اچانک کھیل پر تشدد ہو جاتا ہے۔ تادزیو کا ایک ساتھی اسے مارنے لگتا ہے اور اسے اوندھا گرا کر اس کا منہ ریت میں ٹھونس دیتا ہے۔ آشنباخ حیرت اور غصے سے اٹھنے ہی والا تھا تا کہ تادزیو کو بچائے، لیکن تب ہی اس کا ساتھی اسے چھوڑ دیتا ہے۔ تادزیو اٹھا، اپنی سانس درست کی اور ساتھیوں کو چھوڑ کر اکیلا ریت پر چہل قدمی کرنے لگا۔ اس کے ساتھیوں نے کئی بار اسے پکارا لیکن وہ واپس نہ آیا۔ پھر اس نے مڑ کر آشنباخ کو دیکھا۔ وہ مسکرایا اور آشنباخ کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اشارے سے اسے بلا رہا ہو۔ بس اسی لمحے آشنباخ کی جان نکل جاتی ہے۔

تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ لڑکا ''زندگی'' کی علامت نہیں، یہ ''حسن'' ہے، جیسا کہ کلاسیکی یونانی تصور تھا۔

حسن کا آخری نظارہ وہ اس طرح کرتا ہے۔

''دور...... ایک تنہا پیکر، جس کی زلفیں ہواؤں میں غلطاں تھیں۔ دور سمندر اور ہواؤں میں کہر آلود، دماغ سے عاری شے کے بالمقابل......''

لیکن سوال یہ ہے کہ پھر مجھے اس ناول میں سیاسی اشارے کیسے نظر آئے؟

بات یہ ہے کہ ناول کے پہلے ہی پیراگراف میں بلکہ پہلی سطروں میں لکھا ہے۔

"فان آشنباخ اپنے گھر سے تنہا چہل قدمی کے لیئے نکلا تھا یہ...... ۱۹ کے موسم بہار کی ایک سہ پہر تھی جب یورپ ایک ایسی نشست پر بے چینی سے بیٹھا تھا جس پر ایک خوفناک بلا مہینوں سے سایہ فگن تھی۔"

ناول میں ٹامس مان آشنباخ کے یورپین ہونے پر اصرار کرتا ہے وہ کسی قسم کا مشہور ادیب ہے، یہ بتاتے ہوئے مان لکھتے ہیں، " وہ بے حد مصروف رہتا تھا اور یہ مصروفیت اس کی اپنی انا نے اس پر تھوپ رکھی تھی اور اس کی یورپین روح نے جس پر تخلیق کرتے جانے کی فکر اور فرض کا بارگراں مسلط تھا۔"

" سنہ انیس سو کچھ" بیسویں صدی کا آغاز، یورپ کے لیئے نہایت اہم اور طوفانی سیاسی اور نظریاتی کش مکش سے عبارت ہے۔ اسی دور کے بطن میں فسطائیت کے خد و خال نشو ونما پا رہے تھے۔ لہٰذا لامحالہ میرے ذہن میں یہ تفہیم ابھری کہ وہ بدہیئت آدم زاد جو بدتمیزی اور تحکم سے گورستانی سیڑھیوں کے چرچ پر کھڑا تھا دراصل فاشزم تھا جو یورپ پر اپنا سایہ ڈال رہا تھا۔ وہی ایک کھلے سمندر میں آشنباخ کی مرضی کے بغیر اس کی ناؤ کو اپنی رضا سے ایک سمت لیے جا رہا تھا اور یورپ بھر سے آئے سیاحوں (جو یورپی اقوام کی نمائندگی کرتے ہیں) کو مضحکہ خیزی اور غنڈہ گردی کا ملا جلا گیت سنا رہا ہے اور گستاخی سے زبان نکال کر اور ان کا منہ چڑا کر غائب ہو جاتا ہے جبکہ انجان تماشائی بغیر سوچے سمجھے تالیاں بجاتے رہ جاتے ہیں۔

اسی طرح میری تفہیم کے مطابق وینس میں پھیلی ہولناک وبا بھی فاشزم ہی تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں بھی یورپ بھر میں کئی ممالک میں یہودی دُشمن تحریکیں جاری تھیں۔ ان کو مارنا پیٹنا، قتل کر دینا، جبراً شہر یا کوئی علاقہ خالی کر دینے پر مجبور کرنے کے واقعات ہوتے رہتے تھے جبکہ اس صورتحال سے اسی طرح چشم پوشی کی جا رہی تھی جیسے وینس کے حکام وبا کا ذکر نہیں ہونے دے رہے تھے۔ اس خیال کو تقویت یوں ملی کہ ٹامس مان فاشزم کے پرجوش مخالفین میں شمار ہوتے ہیں۔ لیکن یہ تفہیم سو فیصد دُرست اس لئے نہیں ہو سکتی تھی چونکہ ۱۹۱۲ء میں یہ کتاب Der Tod in Venedig شائع ہو چکی تھی جبکہ ابھی پہلی جنگ عظیم بھی نہیں ہوئی تھی۔ کتاب کے پہلے پیراگراف میں جس "مہیب بلا" کا ذکر ہے جو یورپ پر سایہ فگن ہے، جنگ عظیم اول ہی ہو سکتی تھی جو ۱۹۱۴ء میں، یعنی اشاعت کے دو برس بعد شروع ہوگئی۔

اس لیے میں نے اس کتاب کے مبصرین سے رجوع کیا۔ مبصرین کی تفاہیم کو پڑھ کر

بیسویں صدی کے ادیبوں کی گہرائی اور گیرائی کا خوشگوار اندازہ ہوتا ہے۔ ٹامس مان خصوصاً ان ادیبوں میں سے تھے جن کے پس منظر میں ایک طرف تو پوری یونانی اساطیر تھیں۔ یونانی فلسفہ تھا اور ساتھ ہی اس فلسفے کی بنیاد پر مستقل پیدا ہونے والے مزید فلسفے تھے جو ٹامس مان کے ہم عصروں تک پہنچتے تھے۔ ساتھ ہی انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے آغاز میں یورپ میں نفسیات اور نفسیاتی تجزیوں کا نہایت بارآور دور پھل پھول رہا تھا، (اس ناول میں بھی مان لکھتے ہیں ''اب جبکہ یورپ نفسیات کا بہت شائق ہو چکا ہے'')۔

کتاب کے مبصرین نے سرخ بالوں والے بدہیئت شخص کو سیلینس Saliniues سے تعبیر کیا ہے جو ایک طرح بدی کے دیوتا ڈائی نی سیس کی اَردلی میں تھا جس کی اپالو دیوتا سے جنگ تھی، جو کہ عقل یا ''عقلیت'' کا دیوتا ہے۔

اسی طرح آشنباخ کے خوفناک خواب کو وہ سگمنڈ فرائیڈ کے اس نظریہ کی روشنی میں دیکھتے ہیں کہ تہذیب وتمدن قدغنوں سے عبارت ہے جو انسان کی حیوانی سرشت کو قابو میں رکھتے ہیں جس کے نتیجے میں حیوانیت جوش کھاتی رہتی ہے۔

فرائیڈ ٹامس مان کے ہم عصر تھے (۱۹۳۹ـ ۱۸۵۶ء)۔

بعد کے مبصرین کی زیادہ تر توجہ کتاب میں ہم جنسیت پر مرکوز نظر آتی ہے۔ ان کے مطابق آشنباخ کے اعصاب پر ہم جنسیت مسلط تھی، لیکن آج ایک راقم الحروف جیسے ایشیائی قاری کو خیال آ سکتا ہے کہ خود مبصرین کے اعصاب پر ہوموسیکشولٹی مسلط ہو سکتی ہے کیونکہ کتاب میں تو اور بھی بہت کچھ ہے۔ یورپ میں ملکہ وکٹوریہ کے دور سے لوگ باگ ہم جنسیت سے اس قدر بدکتے رہے ہیں کہ مرد ایک دوسرے سے معانقہ بھی نہیں کرتے۔ ''شیک ہینڈ'' پر اکتفا کرتے ہیں۔ یہ خصوصاً یورپی مسئلہ ہے۔ ہمارے یہاں اس کا ذکر ہی نہیں ہوتا اور اس کی وجہ صرف اس کا قابل اعتراض ہونا نہیں، غالباً یہ بھی ہے کہ یہ اس قدر عام ہے کہ ذکر فضول ہے (حال ہی میں گرانٹا کا جو پاکستان کا خاص ایشو شائع ہوا ہے، اس میں ایک امریکن مبصر نے پختونخوا کے صاحب حیثیت اصحاب کے لیے لکھا ہے کہ دو چار حسین لونڈے رکھنا تو ''اسٹیٹس سمبل'' ہے۔ وہ کیسا صاحب حیثیت ہوگا جس کا کوئی حسین یار نہ ہو، اور کوئی وجہ نہیں کہ اس امریکن نے جھوٹ لکھا ہو۔ اس نے جو تفتیش کی تو اس کو یہی پتہ چلا۔)

مان نے ابتداء میں فلسفی نطشے کے اثر کو بھی قبول کیا تھا لیکن پھر انہوں نے اسے مسترد کر دیا تھا۔ یہ سب اثرات ایک نہایت مختصر ناول میں موجود ہیں۔ تعجب! اور اس کے باوجود یہ بیانیہ ذرا

سا بھی بوجھل نہیں، بہت سبک ہے اور ساتھ ہی خیال افروز بھی ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے ذہن کروٹیں سی لینے لگتا ہے۔ بلاشبہ یورپ نے انیسویں اور بیسویں صدی میں انسان کی کائنات اور خود اپنے وجود کی سمجھ میں بیش قیمت تحقیق کی۔ یہ تفاہیم پڑھتے ہوئے بار بار مجھے علامہ اقبال کا خیال آرہا تھا۔ ان کے نطشے کے ''سپرمین'' سے متاثر نہ ہونے پر بہت کاغذ سیاہ کیا گیا ہے لیکن اقبال کا فکری وفور یورپ میں ہوا۔ اس دور میں وہاں رائج خیالات اور فکر وفلسفہ کے وہ روبرو ہوئے اور اس کو خود سمجھنے بوجھنے کی سعی کی۔ ایسا نہ ہونا اور اپنے تئیں یکسر منزہ از مغرب رکھنا تب ہی ممکن تھا جب کہ ان کا دماغ یکسر لکڑی کا بنا ہوا ہو۔ ٹامس مان اس ناول میں جذباتی ہیجان سے سرشار ادیبوں اور معاشرے کے بارے میں ایک اہم اور متنازع سوال اُٹھاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شاعر اور فنکار تو ہر حد سے گزر جانے کو ہی معراج سمجھتے ہیں لیکن قومیں اور معاشرے جذبات کی رَو میں بہے چلے جانے کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ اس لئے شعراء کی لن ترانیوں کو جذباتی شاعری ہی کو بقول انگریزی محاورہ ''ایک نمک کی چٹکی کے ساتھ نگلنا چاہئے'' کیا جذباتی شاعری ہی وہ سریلی بانسری ہے جو دوزخ کے سے وحشت ناک منظر میں بجے چلی جاتی ہے؟ جو لوگوں کو اپنے سحر کی گرفت میں لیتی ہے؟ آشنباخ کے ہولناک خواب کے بیانیئے کا آغاز وہ اس صراحت کے ساتھ کرتے ہیں۔

''اس رات آشنباخ نے ایک خوفناک خواب دیکھا۔ اگر خواب اس ذہنی اور جسمانی تجربے کے لیے دُرست لفظ ہے جو گو اسے گہری نیند میں ہوا، اور اس کے شعور سے ماورا تھا لیکن وہ اس میں خود موجود نہیں تھا۔ بلکہ جہاں یہ ناٹک کھیلا جارہا تھا، اس کا منچ (تھیٹر) خود اس کی اپنی رُوح تھی جس میں خارجی دُنیا خوفناک حرکتیں کررہی تھی جس کے کرداروں نے چیخ پکار اور خون خرابے کے ذریعے ایک زندگی بھر کی ثقافتی تار و پود کو پیروں تلے روند کر ان کا دھجیاں اُڑا کر انہیں تباہ و برباد کردیا تھا''۔

خواب ختم ہونے تک خواب دیکھنے والا خود وحشت ناک ہجوم میں شامل ہوجاتا ہے۔ یہ ہجوم جو ایک نیا لکڑی کا دیوتا لایا ہے جو بھونڈا ہے اور فحش ہے، اب وہ خود اس کے پجاریوں میں سے ایک ہے۔

تقریباً بیس پچیس برس سے خود ہمارا معاشرہ ایک عجیب وغریب دور سے گزر رہا ہے۔ اس جذباتی ہیجان کا بھرپور آغاز روس کے خلاف جنگ افغانستان سے ہوا اور بڑھتے بڑھتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ اب آئے دن ہمارے گلی کوچوں میں نسانی جسموں کے خون میں لت پت چیتھڑے بکھرے نظر آنے لگے ہیں۔ اسلام کے نام پر جس جذباتی ہیجان سے ہماری قوم کے لاکھوں، شاید

کروڑوں لوگ دو چار رہتے ہیں، غالبًا یورپ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیان پڑنے والے برسوں میں اس سے بہت ملتی جلتی کیفیت سے گزر چکا ہے۔ علامہ نے اپنی فارسی کی ایک نظم میں لکھا تھا کہ مسلم نوجون کو فولادی قوت میں تبدیل کرنے کے لیے اسے صرف شریعت کی راہ پر لگا دینا چاہئے۔ سو بالکل ایسا ہی ہوا ہے ان مجاہدین کو موت کا کوئی ڈر نہیں۔ وہ صرف جنت کے طلب گار ہیں، خدا کی خوشنودی اور اپنے دین کے عشق میں سرشار، وہ روکھی سوکھی پر گزارا کرتے ہیں۔ ساتھ ہی جن علاقوں میں ان کا قبضہ ہے وہاں سے حجاموں اور موسیقاروں کو مار پیٹ کر نکال دیتے ہیں اور اپنے مخالفین، یا غیر فرقے کے لوگوں کی میت قبر سے نکال کر اسے مسخ کرنے میں عار نہیں سمجھتے۔ اب اگر ٹامس مان کے کردار کی زبان میں یہ ہولناک ناٹک ہے (جس کا منچ پاکستان کے عوام کی رُوح ہے) اور جو زندگی بھر کی ثقافتی تار و پود کو پیروں تلے کچل کر ان کی دھجیاں اُڑا رہا ہے، تو کیا ہم سب ان ازخود رفتہ بلند نعروں کی کشش سے مسحور ہوتے چلے گئے ہیں؟ کیا خواب دیکھنے والے، اس خواب کے اختتام تک خود بھی ان میں شامل ہو جائیں گے؟

لیکن آج اگر علامہ زندہ ہوتے، اگر وہ ان عاشقان دین کے جلوس دیکھتے جو ''فلاں کو پھانسی دو'' اور ''فلاں کو قتل کر ڈالو'' کے نعرے لگاتے نکل آتے ہیں تو کیا بے اختیار کرسی سے اٹھ کر ''حسن'' کو بچانے نہ لپکتے؟ یا شاید ان کی بھی سانس گھٹ کر رہ جاتی۔ وہ بہرحال شاعر تھے اور ''حسن'' سے عشق کرتے تھے۔

یہ کون ملاح ہے جو ہماری ناؤ کو من مانے رُخ پر لئے جا رہا ہے؟ آشنباخ اس بدخصلت ملاح کے ساتھ نہ جانا چاہتا تھا لیکن اس نے زیادہ مزاحمت نہیں کی، کیوں؟ ٹامس مان نے اس کی وجہ لکھی ہے۔ ''گنڈولا کی وہ نشست اور اس کے مخملیں گدے بہت زیادہ آرام دہ تھے جن پر آشنباخ بیٹھا ہوا تھا۔ اس پر کاہلی طاری ہوگئی اور وہ خاموش ہوگیا۔''

بہرحال خاموشی اختیار کرنے والا اور گھٹ کر مر جانے والا آشنباخ ٹامس مان کا محض ایک تخلیق کردہ کردار تھا۔ وہ خود ۱۹۳۳ء میں جرمنی چھوڑ کر سوئٹزرلینڈ چلے گئے تھے۔ بعد میں انہوں نے امریکہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے اختتام اور جرمنی کی شکست کے بعد وہ ایک بار پھر اپنے وطن آئے لیکن ۱۹۵۲ء میں دوبارہ سوئٹزرلینڈ چلے گئے۔ یہیں ۱۹۵۵ء میں ان کا انتقال ہوا۔

ٹامس مان کو ۱۹۲۹ء میں اَدب کا نوبل انعام دیا گیا تھا۔

انتظار حسین

کچھ منشا یاد کے بارے میں

منشا یاد کے بارے میں اب تک جو میں نے وقتاً فوقتاً صحیح یا غلط کہا ہے وہ ٹکڑوں نوالوں میں ہے۔ وہ سب ٹکڑے نوالے میرے سامنے ہوتے تو مجھے پتہ چل جاتا کہ کن دنوں ان کے افسانے مجھ پر کس طرح اثر کر رہے تھے اور میرا کیا ردعمل تھا۔ لیجئے ایک ٹکڑا مجھے مہیا ہوگیا۔ اچھا تو میں اسی سے بات شروع کرتا ہوں۔ دیکھیے میں نے اس بھلے آدمی کی شخصیت میں کیا وصف ڈھونڈ کر نکالا ہے۔ اس سے اس کے افسانوں کی طرف بھی اچھی خاصی رسائی ہوتی نظر آتی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ منشا یاد میں ایک بات ایسی ہے جو صرف اچھی لڑکیوں میں پائی جاتی ہے کہ ایک بار ملنے کے بعد دوبارہ ان سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ کتنے لکھنے والوں سے میری ایک ملاقات ہوئی اور اس ملاقات کو میں نے کافی جانا۔ مگر منشا یاد سے جب ایک ملاقات ہوگئی تو اس وقت تو میں نے اس ملاقات کو کافی جانا تھا مگر جب دوسری دفعہ اسلام آباد جانا ہوا تو مجھے خواہ مخواہ اس پہلی ملاقات کا دھیان آیا۔ سوچا کہ چلو اس شہر میں آئے ہیں تو منشا یاد سے بھی ملتے چلیں۔ بس پھر ایسا ہوا کہ جب اس شہر میں آنا ہوا تو منشا یاد سے بھی ملاقات ہوگئی اور پھر ہوتی ہی چلی گئی۔

اب سوچتا ہوں تو اس کی دو وجوہات میری سمجھ میں آتی ہیں۔ سیدھی اور پہلی وجہ تو یہ تھی کہ میں جس گلی میں آکر ٹھہرتا تھا اس کے برابر والی گلی میں منشا یاد کا گھر تھا۔ سو میں آسانی سے اپنی گلی سے نکل کر منشا یاد کی گلی میں جا نکلتا تھا۔ مگر اس کے علاوہ بھی ایک وجہ اور بھی تھی۔ یہ شخص آہستہ بولتا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے احساس ہوا کہ اس کی آواز ایک حد سے اونچی ہو ہی نہیں سکتی۔ میں نے سوچا کہ شکر ہے اس شہر میں ایک عزیز تو ایسا بھی ہے جس کا حلق بس درمیانہ درجے کا ہے۔ ویسے تو اس وقت اس شہر میں ان دنوں یوں بھی شور کم تھا۔ ابھی بستی پوری طرح بسی نہیں تھی۔ بسنے کے عمل میں

تھی۔ باہرفٹ پاتھوں پر پیدل مخلوق کم کم نظر آتی تھی۔ ٹریفک بھی کم تھا اور رکشہ کی سواری تو سرے سے تھی ہی نہیں۔ اس لیے ٹریفک کا شور بھی بہت کم تھا۔ مگر جو لکھنے والے یہاں جمع ہو چلے تھے وہ بالعموم بلند آہنگ تھے۔ ویسے بھی اس زمانے میں ایک خاص قسم کے افسانے کا بہت شور تھا۔ یہ شور اسلام آباد کی خاموش فضا میں کچھ زیادہ ہی پرشور محسوس ہوتا تھا اور اس سے یہ لگتا تھا کہ اسلام آباد میں جو بھی لکھنے والے ہیں وہ سب افسانہ نگار ہیں اور یہ سب علامتی تجریدی افسانے لکھتے ہیں۔

اصل میں ادب میں جب کوئی نیا تجربہ ہوتا ہے یا کوئی نیا طرزِ اظہار نمودار ہوتا ہے تو اسے مخالفوں سے خطرہ کم ہوتا ہے مقلدوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ ان کے ہاتھوں میں وہ ایک فیشن بن جاتا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ نئے فیشن کی کتنی آب و تاب ہوتی ہے۔ جو اس فیشن کو نہیں اپناتا وہ کتنا دقیانوسی نظر آتا ہے۔ مگر میں نے یہ دیکھا کہ منشایاد فیشن ایبل افسانہ نگاروں کے ساتھ گھلا ملا بھی ہے مگر افسانہ فیشن سے ہٹ کر لکھ رہا ہے۔ مگر چونکہ اس زمانے میں اس فیشن کا سکہ چل رہا تھا اس لیے اس افسانہ نگار کا نام اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں زیادہ نہیں اچھلا۔ شاید یہ افسانہ انتظار کر رہا تھا کہ کب فیشن ایبل افسانے کا سورج ڈھلے اور کب وہ اپنا جلوہ دکھائے۔

منشایاد کا کہنا ہے کہ کہ ''میں ہر کردار کی کھال میں چھپ کر بیٹھ جاتا ہوں'' مگر شاید کردار کی تخصیص نہیں ہے۔ یا پھر یوں ہے کہ وہ یاروں دوستوں کو بھی اپنے کردار ہی سمجھتا ہے کہ آہستگی سے ان کے اندر گھر کر لیتا ہے۔ شاید اسی لیے جب میں اسلام آباد جاتا ہوں تو میری کھال کو کچھ ہونے لگتا ہے۔ اصل میں ایک تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو دوسروں پر چھا جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی بلند آہنگی بھی اسی کوشش کا حصہ ہوتا ہے۔ دوسری قسم کی شخصیتیں وہ ہوتی ہیں جو چپکے چپکے آپ کے دل کے اندر گھر کر لیتی ہیں۔ منشایاد کی شخصیت میں جارحیت پسندی کا رنگ نہیں ہے، نہ بلند آہنگی ہے۔ آہستہ روی سے آپ کے قریب آتا ہے اور آپ کے دل میں گھر کر لیتا ہے۔ اب سمجھ میں آیا۔ اس کے افسانوں میں بھی یہی صفت ہے۔ اس لیے جب اردگرد علامتی تجریدی افسانے کا ڈنکا بج رہا تھا اس وقت اس کے افسانوں نے ایسی دھوم نہیں مچائی۔ وہ تو جب اس فیشن کا طلسم ٹوٹا اور یہ شکایت شروع ہوئی کہ تجریدی افسانے سے کہانی کہاں غائب ہوگئی، تب کہانی کی ڈھنڈیا پڑی۔ اور تب منشایاد کے افسانوں پر نظر گئی۔ پتہ چلا کہ کہانی تو ان افسانوں میں چھپی بیٹھی ہے۔ گویا یہ افسانے کہانی کی واپسی کی خوش خبری لے کر ابھرے۔ موٹے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ رشید امجد کے افسانوں کو دیکھ کر کہانی رفو چکر ہوئی تھی، منشایاد کی انگلی پکڑ کر واپس آئی۔ عجب افسانے

ہیں۔حقیقت نگاری کے اس ہنگامہ خیز دور کے افسانوں کی طرح کے بھی نہیں، جب ہر افسانہ سماجی حقیقت نگاری کا علم لے کر نمودار ہوتا تھا اور اتنی دھوم مچاتا تھا کہ نوبت تھانے تحصیل تک پہنچ جاتی تھی۔اور علامتی تجریدی دور کے ان افسانوں جیسے بھی نہیں ہیں جن سے صرف کہانی غائب نہیں ہوتی تھی بلکہ معنی و مفہوم کا پتہ نشان بھی مشکل سے ملتا تھا۔اس لیے شک ہوتا تھا کہ ان کی تہہ میں کوئی بہت گہرے معنی پوشیدہ ہیں۔اس سے نقادوں کو بھی بال کی کھال نکالنے کا موقع ہاتھ آتا تھا۔ان افسانوں میں بیان حقیقت نگارانہ ہی ہوتا ہے۔مگر بیچ بیچ میں شک گزرتا ہے کہ کہیں یہ سارا بیان علامتی تو نہیں ہے۔خود منشا یاد کچھ نہیں بتاتا۔وہ تو کرداروں کی کھالوں کے اندر چھپا بیٹھا ہے۔بس اس کی طرف سے اتنی ضمانت ضرور ہوتی ہے کہ یہاں معنی مبہم نہیں ہیں۔سیدھی سچی کہانی ہے۔غور سے پڑھو گے تو معنی بھی جو کچھ ظاہر، کچھ پوشیدہ ہیں، سمجھ میں آجائیں گے۔یہی ان افسانوں کی مقبولیت کا راز ہے۔ان کے ایک افسانے 'تماشا' کو مظفر علی سید نے پریم چند کے افسانہ 'کفن' کی ٹکر کا افسانہ بتایا ہے۔مظفر کا کہا میرے لیے سند ہے۔اس سے آگے میرے لیے کہنے کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے۔

حسن منظر

اردو کے نئے ناولوں سے متعلق چند باتیں

یہ شام اردو کے دو خدام رضیہ فصیح احمد اور مصطفیٰ کریم کے نئے ناولوں کے ظہور میں آنے کی تقریبِ مسرت ہے۔ ’اُردو کے خدام‘ کے الفاظ میں سہواً نہیں کہہ بیٹھا ہوں، اِن کے پیچھے میری وہ خفگی چھپی ہے جو اَن گنت لکھنے والوں کے اُن گھسے پٹے الفاظ سے پیدا ہوئی ہے جو اردو کو اس اور اُس کے گھرانے کی لونڈی کہتے اور لکھتے آئے ہیں۔ زبان انسان کی ماں ہے وہ کوئی بھی کتنا بھی بڑا نثرنگار یا شاعر ہو، اس کے گھر کی لونڈی کیا نوکرانی بھی نہیں ہوسکتی ہے۔ دنیا کی ہر زبان یہی عزت و مرتبہ سب سے چاہتی ہے اور اردو تو وہ زبان ہے جب وقت نے کتنی ہی زبانوں کو نہ بولے جانے والی زبان بنا دیا ہے اُس کے عاشق اس کا ساتھ وہاں بھی چھوڑنے کو تیار نہیں ہیں جہاں ترقی یافتہ دنیا کی زبانوں کا راج ہے، جن کے لکھنے والوں کو سو طرح کی سہولتیں ہیں، اُن کے ادیب بھوکے نہیں مرتے ہیں اور کتابوں کے پہلے ایڈیشن ہزار کی جگہ دس ہزار اور لاکھ کی تعداد میں چھپتے ہیں۔ اب یہ اردو سے عشق نہیں تو کیا ہے کہ مغربی ممالک میں بسنے والے جانتے ہیں کہ وہاں کے چھوٹے سے چھوٹے ملک کی زبان میں چھپنے والی کتاب، بات ادب کی ہو رہی ہے، بغیر مانگے لکھنے والے کے لیے رولٹی لیے آتی ہے اور اردو میں چھپنے والا اس پر بھی خرسند رہتا ہے کہ وہ اپنے پبلشر کے ساتھ نصف یا مکمل نقصان اٹھانے پر راضی ہے کیونکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ جہاں اردو سمجھنے اور بولنے والوں کی تعداد دنیا بھر میں بڑھ رہی ہے وہاں اس کی کتابوں کے خریداروں کی تعداد خود اُس کے ملک میں روبزوال ہے۔

کبھی جب کسی ایسے نوجوان سے واسطہ ہوتا ہے جو اعلیٰ تعلیم کے لیے اردو ادب اور زبان کا انتخاب کرتا ہے تو مجھے اتنا ہی تعجب ہوتا ہے جتنا یہ پڑھ کر کہ کسی مغرب ملک میں بسنے والے نے

اردو کو اپنی افتادِ طبع کا ذریعۂ اظہار بتایا ہے، یا بنائے رکھا ہے۔ یہ نہیں کہ مجھے اس کی انگلش دانی میں شبہ ہو، شبہ اس پر بھی نہیں ہوتا ہے کہ دس، بیس بلکہ تیس چالیس سال برطانیہ عظمیٰ، کینیڈا اور ریاستہائے متحدہ میں رہتے رہنے کے باوجود وہ مجھ سے کہیں زیادہ رواں اردو بولتا ہے۔

تو جن دو اردو ادیبوں کے نئے ناولوں کے وجود میں آنے کی تقریب میں آج ہم شریک ہوئے ہیں اُن سے یہی کہہ سکتے ہیں واللہ باللہ آپ غیر ملکوں میں رہتے ہوئے اپنی زبان کے لیے وہ کام کررہے ہیں جس کا صلہ نہ آپ کی وہاں کی نئی پود آپ کو دے سکتی ہے، نہ یہاں کی جہاں کی قومی یا نصف قومی زبان اردو ہے جہاں یہی فیصلہ آج تک نہیں ہو پایا ہے کہ اردو علاقائی زبان ہے، قومی یا رابطے کی زبان۔

میرا خیال ہے ان دو قابلِ رشک ہستیوں کے جنھیں ہم دشت اردو میں اپنا ہم سفر سمجھتے ہیں جو باہر کے ملکوں میں رہ کر بھی نہ اردو بولنے سے باز آتے ہیں نہ لکھنے سے حالانکہ یہ سراسر گھاٹے کا سودا ہے اور جنھوں نے اردو کے مراکز اپنے اردگرد اُن ملکوں میں بنا رکھے ہیں انہیں اُن کی خلوصِ نیت اور اردو کے دام محبت میں گرفتار رہنے کی داد دیں اور انہیں اپنے اس راز میں شریک کریں سرکار وہاں آپ کی اردو کی محفلیں ہیں، آپ کے گھروں میں اردو کتابوں کا ذخیرہ ہوگا، آپ کے پاس اردو/ہندی موسیقی کے کیسیٹ اور سی ڈیز ہیں، وہاں سے آئے دن اردو رسائل اور اخباروں کا اجراء، ہم جیسوں کی کتابوں کو انگلش میں منتقل کر کے دنیا کو جتانا کہ ہماری بھی کوئی زبان ہے، کوئی ادب ہے، لیکن رازداری کا سوال یہ ہے کیا ہمارے بچوں کی طرح آپ کے بچوں کو بھی اردو فکشن، فلمیں، موسیقی اتنی ہی Slow لگتی ہیں جتنی ہمارے بچوں کو؟ میرا خیال ہے اس لفظ کا اردو بدل کوئی نہیں کیونکہ اس میں اُن کی اکتاہٹ بھی ہے اور زندگی کی تیز رفتاری بھی۔ انہیں توکل کے ٹینیسی ولیمز Tennessee Williams کی A Streetcar Named Desire بھی سلو لگتی ہے اور کالیداس کی شکنتلا بھی۔

حوصلہ افزائی کے لیے میرا ان ہمراہان اردو کے لیے جواب یہ ہے صاحب آپ اپنے کام میں لگے رہیے ہم اپنے۔ نہ آپ اپنی خو بدلیں گے نہ ہم اپنی وضع، رہی نئی پود کہ وہ آگے چل کر ہماری کتابوں وغیرہ کا کیا کرتی ہے اس حشر کو دیکھنے کے لیے ہم کب یہاں ہوں گے جو اس پر کڑھیں!

جب ہندوستان بہت سوں نے چھوڑا اور ہندی رسم الخط نے اردو کی جگہ لے لی — میں بوجھ کر رسم الخط کی ترکیب استعمال کررہا ہوں کیونکہ اردو زبان کو دیش نکالا نہیں ملا تھا — تو سننے

میں یہی آتا رہا تھا کہ پڑھے لکھے گھرانوں میں اردو کتابوں کا اثاثہ الماریوں میں بند پڑا ہے، پڑھنے والا کوئی نہیں ہے۔ لیکن وہ دور بھی گزر گیا اور بولنے والوں کے سوا غزل، موسیقی اور فلم نے اردو کا راج قائم رکھا اور اب یہ حالت ہے کہ قرآن مجید کے اردو تراجم اور تفاسیر اور سیرت صلعم کی کتب تک بھارت سے چھپ کر پاکستان میں آرہی ہیں— اور خوب ہیں۔

اسی طرح نئی پود کی اردو (بلکہ اپنی زبان) سے بیزاری بھی عارضی چیز ہے اور مجھے یقین ہے جو آج لکھا جارہا ہے، جس میں سچائی، مقصد اور حُسن ہے آنے والے وقت میں وہ اُسے کھوج نکالیں گے۔

میں نے اس مختصر سے مضمون میں اُس مریضانہ فکر سے دامن بچایا ہے کہ غیر ملکوں میں جابسنے والے اپنی زبان اور تہذیب سے اس لیے چپکے رہتے ہیں کہ اس میں انہیں اپنی ذہنی بقا نظر آتی ہے، فنا کا خوف انہیں اس ڈگر پر رکھتا ہے، کیونکہ براہِ راست گفتگو میں، میں نے انہیں اس کا شکار نہیں پایا۔ وہ آسودگی کی تلاش میں وہاں گئے تھے اور آسودہ خاطری انہیں ایسی قنوطیت سے پرے رکھتی ہے۔ سابقہ زبان کا لٹریچر، اس کا روزمرہ، موسیقی ان کی زندگی میں 'زاید' کا رول (کردار) ادا کرتے ہیں۔

'ایک صدی کی کہانی' اور 'قرطبہ' دونوں اہم تحریریں ہیں اور ان کی وقعت آنے والے کل میں آج سے بڑھ کر ہوگی، مجھے یہ کہنے میں باک نہیں ہے۔

رضیہ فصیح احمد اور مصطفیٰ کریم سے میری واقفیت ان کے افسانوں کے ذریعے ہوئی اور انہیں پڑھ کر کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ وقت ضایع کیا۔ دونوں ہی اس دور کے لکھنے والے ہیں اور اس دور کے بارے میں لکھ رہے ہیں۔

ناول افسانے سے نہ صرف اپنے کینوس میں مختلف ہے اپنی ٹیکنیک میں بھی اور تھیم ہی اپنے اظہار کے لیے دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرتی ہے۔

دو، سوا دو گھنٹے کی فلم 'وار اینڈ پیس' دیکھنے پر میرا ردعمل یہ تھا کہ سناریو لکھنے والے نے ایک دن ڈائریکٹر King Vidor کو شام کی آدھ گھنٹے کی سیر کے دوران ٹولسٹوئے کے اس ناول کی کہانی سنائی تھی اور وہ اُنہیں اور پروڈیوسر David Selznick کو اتنی پسند آئی کہ انہوں نے اس کی فلم بنا ڈالی جس میں نپولین تھا، نپولین کی فوج اور دوسرے کردار سب تھے لیکن ناول کی روح نہیں تھی۔ ایک روح سے خالی جسم تھا۔ تقریباً اتنا ہی جتنی حضرت یوسف کی کہانی کہ: پسرے بود، گم شد باز یافت۔ فلم وار اینڈ پیس ایک ناول کا افسانہ ہے اور قصۂ یوسف ایک داستان کی مختصر کہانی۔

یہی معاملہ تمام خالص genuine نوولوں کا ہے – وہ افسانے کی شکل میں نہیں لکھے جا سکتے تھے۔ نہ ہی کوئی افسانہ، خواہ پچاس صفحے ہی کا ہو، دو ڈھائی صفحوں پر پھیلا کر نوول بنایا جا سکتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے افسانہ ایک وقتی حقیقت کا اظہار ہوتا ہے، نوول زمانے یعنی دہر کا۔

ہندوستان کی آزادی کی تحریک اپنے اندر وہ خام مال رکھتی تھی جس سے کتنے ہی زندہ رہ جانے والے نوول وجود میں آئے، جس طرح روس کے بیسویں صدی کے اوائل کی سماجی اور سیاسی رستاخیز نے وہاں کے ادیبوں کو تھیمز، مواقع، اشخاص اور اپنی سرزمین کے حُسن اور زندگی کے جزئیات کا خام مال فراہم کیا تھا اور کون کہہ سکتا ہے اس سے وہاں کے ادیب فیض یاب نہیں ہوئے تھے۔

جس دور میں ہم جی رہے ہیں اُس سب کچھ کا گہوارا ہے جو انسان کی فطرت میں قابلِ نفرت ہے۔ عورتیں اور کمانے والے مرد اغوا کیے جاتے ہیں کہ بدلے میں سربہا یعنی ransom دینے پر چھوڑے جائیں گے۔ بچے اور عورتیں وہ جو انگریزی میں کہتے ہیں، یہیں ہوا میں غائب ہو جاتے ہیں، جنسی ظلم کا شکار بنتے ہیں ان کی لاشیں سر اور اعضاء بریدہ نالوں اور اجاڑ قبرستانوں میں ملتی ہیں۔ تقریباً پورے ملک کو افیون، جانوروں کے خون اور سنکھیا کی آمیزش سے تیار کی ہوئی سپاری اور پڑیوں کا اس حد تک عادی کر دیا گیا ہے کہ بچے تک اس کے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں۔ افیون، چرس اور شراب پر پابندی ہے لیکن ان کینسر پیدا کرنے والی پڑیوں پر نہیں۔ ڈاکے، دن کی روشنی میں ٹریفک کے بیچ لوٹے جانا، بلیک مارکیٹ، چاول اور گیہوں کا لوگوں کی پہنچ سے دور ہو جانا، بچوں اور جوان عورتوں کی فروخت – یہ سب نئے نوول کے لیے خام مال نہیں تو کیا ہے۔ کل اگر شراب کی دکانوں پر پکیٹنگ سے افسانے اور نوول وجود میں آئے تھے تو آج کیوں نہیں اس گھر کی بے بسی سے نوول وجود میں آئیں جس کے افراد دنوں اس شش و پنج میں رہتے ہیں دیکھیں گم ہو جانے والے کی طرف سے پیغام اب آتا ہے، تب آتا ہے کہ وہ زندہ ہے۔

اور نوول ہی وہ صنف ہے جو جس سماج سے پیدا ہوتا ہے سب سے زیادہ اسی کو متاثر کرتا ہے اور اس کا اثر نسلوں رہتا ہے۔

لکھنے کے لیے اس دور میں کیا نہیں ہے – اس ملک کی غربت، پیٹرول پر براجمان عرب ممالک کے عوام کی غربت، عرب ممالک کی نئی عشرت گاہیں جہاں بچوں کے رونے سے اونٹوں کو مہمیز کرنے کا کام لیا جاتا ہے، غریب ممالک سے آنے والی کم عمر خادماؤں کو...... خیر، اس بات کو جانے دیجیے۔ ایسی کم عمر خادماؤں پر تو پانچ سو ہزار صفحے کے المیے لکھے جا سکتے ہیں۔

ایسا دور کب آیا تھا جب ایک ملک میں ہزاروں سال سے بسی ہوئی آبادی کو اسی فیصد زمین سے محروم کر کے وہاں ایک غیر ملکی سفید قوم کو لا بٹھایا گیا جن کا زبان، تہذیب اور اخلاقی اقدار وہاں کی دیرینہ آبادی سے قطعاً مختلف تھیں اور آ بسنے والوں کو اس ادارے نے قانونی اور عسکری تحفظ بخشا جس کا وجود شاید اسی کارِ خیر کے لیے لایا گیا تھا۔

اور اب جیسا موقع آ پڑتا ہے جنہیں بے گھر، بے زمین، بے وطن کیا گیا اگر اپنی پیاسی زمین کے لیے پانی مانگیں، کسی قسم کا احتجاج کریں قابض حکمراں ان پر ہوائی حملے کر کے ان کے گھروں کو برباد اور ان کے زیتون کے درختوں کو ٹینکوں سے زمین پر بچھا جاتے ہیں — پھر جو ہم پڑھتے ہیں یہ ہوتا ہے کہ قابض قوم کے ہم نوا مغربی ممالک اور ان کے کٹھ پتلی عرب حکمران زمین کھو بیٹھنے والے کاشت کاروں سے کہتے ہیں چھیڑ خانی تمہاری طرف سے ہوئی ہے۔ اس قبضہ ناحق کو نئے عالمی قوانین اور معاہدوں کے تحت دنیا نے تسلیم کرلیا ہے اور قبضہ کون نہیں جانتا دوسرا نام ہے ملکیت کا۔

پسماندہ دنیا کے ہر ملک پر آزاد ترقی یافتہ دنیا کی عائد کردہ حکومتیں ہیں جنہیں وہ جمہوریت گنتے ہیں۔ دنیا میں جابجا ان کے فوجی اڈے ہیں، سمندروں میں بارود اور ایٹمی ہتھیاروں سے بھرے تیرتے ہوئے قلعے اور ان ترقی یافتہ عظیم طاقت والے ملکوں نے ایک نئی شریعت کو وضع کیا ہے کہ روس کے پوگردم اور جرمنی کے ہولوکاسٹ کا انکار کرنے والا ایک ایسے گناہ کا مرتکب ہے جس کی سزا قید ہے۔

دوسرے پسماندہ ملکوں کی طرح اس ملک پر بھی دنیا کی سب سے طاقت ور جمہوریت کی بالواسطہ بادشاہت ہے۔ وہ جسے چاہے راج سنگھاسن پر بٹھائے جسے چاہے دربدری دے، جسے پکڑ کر اپنے غیر ملکی زندان میں غیر معینہ مدت کے لیے بلا مقدمہ چلائے لاپتہ کردے...جس کی اجازت خود اس کی زمین پر نہیں ہے۔

رہا اپنا ملک جہاں راوی سدا سے چین لکھتا آیا ہے اس میں بولنے والی زبان پر تو ہمیشہ سے حکمرانوں کے پہرے تھے اب اس پر اُن لوگوں کا پہرا ہے جو حکومت اور عوام دونوں کو خاموش کر دیتے ہیں — جو بھی بولنے کی جسارت کرے۔

پھر ناول نگار کیوں خاموش ہیں۔ ناول سے بڑا کام لینے کا وقت یہ ہے۔

ظفر اقبال

کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

کافی عرصے سے یہ بات میری سمجھ میں نہ آ رہی تھی کہ آخر میری اردو اتنی ناقص کیوں ہے؟ سو، ''دنیا زاد'' کے گزشتہ شمارے میں ''دہشت اور بارود میں لپٹی شاعری'' کے عنوان سے کشور ناہید پر انتظار حسین کا مضمون پڑھ کر بالآخر مجھ پر یہ راز منکشف ہو ہی گیا اور میں نے اپنے آپ سے کہا کہ اور پڑھو انتظار حسین کی نثر! تاہم ایسا لگتا ہے کہ صاحبِ موصوف بعض اوقات دانستہ وہ کچھ کر جاتے ہیں جو انہوں نے مذکورہ مضمون میں کیا ہے۔ چونکہ انتظار حسین نے اپنے مداحوں کو قدرے جرأت اندانہ بھی ارزانی کر رکھی ہے اس لیے اس تحریر کا تھوڑا بہت جائزہ لے لیا جائے تو شاید کچھ ہرج نہ ہوگا۔ مثلاً شروع کا جملہ ہے ''میں اعداد و شمار کے معاملہ میں ذرا کچا ہوں سو میں حساب لگا کر یہ نہیں بتا سکتا کہ اب جو میں کشور ناہید کے متعلق یہ مضمون لکھ رہا ہوں، اس کا نمبر شمار کیا ہے۔'' اس کے اندر ''میں'' کا لفظ تین بار آیا ہے، جب کہ پہلا ''میں'' ہی کافی تھا اور دوسرے دو ''میں'' فالتو ہیں۔ اس سے آگے ''یہ طعنہ سننا پڑتا تھا کہ باقی سب شاعر مر گئے ہیں۔'' اس میں باقی کے بعد ''سب'' کا لفظ فالتو ہے بلکہ ''مر گئے ہیں'' میں ''ہیں'' بھی زائد ہے۔ اس کے بعد ''یہ بات ہمارے مشفق قیوم نظر سے شروع ہوئی اور ٹی ہاؤس کے باہر سائیکل اسٹینڈ پر کھڑے اس نوجوان تک پہنچی جو ادیبوں کی سائیکلوں کی نگہبانی کرتا تھا۔'' ٹی ہاؤس کے بعد ''باہر'' کا لفظ فالتو ہے کیونکہ سائیکل اسٹینڈ ٹی ہاؤس کے باہر ہی ہوسکتا تھا۔ اندر نہیں۔ علاوہ ازیں ''نگہبانی'' کی بجائے لفظ ''نگرانی'' بہتر ہوتا۔ پھر آگے ہے ''اس کا تخلص تھا، بیدل جالندھری۔'' بیدل جالندھری کوئی تخلص نہیں کیونکہ بیدل تخلص ہے اور جالندھری نسبت۔ آگے چلیے۔ ''ایک شام جب میں ٹی ہاؤس پہنچا اور اپنی سائیکل بیدل جالندھری کے حوالے کرنے لگا تو میں نے بھانپ لیا کہ بیدل جالندھری کے

مزاج میں کچھ درہمی ہے۔'' سوالے کرنے لگا کی بجائے ''حوالے کرتے ہوئے'' زیادہ بہتر ہوتا۔ نیز جملے میں بیدل جالندھری کا نام دوسری دفعہ لانے کی ضرورت نہیں تھی۔ آگے چلیے، ''میرا ذکر تو آپ نے آج تک کبھی نہیں کیا'' میں ''کبھی'' زائد ہے۔ اس کے بعد ہے، ''مگر اب مضمون کو لکھتے ہوئے جب میں اپنے اگلے پچھلے لکھے ہوئے مضمونوں و نیز کالموں کو دھیان میں لایا'' اس میں ''لکھے ہوئے'' فالتو ہے جب کہ ''مضمون کی آسان اور درست جمع اگر ''مضامین'' کی شکل میں موجود ہے تو ''مضمونوں'' صحیح نہیں ہے، بالکل ایسے ہی جیسے برہان کی جمع ''براہین'' ہوگی ''برہانوں'' نہیں۔ علاوہ ازیں مضمونوں کے بعد ''و نیز'' کا ٹکڑا لگانا بھی درست ہے نہ اچھا لگتا ہے۔ آگے ہے، ''افسوس کہ میں مشفق خواجہ نہیں ہوں'' میں ''ہوں'' فالتو ہے۔ آگے ہے، ''بہت ٹٹولا مگر وہ پرچہ برآمد نہیں ہوا'' یہاں ''نہیں'' کی بجائے ''نہ'' کا استعمال زیاہ مناسب ہوتا۔ آگے ہے اور ''نئے زمانے کی برہمن کا عنوان قائم کرکے ایک مضمون بھی لکھ ڈالا'' اس میں لفظ ''بھی'' زائد ہے۔ آگے ہے ''مگر میں نے پھر منہ کی کھائی'' اس میں لفظ ''پھر'' زائد ہے۔ آگے ہے ''کشور نے پھر پینترا بدل لیا'' یہاں ''بدل لیا'' کی بجائے ''بدلا'' زیادہ مناسب ہوتا۔ آگے ہے ''اب مجھے پتہ چلا کہ فاروقی صاحب نے کس سیاق و سباق اور کس لہجہ میں داد دی تھی۔'' ''پتہ چلا'' کی بجائے ''معلوم ہوا'' زیادہ بہتر ہوتا۔ نیز ''اور کس سیاق و سباق کے بعد کس لہجہ میں'' میں ''کس لہجہ میں'' فالتو ہے۔ آگے ہے ''کشور ناہید اسے ہجوِ ملیح جان کر اُلٹا مجھے لوٹا دیں'' میں ''لوٹا دیں'' ہی کافی تھا، ''اُلٹا'' لکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ آگے ہے، ''لگتا ہے کہ شاعر اس مقام پر ہے'' اس میں لگتا ہے کہ بعد ''کہ'' کی ضرورت نہیں تھی۔ آگے ہے ''جھنجھٹ کا محتاج نہیں ہے'' اس میں لفظ ''ہے'' زائد ہے۔ آگے ہے ''اب اسے سیدھے سچے کھرے لہجہ میں،'' اس میں ''سیدھے سچے'' کے بعد ''کھرے'' لکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ آگے ہے ''انقلابی شاعری یا کسی بھی قسم کی مقصدی شاعری'' اس میں ''کسی بھی قسم کی'' زائد ہے۔ آگے ہے ''مگر یہ اقبال کی قدرتِ بیان کا اعجاز ہے'' میں قدرتِ بیان کی بجائے قدرتِ بیاں صحیح ہوتا کیونکہ اضافت کے بعد کسی لفظ کے آخر میں ''نون'' آئے تو وہ ''نون غنہ'' میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ آگے ''زورِ بیان'' آیا ہے جس کی جگہ بھی زورِ بیاں ہی آنا چاہیے تھا۔ آگے ہے ''دس کی بارودی صنعت کے واسطے سے'' میں ''واسطے سے'' کی بجائے ''نسبت سے'' ہونا بہتر تھا۔ آگے ہے ''پتھر کو جونک تو پھر بھی نہیں لگی'' اس میں نہیں لگی کی بجائے ''نہ لگی'' ہونا چاہیے تھا اور ''نہیں'' اور ''نہ'' استعمال کرنے میں دونوں کے فرق کو ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے۔ آگے ہے

''سنگسار کرنے والے ہاتھوں میں پتھر لیے اسی طرح مستعد ہیں'' اس میں ''ہاتھوں میں پتھر لیے'' زائد ہے۔ آگے ہے ''فتو لوہار تک سب کو پتہ چل گیا ہے'' میں ''پتہ چل گیا ہے'' کی بجائے ''معلوم ہوگیا ہے'' زیادہ بہتر ہوتا۔ آگے ہے ''تو اب مجھ ایسے شاعری کے قارئین مشکل میں ہیں'' یہاں قارئین کا لفظ صحیح نہیں ہے کیونکہ قاری کا مطلب ہے قرأت کرنے والا یعنی جس کی قرأت سننے والا بھی موجود ہو۔ چنانچہ قارئین کی بجائے یہاں ناظرین ہونا چاہیے تھا جیسے کہ قرآن مجید دو طریقوں سے پڑھا جاتا ہے، قرأت سے، یعنی قاری کسی کو سنا کر پڑھ رہا ہو یا ناظرہ جو دل میں پڑھا جاتا ہے اور کسی دوسرے کو سنانا مقصود نہیں ہوتا۔ لہٰذا کتاب یا اخبار کے پڑھنے والے کے لیے ناظر کا لفظ استعمال ہوگا، البتہ مشاعرے میں پڑھنے والے شاعر کے لیے قاری کا لفظ ہی استعمال ہوگا۔ آگے ہے ''مگر جب امریکی سامراج کا راگ چھڑتا ہے تو میں گڑبڑا جاتا ہوں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ...'' یہاں ''میں'' کا لفظ فالتو ہے۔ آگے ہے ''یہی میں انہی انقلابی بیبیوں سے کہتا ہوں'' اس جملے میں جب لفظ یہی آ گیا ہے تو ''انہی'' کے بجائے ''ان'' آنا چاہیے تھا۔ دو دفعہ ہی کا آنا غلط ہوگا۔ آگے ہے ''کہ جیسے مظلوم و مقہور عورت کے حق میں تمہاری آواز الگ اپنی شناخت رکھتی ہے'' یہاں الگ کے بعد ''اپنی'' زائد ہے۔ آگے ہے ''تو آمدم برسرِ مطلب'' اس میں لفظ ''تو'' کی ضرورت نہیں تھی، وغیرہ وغیرہ۔

زبان اور اس کے استعمال کے حوالے سے جس رکھ رکھاؤ، فصاحت اور ایجاز کی توقع اہلِ زبان حضرات سے کی جاتی ہے وہ اگر کسی تحریر میں دستیاب نہیں ہوتی تو ہم پنجابی ڈھگوں کا پریشانی میں مبتلا ہوجانا آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے، بے شک، ہم اس کے جج بھی نہیں ہوسکتے، لیکن جنہیں پڑھ پڑھ کر ہم نے اردو لکھنا سیکھی ہے، اگر وہ غلطی یا لاپروائی کے مرتکب ہوں گے تو یہ اغلاط یا ناہمواریاں آگے بھی سفر کریں گی۔ میں انتظار حسین کے مداحوں میں شامل ہوں جب کہ ''دنیازاد'' کو بھیجا جانے والا ''انتظار حسین کی نثر'' کے عنوان سے میرا توصیفی مضمون ایک عرصے سے اشاعت کا منتظر ہے۔ تاہم انتظار حسین کی زبان کے حوالے سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ابھی ان کی عمر ہی کیا ہے، جہاں انہوں نے اور بہت کچھ سیکھا ہے رفتہ رفتہ اردو بھی سیکھ ہی جائیں گے کہ یہ ویسے بھی کم بخت آتے آتے ہی آتی ہے۔ صرف اس زبان کے ساتھ محبت لازمی شرط ہے اور جس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ موصوف مجسم اردو ہوکر رہ گئے ہیں۔ مثلاً گفتگو میں ان سے انگریزی کا کوئی لفظ کسی نے آج تک نہیں سنا، حتیٰ کہ ''ڈان'' میں ہفتہ وار کالم بھی اردو ہی میں بھیجتے

ہیں جو وہاں انگریزی میں ترجمہ ہونے کے بعد زیورِ طبع سے آراستہ ہوتا ہے۔ ہمیں اس پر ہرگز اعتراض نہیں ہے کہ آپ اردو میں لکھ کر انگریزی زبان کے کالم نویس کیوں کہلاتے ہیں، تاہم ہماری پریشانی یہ ضرور ہے کہ مترجم کے لیے انتظار صاحب کی طرف سے جا بجا استعمال ہونے والے محاوروں کا ترجمہ وہ بدنصیب کیونکر کرتا ہوگا مثلاً 'ماروں گھٹنا، پھوٹے آنکھ' کا انگریزی ترجمہ کرتے ہوئے اس پر کیا گزرتی ہوگی۔ اس لیے کالم کے آخر پر مترجم کا نام بھی آنا چاہیے۔

اردو کے ساتھ ان کی محبت کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ 'کافکا' نے Metamorphosis کے عنوان سے کہانی لکھی جس کا ہیرو سو کر اٹھا تو ایک کیڑے میں تبدیل ہو چکا تھا جب کہ انتظار صاحب نے نہ صرف اس کہانی کے عنوان کا سلیس ترجمہ ''کایا کلپ'' کے عنوان سے کیا بلکہ ان کی کہانی میں ہیرو سو کر اٹھتا ہے تو مکھی میں تبدیل ہو چکا ہوتا ہے۔ فرانز کافکا ۱۸۸۳ء میں پیدا ہو کر ۱۹۲۴ء میں انتقال کر گیا تھا۔ اب یا تو انتظار صاحب نے اس طرح کافکا کی زمین میں غزل کہہ ڈالی ہے کیونکہ آپ اگر فکشن رائٹر ہونے کے ساتھ ساتھ شاعری پر بھی بے دھڑک تنقید لکھتے ہیں تو شاعری کرتے بھی ہوں گے یا پھر کافکا کو توارد ہو گیا ہوگا کیونکہ سائنس اتنی ترقی کر گئی ہے کہ وقت سے پہلے بھی توارد کا امکان رد نہیں کیا جا سکتا کہ کہانی انتظار حسین نے بعد میں لکھی ہو اور اس کا توارد کافکا کو پہلے ہو گیا ہو!

جہاں تک میری طرف سے شمس الرحمٰن فاروقی کی تعریف ہضم کرنے کا سوال ہے تو میں اس کا فی الحال جواب نہیں دینا چاہتا تھا کیونکہ یہی بات وہ مختلف مقامات پر چار پانچ مرتبہ پہلے بھی کہہ چکے ہیں اور اب انہوں نے اسے تحریری شکل بھی دے دی ہے تا کہ سند رہے اور بے شک ان کے کام کبھی نہ آئے۔ چنانچہ امید کرنی چاہیے کہ وہ آئندہ بھی حسبِ توفیق یہ بات متعدد بار مزے لے کر بیان کریں گے۔ اس لیے میں اس انتظار میں ہوں کہ کب وہ یہ بات آخری بار ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں تا کہ میں اس کے جواب میں کچھ عرض کروں حالانکہ میں ''دنیا زاد'' ہی کے ایک گزشتہ شمارے میں ''چھوٹے بڑے کی بے سود بحث'' کے عنوان سے لکھے گئے مضمون میں لوگوں کے ایسے خدشات دور کرنے کی کوشش کر چکا ہوں اور جس کا ایک ہی مطلب ہے کہ اس سے میرا تو وہ تعریف ہضم کر جانا ثابت نہیں ہوتا۔ البتہ یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ انتظار صاحب کو وہ تعریف ہرگز ہضم نہیں ہو پائی ہے جس کا بار بار اعلان کرتے وہ تھکتے ہی نہیں ہیں۔ لہٰذا اپنے ہاضمے کی کمزوری کے لیے کسی کارگر پھکی کا اہتمام صاحبِ موصوف کو خود کرنا چاہیے کہ اس عمر میں قویٰ ویسے بھی جواب دینے لگ جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے اردو افسانے کا احوال بیان کرتے ہوئے اسی جریدے میں لکھا

تھا کہ انتظار حسین کی کتاب ''نئی پرانی کہانیاں'' اساطیری کہانیوں کے مختلف ٹکڑوں پر مشتمل ہے جس پر موصوف نے مرتب کی بجائے بطور مصنف اپنا نام چھپوانا مناسب سمجھا ہے جس پر مسعود اشعر نے یہ فقرہ چست کیا تھا کہ آپ نے تو انتظار حسین کو لاجواب کر دیا، حالانکہ میرا مقصد انہیں لاجواب کرنا نہیں تھا اور جہاں تک فاروقی کا مجھے غالب سے بڑا شاعر قرار دینے کا تعلق ہے تو بات فاروقی نے کہی ہے اور آپ پانی پی پی کر کوس مجھے رہے ہیں، یعنی ؎

لیا ہے غیر نے بوسہ، اُسی کو گالی دو
خفا ہو مجھ سے، نہ لینے میں میں نہ دینے میں

منشا یاد

کاش میں بن کی چڑیا ہوتی

اردو کی ممتاز افسانہ نگار اختر جمال کا آٹوا (کینیڈا) میں ۹ فروری ۲۰۱۱ کو انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر اسی برس تھی اور وہ فکشن کی بہت سی کتابوں کی مصنفہ تھیں۔ جن میں انگلیاں فگار اپنی، زرد پتوں کا بن، سمجھوتہ ایکسپریس، خلائی دور کی محبت، پھول اور بارود (ناول) وغیرہ شامل تھیں۔ انہوں نے بہت سے تنقیدی اور علمی مضامین بھی لکھے۔ وہ ایک عرصہ سے اسلام آباد چھوڑ کر اپنے بیٹے طارق احسن کے پاس کینیڈا چلی گئی تھیں۔ کچھ عرصہ سے بیمار رہنے لگی تھیں۔ وہیں ایک ہسپتال میں ان کا انتقال ہوگیا۔

محترمہ اختر جمال کے انتقال کی خبر سننے سے پہلے میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ یہ سات فروری ۲۰۱۱ کی بات ہے کہ مجھے بیٹھے بٹھائے اچانک خیال آیا کہ جس طرح پروین شاکر اچانک چلی گئی تھیں، کہیں میں یا دوسرے ساتھیوں میں سے بھی کوئی اچانک نہ چلا جائے، اس لیے مجھے چاہیے کہ قریبی احباب کے بارے میں اپنی یادداشتیں محفوظ کرنے کا باقی کام بھی جلد مکمل کرلوں (میرے مضامین کی دو کتابیں زیرِ اشاعت ہیں) اور میرے پاس ٹی وی پروگراموں یا جلسوں کی جو وڈیوز پڑی ہیں ان میں سے جو بہتر حالت میں اور ضروری ہیں، انہیں یوٹیوب پر اپ لوڈ کر کے ان کے لنکس اپنی ویب سائٹ اور فیس بک پر دے دوں تا کہ وہ محفوظ ہو جائیں۔ میں نے اس سلسلے میں سب سے پہلے جس وڈیو کا انتخاب کیا وہ اختر جمال کی کتاب ''سمجھوتہ ایکسپریس'' کے بارے میں ایک ٹی وی پروگرام کی تھی جس کی میزبانی پروین شاکر نے کی اور تبصرہ کرنے والوں میں ڈاکٹر جمیل جالبی اور میں شامل تھے۔ اس میں انہوں نے کتاب میں شامل افسانے 'تابعدار ملازم' کا کچھ حصہ بھی پڑھ کر سنایا تھا۔

اگلے روز کینیڈا سے معروف افسانہ نگار شکیلہ رفیق کی ای میل آگئی جس میں انہوں نے

وڈیوکلپ کی پسندیدگی کے علاوہ یہ اطلاع بھی دی کہ وہ اس کے بارے میں اختر جمال کو بتانا چاہتی تھیں مگران کے فون سے جواب نہیں مل رہا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ فیملی سے الگ آٹوا کے ایک اولڈ ایج ہوم میں اکیلی رہتی ہیں اور کبھی کبھی زیادہ بیمار ہوجاتی ہیں۔انہیں ڈر ہے کہ کہیں پھر بیمار نہ پڑگئی ہوں ورنہ وہ ان سے اکثر بات کرتی رہتی ہیں۔انہوں نے مجھے اختر جمال کا فون نمبر بھی بھیج دیا مگرفون کرنے کا کچھ فائدہ نہ تھا۔ میں نے شکیلہ رفیق سے استدعا کی وہ اختر جمال صاحبہ کے بارے میں معلومات حاصل کر کے جلد اطلاع دیں۔اس روزایک تقریب میں میری ملاقات کینیڈا سے آئے ہوئے ممتاز شاعر اشفاق حسین سے بھی ہوئی۔ میں نے انہیں اپنی تشویش سے آگاہ کیا اور ہم اختر جمال کے حالات کے بارے میں باتیں کرتے رہے بلکہ میں نے اس کا ذکر اجلاس میں بھی کرڈالا۔

رات کو میں نے اپنی بیگم کوان کے حالات کے بارے میں بتایااورپھر ویب سائٹ پر لگی وہ کلپنگ دکھائی جس میں وہ افسانہ پڑھ رہی تھیں تووہ کہنے لگیں ہائے سب لوگ کتنے اسمارٹ اورنوجوان لگ رہے ہیں اوراختر جمال توبہت ہی باوقار دکھائی دے رہی ہیں۔ یہ کوئی پچیس تیس برس پہلے کی وڈیوتھی ظاہر ہے اس میں ہم سب ہی کم عمرنظر آرہے تھے۔پروین نے توخیر بڑھاپادیکھاہی نہیں تھا،وہ اس سے پہلے ہی چلی گئیں اوراب چاہنے والوں کے لیے ہمیشہ اسی طرح جوان رہیں گی۔ ان دنوں میرے زیرِ مطالعہ بیگم منیرہ احمد شمیم کی کتاب تھی جس پر مجھے اگلے روز اظہارِ خیال کرنا تھا۔یہ پرانی وڈیودیکھ کر مجھے احمد شمیم کی نظم یادآرہی تھی ۔آپ نے بھی نیرہ نور کی آواز میں سنی ہوگی۔ وہی نظم جس کی ابتداان لائنوں سے ہوتی ہے:

کبھی ہم خوب صورت تھے
کتابوں میں بسی خوشبو کی صورت
سانس ساکن تھی!
بہت سے ان کہے لفظوں سے تصویریں بناتے تھے
پرندوں کے پروں پہ نظم لکھ کر
دور کی جھیلوں میں بسنے والے لوگوں کو سناتے تھے
جوہم سے دور تھے!
لیکن ہمارے پاس رہتے تھے۔

اسی رات شکیلہ رفیق کا فون آ گیا کہ اختر جمال ہسپتال میں ہیں اور میں پریشان ہوں۔ کچھ دیر وہ ان کے احساسِ تنہائی اور گرتی ہوئی صحت کے بارے میں بتاتی رہیں جس سے میں بھی اداس اور پریشان ہو گیا۔ مجھے وہ زمانہ یاد آیا جب اسلام آباد کے سارے ادبی راستے اختر جمال کے گھر کو جاتے تھے۔ ان کا سرکاری گھر سپر مارکیٹ کے قریب ایف سکس تھری میں تھا اور ادبی سرگرمیوں کا مرکز۔ دونوں میاں بیوی اسلام آباد کی ادبی برادری، سلسلہ، رابطہ اور حلقہ کے فعال رکن تھے۔ بلکہ حلقہ اربابِ ذوق اسلام آباد کے پہلے اجلاس کی صدارت اختر جمال نے کی تھی اور وہ بعد میں بھی اس کے جلسوں میں افسانے اور مضامین پڑھتی رہیں۔

محترمہ اختر جمال عمر اور لکھنے میں مجھ سے سینئر تھیں مگر کبھی احساس نہ ہونے دیا۔ وہ میری بیوی کی بہت اچھی دوست اور کالج میں میری بیٹی کی شفیق استاد تھیں۔ ہم اکٹھے مری اور راولپنڈی کی محفلوں میں افسانے پڑھتے رہے۔ انہوں نے میرے افسانوں پر مضمون لکھے اور ہم ایک دوسرے کی فیملی تقریبات میں شرکت کرتے رہے۔

مجھے یاد آیا کہ جب ہندوستان میں ان کی والدہ سخت بیمار تھیں تو اختر جمال کو وہاں کا ویزا نہیں ملا تھا۔ اس دکھ کو انہوں نے ایک افسانے میں اس طرح بیان کیا تھا کہ میں دونوں ملکوں کی سرحد پر کھڑی ان چڑیوں کو رشک سے دیکھتی ہوں جو پاکستان کی حدود سے اڑ کر کسی پابندی کے بغیر ہندوستان کی سرحد میں داخل ہو جاتی ہیں۔ ہندوستان جہاں آخری سانس لیتے ہوئے میری ماں کی نگاہیں میری منتظر ہیں۔ کاش میں ایک چڑیا ہوتی۔ کاش سیاست کے سینے میں ماں کا دل ہوتا۔ مجھے یاد ہے حلقے میں یہ افسانہ پڑھتے ہوئے بھی وہ آبدیدہ ہو گئی تھیں اور سارا ماحول سوگوار۔

ایک زمانے میں احسن علی خان کے شعری مجموعے ''میں سوچتا ہوں میں محسوس کرتا ہوں'' کی بھی ادبی حلقوں میں دھوم مچی ہوئی تھی۔ ان کی مادری زبان اردو تھی لیکن وہ پنجابی صوفیانہ شاعری بڑے اہتمام سے پڑھتے اور سمجھنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ وہ وزارتِ خارجہ میں ڈائریکٹر تھے۔ دونوں میاں بیوی بہت روشن خیال اور خوش مزاج تھے۔ وہ طالب علمی کے زمانے میں تحریکِ پاکستان میں حصہ لیتے رہے تھے۔ بلکہ اختر جمال بھوپال میں پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن کی مقامی شاخ سے وابستہ تھیں اور احسن علی خاں اس کے سکرٹری تھے۔ جان نثار اختر اس کے صدر تھے جن کی بیگم صفیہ اختر جو اسرار الحق مجاز کی ہمشیرہ تھیں اور اختر جمال کی کالج ٹیچر تھیں۔ اب بھی اختر جمال اور احسن علی خاں کے پاکستان کے ترقی پسند حلقوں اور اہلِ علم و ادب سے رابطے تھے۔ اسلام آباد

میں حاجرہ مسرور(جن کی بیٹی نوشین بعد میں ان کی بہو بنی) سے میری پہلی ملاقات انہی کے ہاں ہوئی تھی ۔ جمیلہ ہاشمی بھی انہی کے ہاں ٹھہرتی تھیں۔عصمت چغتائی اسلام آباد آئیں توان ہی کے ہاں ٹھہری تھیں۔وہی میری خواہش پرانہیں حلقہ میں لے کرآئی تھیں۔محمد طفیل (نقوش) اسلام آباد آتے توانہی کے ہاں قیام کرتے ۔وہ اس روز بھی وہیں مقیم تھے جب ان کا اچانک انتقال ہوگیاتھا۔مجھے یاد ہے اختر جمال نے مجھے فون کرکے بتایاتھا کہ طفیل بھائی جاگ نہیں رہے ہیں ،ہم نے ڈاکٹر کوبلوایاہے آپ بھی جلدی سے آجایئے،ہمیں بے حد ڈر لگ رہاہے۔میرے وہاں پہنچنے تک ڈاکٹر نے ان کے انتقال کی تصدیق کردی تھی ۔مجھے یادآیااس مختصر،خوش حال اور ہرکسی پر محبتیں نثار کرنے والے خاندان پردکھ کاکیساپہاڑٹوٹ پڑاتھاجب ان کی بہت پیاری اور کسی تتلی کی طرح نرم ونازک سی بیٹی تزئین معمولی سی بیماری کی تاب نہ لاکراچانک انتقال کرگئی تھی۔وہ میری بیٹی کی کلاس فیلواوردوست تھی۔

اختر جمال کی رحلت کی خبرسن کرمجھے مری لٹریری سرکل کے زیرِ اہتمام منائی جانے والی وہ شامِ افسانہ یادآئی جس میں شرکت کے لیے میرے علاوہ اختر جمال ،رخسانہ صولت اور کچھ دیگر افسانہ نگار دوست مری پہنچناچاہتے تھے مگرگرمیوں اور خصوصاً ویک اینڈ پرہل اسٹیشن مری جانے والوں کابہت رش ہوجاتاہے ہمیں سواری نہیں مل رہی تھی ۔ہرپندرہ بیس منٹ بعدایک خالی ویگن یافلائنگ کوچ آجاتی مگردیکھتے ہی دیکھتے بھرجاتی اورہم کھڑے منہ دیکھتے رہ جاتے۔یہ صورتِ حال دیکھ کرمیں نے جوکیایہ انہی کی زبانی سن لیجیے:''منشا یاد کا ایک دلچسپ رُخ اُس وقت سامنے آیا ،جب ان کے ساتھ مری کی'' شامِ افسانہ'' میں جانے کا اتفاق ہوا۔منشا یاد نے ہم سب کوایک جگہ سائے دار درخت کے نیچے کھڑا کرکے کہا کہ وہ ویگن میں سیٹوں کا انتظام کرتے ہیں۔ جب ویگن میں سیٹیں کسی طرح نہ ملیں تومنشا یاد نے تجویز پیش کی کہ ہم پوری ویگن کرائے پر لے لیتے ہیں اور جتنی سیٹیں خالی ہوں گی اتنی سواریاں ہم خود بٹھائیں گے،سات توہم لوگ تھے۔ غالباً چند ہی سیٹیں خالی تھیں،منشا یاد نے ویگن کے دروازے پرکھڑے ہوکرانتہائی پیشہ ورانہ انداز میں صدادی'' مری مری'' اور ذراسی دیرمیں سیٹیں پُر ہوگئیں اور ویگن چل پڑی۔ انہوں نے کنڈیکٹر کا کام اتنی خوبی سے کیا کہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ حلقہ اربابِ ذوق کے سیکرٹری اور ایک مشہور افسانہ نگار ہیں''

دس فروری کی صبح کشورناہید کافون آگیا کہ افتخارعارف نے بتایاہے کل تم اختر جمال کوبہت یادکررہے تھے، ان کاانتقال ہوگیاہے۔کمپیوٹرکھولا توشکیلہ رفیق کی نہایت مختصری ای میل تھی ۔''

اختر جمال چلی گئیں، میں صدمے میں ہوں''۔ پھر یہی خبر کینیڈا سے ولی عالم شاہین نے ای میل کے ذریعے دی۔ میں نے طارق سے ای میل کے ذریعے اظہار تعزیت کیا اور ۱۱ فروری کے حلقہ ارباب ذوق اسلام آباد کے اجلاس میں اختر عثمان اور میں نے اختر جمال کے بارے میں گفتگو کی۔ اس موقع پر ایک قراردادِ تعزیت پیش کی گئی۔ اراکینِ حلقہ نے اختر جمال کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار اور ان کی ادبی خدمات پر خراج عقیدت پیش کیا۔

معروف ترقی پسند دانشور اشفاق سلیم مرزا نے بھی یکم مارچ ۲۰۱۱ کی شام سفما (South Asian Free Media Association) میڈیا سنٹر میں ایک تعزیتی ریفرنس منعقد کیا جس میں میرے علاوہ طارق رحمٰن، عائشہ صدیقہ اور آغا ناصر نے اختر جمال کی شخصیت اور فن پر گفتگو کی۔ ڈاکٹر طارق رحمٰن اختر جمال کے بیٹے طارق احسن کے دوست اور ساتھی ہیں اور انہوں نے اختر جمال کے بہت سے افسانوں کو انگلش میں ترجمہ کیا ہے۔

اختر جمال ۲۲ مئی ۱۹۳۰ کو بھوپال میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم بھوپال اور ناگ پور حاصل کی پاکستان بننے کے بعد بی اے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے اور ایم اے پشاور یونیورسٹی سے کیا۔ کیونکہ ان کے میاں احسن علی خاں کی پوسٹنگ کاکول، گجرات (پاکستان) اور راولپنڈی میں بھی ہوتی رہی۔ اس طرح وہ ایبٹ آباد، گجرات، راولپنڈی اور اسلام آباد میں پڑھاتی رہیں۔ فیڈرل گورنمنٹ کالج ایف سیون ٹو اسلام آباد میں زیادہ وقت گزارا۔ میں نے اسی زمانے میں ان کے ایک افسانے کی ڈرامائی تشکیل کی جو انہی کے کالج میں ریکارڈ ہوئی اور وہ بہت مقبول ہوا (یہ میری ویب سائٹ پر دیکھا جا سکتا ہے)۔

اختر جمال اور احسن علی خاں دونوں میاں بیوی ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد آئی نائن ون میں اپنے ذاتی مکان میں شفٹ ہو گئے تھے۔ لیکن احسن علی خان کے انتقال کے بعد وہ اکیلی رہ گئی تھیں۔ کچھ عرصہ بعد آئی نائن والا گھر کرایہ پر دے کر وہ بیٹے کے پاس کینیڈا چلی گئیں۔ مگر بالآخر انہیں وہ گھر فروخت کرنا پڑا۔ اس طرح ان کا ایک طرح سے پاکستان سے تعلق ٹوٹ گیا تھا۔ وہ پاکستان جس کے قیام کے لیے ان دونوں میاں بیوی نے تحریک میں حصہ لیا اور آبائی وطن چھوڑا تھا۔ اگرچہ پاکستان انہیں راس نہیں آیا تھا اور ضیاء الحق کے مارشل لاء میں ان کے بیٹے کی گرفتاری اور قید وبند کے حوالے سے سچ مچ ان کے لیے ''زرد پتوں کا بن'' بن گیا تھا لیکن وہ اپنے عزیز واقارب کے پاس واپس میرٹھ (بھارت) نہیں گئیں۔ بیٹے کے پاس جانا ان کی مجبوری تھی

۔اوراب وہ ایک تیسرے راستے پر روانہ ہوگئی ہیں جہاں کسی پاسپورٹ کی ضرورت ہے نہ ویزے کی۔احمد شمیم پھر یادآئے:

ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو
کہ ہم کوتتلیوں کے،جگنوؤں کے دیس جانا ہے
ہمیں رنگوں کے جگنو روشنی کی تتلیاں آواز دیتی ہیں
نئے دن کی مسافت رنگ میں ڈوبی ہوا کے ساتھ
کھڑکی سے بلاتی ہے
ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو

(۲)

اختر جمال کے افسانوں کے موضوعات دوطرح کے ہیں۔ایک تو وہی جوتحریک پاکستان ،آزادی کے حصول میں طلبہ کی جدوجہد اور ہجرت کے مسائل کے گرد گھومتے ہیں اوردوسرے نہایت جدید زمانے کے سماجی مسائل سے متعلق۔اول الذکر موضوعات بھی اکہرے اور سادہ نہیں ہیں ان میں خاصا پھیلاؤ اور تنوع ہے ۔ وہ دونوں اطراف کے لوگوں کوروزگاراور رہائش کے معاملات اورتقسیم شدہ کنبوں کوویزوں ،پاسپورٹوں اوراجازت ناموں کی پیش آنے والی دشوریاں کااحوال بیان کرتی ہیں۔ مثلاًان کے مجموعہ ''انگلیاں فگاراپنی''(مطبوعہ ۱۹۷۱)میں اکیس کہانیاں ہیں جن میں اکیس اقسام ہی کے مسائل اورمعاملات ہیں۔اس میں شامل ''مسٹر پاکستان'' ان کاایک معروف افسانہ ہے۔یہ ایک ایسے شخص کے بارے میں ہے جوآزادی سے پہلے ایک سبز جھنڈاہاتھ میں لیے ہر جلسے اور جلوس میں نظر آتا تھا اورگلا پھاڑ پھاڑ کرنہایت بلند آواز میں ''لے کے رہیں گے پاکستان'' اور''قائدِ اعظم زندہ باد'' کے نعرے لگایا کرتا تھا۔وہ کسی مل میں کام کرتا تھااور حالانکہ وہ مسلم لیگ کاممبر بھی نہیں تھامگروہ پاکستان اورقائدِ اعظم سے بے حدمحبت کرتا تھا۔ پاکستان اس کاخواب تھااوراس کاخیال تھاکہ پاکستان بننے کے بعداسے ایک چھوٹاساصاف ستھراگھر،تن ڈھانکنے کوکپڑا،پیٹ بھرکھانا اور روزگارمل جائے گا۔وہاں اسلامی اصولوں پرحکومت ہوگی ۔ جوا،شراب اورچوری سب گناہ ختم ہوجائیں گے ۔افسانے کاراوی اس کی پاکستان سے محبت کے پیشِ نظراسے مسٹر پاکستان کے نام سے پکارتا تھا۔مگر پاکستان آکر اسے روزگارملانہ گھراور جوان بہن

اغوا ہو کر ہیرامنڈی پہنچ گئی ، بچے پیٹ بھر دودھ اور غذا نہ ملنے سے بیمار رہ کر فوت ہو گئے اور وہ خود خون تھوکتا ہوا سرِ راہ گر کر مر گیا۔لوگ جمع ہو گئے۔لوگ اسے بھکاری یا مزدور سمجھ رہے تھے۔راوی کا جی چاہا پکار پکار کر کہے:

''یہ بھکاری نہیں ہے۔پناہ گیر نہیں ہے،مزدور نہیں ہے۔یہ تو مسٹر پاکستان ہے''

اس مجموعہ میں انہوں نے اپنے ادبی سفر کے بارے میں بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے کہ کس طرح ان کے والدین کو بھی لکھنے کا شوق تھا۔ والدہ کی کہانیاں اس زمانے کے اچھے رسائل میں شائع ہوتی تھیں اور والد زمانہ طالب علمی میں علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔کیسے ان کے ہاں ہر ماہ مشاعرہ ہوتا تھا اور مہمان شعرا اکثر قیام کرتے تھے۔کیسے وہ بچوں کا قلمی رسالہ نکالتی تھیں اور آٹھویں جماعت میں ان کی پہلی کہانی انصاری ویکلی دہلی میں شائع ہوگئی تھی۔ اس کے بعد قوم ،مشہور،نگارخانہ ،عصمت اور شمع جیسے رسالوں میں کہانیاں لکھیں۔ایک بار رسالہ 'مشہور' میں ان کی کہانی پر ایڈیٹر نے نوٹ لگایا

''آنسہ اختر جمال کے افسانوں میں واقعیت کے ساتھ ساتھ رجائیت بھی پائی جاتی ہے''

وہ ان الفاظ کا مطلب پوری طرح نہ سمجھ سکیں اور اپنے تائے زاد بھائی سے جو علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے پوچھ بیٹھیں کہ بھائی جان یہ واقعیت اور رجائیت کیا ہوتی ہے جو میری کہانیوں میں پائی جاتی ہے۔وہ خوب ہنسے اور ایک لطیفہ ان کے ہاتھ آ گیا۔لیکن حقیقت یہی ہے کہ اب بھی ان کی زیادہ تر کہانیوں میں واقعیت اور رجائیت پائی جاتی ہے۔

''انگلیاں فگار اپنی'' مجموعے میں شامل اسی عنوان کا افسانہ پاکستان میں مہاجر کنبوں کی مشکلات اور ابتری کی بجائے پیچھے بھارت میں رہ جانے والے تقسیم شدہ کنبے کی کہانی ہے ۔ واحد متکلم یا راوی وہ خود ہیں اور چودہ دن کا ویزہ لے کر بھوپال گئی ہیں۔مگر یہ وہ زمانہ تھا جب احمد آباد گجرات میں فسادات کی آگ بھڑک رہی تھی اور سارے ملک میں تناؤ کی کیفیت تھی۔رات کو جن سنگھیوں کے حملے کا ڈر رہتا۔ مصنفہ کی بچی ہر طرف فسادات کی باتیں سن کر گھبرا جاتی ہے اور جلد از جلد پاکستان لوٹ جانا چاہتی ہے۔وہ اپنی دوست آسیہ سے ملنے جاتی ہیں جس کا منگیتر ظفر پاکستان چلا گیا اور وہاں اس نے شادی کر لی اور آسیہ اب انگوٹھی کا نشان لے کر ہی زندگی گزار رہی ہے لیکن اسے اپنی چھوٹی بہنوں کی فکر ہے۔ان میں سے ایک کو ہندو وکیل لڑکا پسند کرتا ہے مگر وہ فی الحال مان نہیں رہی۔لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نظر نہیں آتا۔یہ کنبہ بڑی عسرت اور مشکل کی

زندگی گزار رہا ہے ۔ گھر کے سربراہ کا انتقال ہو چکا ہے اکلوتا اور بڑا بیٹا صغیر پاکستان چلا گیا تھا کہ ملازمت مل جائے گی تو ماں اور بہنوں کو بھی بلا لے گا مگر جب اس نے اپنے لیے مقام بنایا تو وہ اتنا بلند اور دور تھا کہ ماں اور بہنوں کے لیے وہاں پہنچنا ایسا ہو گیا جیسے چاند پر پہنچنا۔ شروع میں خطوط اور پیسے بھی آتے تھے پھر جنگ کے بعد وہ بھی بند ہو گئے ۔ وہاں راوی کی ملاقات ایک مہاجر ہندو بڑے میاں سے بھی ہوتی ہے جنہیں سندھ بہت یاد آتا ہے اور وہ جذباتی ہو جاتے ہیں کیوں کہ یہ مٹی کا رشتہ ہے۔ انہیں ہندو ہونے کے باوجود شہباز قلندر کی درگاہ پر حاضری کی بڑی خواہش ہے۔

تقسیم کے موضوعات کے علاوہ اختر جمال کے دوسری قسم کے موضوعات جدید زمانے کی ایجادات اور معاملات سے متعلق ہیں جن میں ان کا تخیل خوب اڑانیں بھرتا ہے۔ جیسے ''امن کی تختی'' جس میں انسان کے چاند پر پہنچنے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ انہوں نے کئی سوالات اٹھائے اور کئی پہلو سجھائے ہیں۔ ایک تو یہ کہ چاند پر بڑا سکون ہے لیکن ڈر یہ ہے کہ ایسا نہ ہو کہ بقول برناڈ شا ''جب یہ کوئی نئی جگہ دریافت کرتے ہیں تو پہلے پادری بھیجتے ہیں اور اس کے پیچھے پیچھے سپاہی''۔ اس کا دوسرا پہلو بچی کا وہ سوال ہے کہ امی کیا بمبئی چاند سے بھی دور ہے کہ انسان چاند پر جا سکتا ہے لیکن ہم اپنی نانی اور دادی سے ملنے ممبئی نہیں جا سکتے۔ جواب میں وہ کہتی ہیں کہ یہ میری بچی کا ہی سوال نہیں کشمیر، فلسطین، ویت نام اور برلن کی ہر ننھی بچی کا سوال ہے اور آخر میں وہ چاند پر جانے والے اولین خلانوردوں سے سوال کرتی ہیں کہ یہ امن کی تختی زمین پر بھی کہیں نصب ہے یا اسے بالکل ہی زمین سے اکھاڑ لائے ہو؟

ان کے افسانوں کا مجموعہ سمجھوتہ ایکسپریس ۱۹۸۹ میں شائع ہوا تو اس کی ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی ہوئی۔ یہ ان کی پہلی کتابوں ''زرد پتوں کا بن'' اور ''انگلیاں فگار اپنی'' ہی کے تسلسل میں ایک کتاب تھی لیکن کچھ موضوعات خاصے نئے اور مختلف بھی تھے اور ٹریٹ منٹ میں بھی فرق آیا۔ اس میں کل تیرہ کہانیاں ہیں جن میں سے چھے کہانیاں سمجھوتہ ایکسپریس، وہ جو شریک سفر تھے، بھو پوشیما، چکن کا کرتا، اصیل مرغ اور تابعدار ملازم کم و بیش انھی موضوعات کے گرد گھومتی ہیں جو اس سے پہلے ''انگلیاں فگار اپنی'' اور زرد پتوں کا بن میں پیش کئے گئے ہیں یعنی تحریک پاکستان میں نوجوانوں کی جدوجہد، ہجرت کے وقت خاندانوں کی تقسیم اور مہاجرت سے پیدا ہونے والے المیے۔ اس نئے مجموعہ میں 'چکن کا کرتہ'' خاص طور پر قابل ذکر افسانہ ہے جس میں ہندوستان میں ایک بہن اپنے پاکستان چلے جانے والے بھائی کو چکن کے کاڑھے ہوئے کرتے بھجواتی رہتی ہے

مگر وہ چوں کہ حالات سے مجبور ہو کر ایک ہندو سیٹھ کی داشتہ بن چکی ہے اس لیے بھائی خط کا جواب اور کرتوں کی رسید بھی نہیں دیتا۔ آخر میں پتہ چلتا ہے کہ اسے مرے ہوئے دس سال ہو گئے ہیں مگر اس کی بیوہ سارے کرتے سنبھال کر رکھتی ہے کہ اس کا بیٹا جوان ہو گا تو پھوپی کے بھیجے ہوئے کرتے پہنے گا اور ایک دن اس سے ملنے بھی ضرور جائے گا۔ وہ اپنے مرحوم شوہر کی بہن کو اس کے مرنے کی اطلاع دینا نہیں چاہتی کہ وہ اس کے تصور میں زندہ رہے۔ وہ یہ بھی بتاتی ہے کہ وہ بھی سندھی کڑھت کے کرتے کاڑھتی ہے۔

''فن کار'' اور'' چیونٹی اور راج ہنس'' دونوں فلسفیانہ کہانیاں ہیں اور سماجی حقیقت نگاری سے ہٹ کر ان میں تھوڑا تجرید اور علامت کا بھی استعمال دیکھا جاسکتا ہے۔ مثلاً چیونٹی ایک حقیر مخلوق ہے اور راج ہنس آسمانوں پر اڑتا ہے لیکن جو فلسفہ وہ بیان کرتی ہے روح، مادے اور فنا کا وہ بڑی خوب صورتی سے آیا ہے۔ اسی طرح وہ جو کیڑا ہے جو ریشم بناتا ہے اور دوسرے اسے حقیر سمجھتے ہیں وہ وجود کا فلسفہ ہے جو انسانی عظمت کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔

شروع میں سمجھوتہ ایکسپریس کے سلسلے میں جس ٹی وی پروگرام کا حوالہ دیا گیا ہے، میں نے اس میں انہی خیالات کا اظہار کیا تھا اور پروین شاکر نے بھی ابتدائی گفتگو میں کچھ ایسی ہی بات کہی تھی کہ:

''غالباً او ہنری نے کہا تھا کہ کہانی لکھنا دیا سلائی کے تنکوں سے عمارت بنانے کے مترادف ہے۔ اگر ایک تنکا بھی زائد ہو گیا تو کہانی کی پوری عمارت نیچے آ گرتی ہے۔ میرے سامنے اس وقت جو کتاب ہے اس کی مصنفہ اختر جمال صاحبہ نے اسی اصول کو پیشِ نظر رکھ کر یہ کتاب لکھی ہے۔ وہ افسانہ نگاروں کی اس نسل سے تعلق رکھتی ہیں جو دوسری جنگِ عظیم کے بعد وجود میں آئی اور بالخصوص بعض خواتین جیسے حاجرہ مسرور، خدیجہ مستور اور ایسے ہی کچھ بڑے نام جن کے ساتھ انہوں نے لکھنا شروع کیا۔ آزادی، آزادی کی جدو جہد، ہجرت اور پھر ہجرت کے دکھ اور نئے موسموں میں آشیانہ بننے کے جو مسائل ہوتے ہیں اس پر انہوں نے بطورِ خاص لکھا۔ انہوں نے سانحۂ بھوپال کے بارے میں'' بھوپوشیما'' جیسا رپورتاژ بھی لکھا جس میں زہریلی گیس کے اخراج سے آدھی آبادی کے لیے شہر گیس چیمبر بن گیا تھا''۔

اس پروگرام میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے کہا تھا:

''ان کی پہلی اور موجودہ کہانیوں میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ اب ان میں

پاکستان، پاکستان کی روح، پاکستان کے مسائل تو موجود ہیں۔تحریکِ پاکستان کے حوالے سے کردار وں کی حیثیت سے وہ افراد بھی موجود ہیں لیکن یہاں سماجی اور انسانی مسائل زیادہ ابھر کر مزید توانائی کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں مثلاً اس میں ایک افسانہ '' تیسری دنیا کا نمائندہ'' ہے جس میں لڑکے کوڑے کے ڈھیر سے کھانے اور بیچنے کے لیے چیزیں تلاش کرتے ہیں اور بیمار پڑ جاتے ہیں۔ بالا نام کے ایک لڑکے کو جولین تربوز کے چھلکوں پر جھکا ہوا دیکھ کر اس کی تصویر بناتی ہے اور اسے بچوں کے عالمی دن پر اپنے چچا کی کتاب کے سرورق کے لیے منتخب کرتی ہے۔مگر جب ایک عرصہ بعد وہ اسے اس کی تصویر دکھانا چاہتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ کوڑے سے چیزیں تلاش کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں کھجلی رہتی تھی پھر پانی آنے لگا اور پھر بینائی ختم ہوگئی۔وہ اپنی تصویر بھی نہیں دیکھ پاتا۔اس کہانی میں انہوں نے بہت خوب صورتی کے ساتھ تیسری دنیا کے عوام کے مسائل پیش کیے ہیں۔اس مجموعے میں خاص طور سے مجھے یہ محسوس ہوا کہ سماج کو سدھارنے اور انسانی رشتوں کو مستحکم کرنے کا جو جذبہ ان کے اندر پہلے کہیں کہیں دب جاتا تھا وہ ان افسانوں میں بڑا سماجی مسئلہ بن کر سامنے آیا ہے''

چوتھے مجموعے'' خلائی دور کی محبت'' میں ایک کہانی '' وہ جو شریک سفر تھے'' سمجھوتہ ایکسپریس میں بھی شامل ہے اور ان کے خاص موضوع کی نمائندگی کرتی ہے لیکن زیادہ تر کہانیوں کے موضوعات نئی ایجادات یا سائنسی دریافتوں کے بارے میں ہیں مثلاً جب پاکستان میں کسی جگہ سکائی لیب کے گرنے اور تباہی پھیلانے کا خدشہ تھا تو انہوں نے اس پر کہانی لکھی۔ پرائز بانڈ پر لکھی گئی کہانی کا تو عنوان بھی یہی ہے۔'' مولا تیرا شکر ہے'' پاکستان میں زکوٰۃ کا نظام نافذ ہونے پر لکھی گئی۔گھروں میں کام کرنے والی ایک غریب عورت تھوڑے تھوڑے پیسے بچا کر بیٹیوں کی شادیوں کے لیے بینک میں جمع کرتی رہتی ہے جن سے پچاس روپے زکوٰۃ کٹ جاتی ہے۔لیکن حکومت کی طرف سے زکواۃ فنڈ سے اسے چالیس روپے کی امداد ملتی ہے۔اس طرح اس کے دس روپے زکوٰۃ فنڈ میں جاتے ہیں اور وہ کہتی ہے کہ مولا تیرا شکر ہے کہ وہ بھی زکوٰۃ دینے کے قابل ہوئی۔ اس کے دس روپے کسی غریب کے کام آجائیں گے۔ اسی طرح '' پہلا قدم'' ایک طالب علم کے بارے میں ہے جو جاگتی آنکھوں سے ملک میں جمہوریت کی بحالی اور خوشحالی کا خواب دیکھتا ہے۔

'' سالگرہ کا کیک'' جیل میں اپنے اسیر بیٹے سے اس کی سالگرہ کے دن ملاقات اور بیٹی کو یاد کر کے کیک میں آنسوؤں کا نمک شامل ہوجانے کے دل دوز محسوسات اور کیفیات کی کہانی

ہے۔ ''خالہ'' میں امریکہ میں رہنے والے میاں بیوی اپنی رشتے کی خالہ کو بزرگ اور سویٹ آنٹی بنا کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں لیکن دراصل ان کا مقصد گھر کے کام کاج کے لیے مفت کی ایک ملازمہ رکھنا ہے۔ جب بڑی بی کے جوڑوں میں درد رہنے لگتا اور وہ کام کاج کے قابل نہیں رہتیں تو انہیں ان کی بیٹی کے پاس بھیجنے کی تیاری شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن نئے موضوعات کے سلسلے میں خلائی دور کی محبت اس مجموعے کی سب سے عمدہ کہانی ہے۔ جس میں انہوں نے چشمِ تصور سے کسی آنے والے دور کی خوب صورت تصویر کشی کی ہے جب انسان جسمانی پیکر سے آزاد ہو کر زمین کے علاوہ بھی کئی سیاروں اور ستاروں میں سفر کر سکے گا اور کائنات میں محبت کا راج ہو گا۔

۱۹۷۲ میں حلقہ اربابِ ذوق اسلام آباد کے افتتاحی اجلاس کے صدارتی خطاب میں اختر جمال نے جو خیال انگیز اور یادگار باتیں کی تھیں، انہیں ریکارڈ پر لانا ضروری ہے۔ یاد رہے کہ وہ بڑے مایوسی کے دن تھے، سقوطِ ڈھاکہ کے زخم ابھی تازہ تھے اور ہمارے نوے ہزار جنگی قیدی بھارت کی تحویل میں تھے انہوں نے کہا تھا:

'' آج ہمارے ملک میں جو بے یقینی، انتشار اور بے چینی ہے اس کا تقاضہ ہے کہ ہر میدان میں لوگ منظم ہوں اور یہ امر باعثِ افسوس ہے کہ لکھنے والوں میں بھی انتشار، بے یقینی اور مایوسی دیکھنے میں آتی ہے حالانکہ ان کو زیادہ منظم، فعال اور پر اُمید ہونا چاہئے کیونکہ اگر ہم خود بے یقینی اور انتشار کا شکار ہوں گے تو پھر دوسروں کو روشنی کیونکر دکھا سکتے ہیں اگر ادیب فرار کی راہ ڈھونڈیں گے تو پھر وہ اپنے قلم کو کیا جواب دیں گے اور اپنے عوام کو کیا مُنہ دکھائیں گے۔''

سقوطِ مشرقی پاکستان کے حوالے سے انہوں نے کہا کہ ہمارا ایک ہاتھ کٹ گیا ہے تو یہ تسلیم کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ وہ ہاتھ کٹ چکا ہے۔ ہم کب تک لکڑی کا مصنوعی ہاتھ لگا کر اسے دوسرا ہاتھ کہنے پر مصر رہیں گے۔ اور کیا لکڑی کا وہ ہاتھ ہمارے ہاتھ کہنے سے ساری دنیا کو ہاتھ نظر آئے گا؟

انہوں نے کہا کہ اسلام میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا بھی تو ہے، تو اگر اب پچیس برس کی چوری، بے ایمانی، ظلم اور زیادتی کی سزا میں ہمارا ایک ہاتھ کٹ گیا ہے تو ہم آخر کیوں نہیں مان لیتے کہ ہم نے غلطی کی تھی اور اب اس کی سزا بھگت رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم ایک بہادر، خوددار اور غیور قوم ہیں، ہمارا سیدھا ہاتھ موجود ہے۔ ہمارا باقی وجود سلامت ہے، ہم کام کر سکتے ہیں، آگے بڑھ سکتے ہیں۔

انہوں نے ادیبوں کو مشورہ دیا کہ انہیں صاف گوئی ، دیانت داری اور جرأت سے ہر مسئلہ کے ہر پہلو کا جائزہ لینا چاہئے ۔ انہوں نے کہا کہ ادیبوں کا فرض ہے کہ بابا بلھے شاہ ، وارث شاہ ، شاہ عبداللطیف اور اقبال نے جو قندیلیں روشن کی ہیں ، انہیں اونچا اٹھائیں تا کہ نفرت ، بے یقینی اور انتشار کی جگہ یقین ، اُمید اور عزم سے ہمارے قدموں میں استواری پیدا ہو ۔ آج ادیبوں کا سب سے بڑا فرض ہے کہ وہ رجعت پسندی ، تنگ نظری ، تعصب اور بے یقینی کی فضا کو ختم کرنے کی کوشش کریں ۔ انہوں نے اُمید ظاہر کی کہ اسلام آباد میں جو شمع ادب آج روشن ہوئی ہے ، وہ سچائی ، پاک دلی ، وسیع النظری ، رجائیت ، حوصلہ اور عزم کی مظہر بنے گی ۔ اور جمہوریت ، مساوات اور سچی آزادی کے نور سے ہماری بزم ایک دن جگمگا اٹھے گی اور اسلام آباد ہی نہیں ملک کا ہر شہر روشنیوں کا شہر بن جائے گا ۔

زبیدہ مصطفیٰ
ترجمہ: آصف فرخی

کیا پاکستان مصر کے راستے پر چلے گا؟

مندرجہ بالا سوال آج بہت سے ذہنوں کو مضطرب کررہا ہے۔ اگر ہم کو ڈومینو ایفکٹ (domino effect) پر یقین ہے تو دوسرے ممالک کو بھی اس مثال کی تقلید کرنا چاہیے۔ مصر بھی تیونس کے بعد آیا اور اب اس وقت عرب دُنیا کے دوسرے حصّوں میں بھی بے چینی کی لہریں اٹھ رہی ہیں۔

میں نے اس دھماکے دار سوال کا جواب اس نظم میں ڈھونڈنے کی کوشش کی جو فہمیدہ ریاض نے سندھ ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے تنقیدی بیانیے کے اجلاس میں حال ہی میں پڑھی۔ (یہ نظم ''دنیا زاد'' میں شائع ہوچکی ہے۔)

- یہاں فہمیدہ ریاض نے اردو لغت کے بارے میں گفتگو کی جس کو پچھلے سال اردو لغت بورڈ نے شائع کیا، جس کی وہ سربراہ ہیں۔ ۲۲ جلدوں پر مشتمل یہ اشاعت کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ فہمیدہ ریاض کے الفاظ میں، ''یہ دراصل ہماری تہذیب کی تاریخ ہے اور ہماری ثقافت، روایت اور رسم و رواج کے ایک ہزار سال کا بیانیہ ہے۔'' تقریباً ۲۵۴,۰۷۴ الفاظ پر مشتمل اس لغت کی تکمیل میں ۵۱ برس لگے جب کہ آکسفرڈ انگلش ڈکشنری ۷۰ برس میں مکمل ہوئی اور اس میں ۴۱۴,۸۲۵ اندراجات ہیں۔

تقریب کے دعوت نامے میں ان کو سادگی مگر بلاغت کے ساتھ ''پوئٹ، فیمی نسٹ، ہیومن رائٹس ایکٹی وسٹ'' قرار دیا گیا تھا اور فہمیدہ ریاض نے اردو لغت کی تکمیل کے دوران اپنے کارکنان کے تجربات کے بارے میں بصیرت افروز گفتگو کی۔ اس کے بعد ہونے والی بحث نے اس موقع کو اردو زبان کے بارے میں ایک وسیع تر مکالمہ بنا دیا۔

اس موقعے پر انہوں نے جو نظم سنائی، وہ مصر کے سیاق و سباق میں خیال انگیز تھی۔ اس میں ہماری قومی سائیکی پر روشنی ڈالی گئی ہے جو صدیوں کے دوران ارتقاء پذیر ہوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ، انقلاب برپا کرتے ہیں ـ اور ابھی یہ کہنا قبل از وقت ہوگا کہ اس کی وجہ سے فرعونوں کی

سرزمین پر کیا تبدیلیاں رونما ہوں گی۔ ان میں اجتماعی عمل کی اس طرح کی صلاحیت ہونا چاہیے جس کا مظاہرہ قاہرہ میں دیکھنے میں آیا۔

جو پہلی خصوصیت برصغیر کے مسلمانوں کو دوسروں سے مختلف بناتی ہے، وہ ہماری خلقی خواہش ہے کہ جن باتوں پر روائتی طور پر یقین کرتے چلے آرہے ہیں ان سے چمٹے رہیں۔ جب ہمیں یہ پتہ بھی چل جائے کہ ہمارا اعتبار نقص زدہ تھا، ہم تب بھی ان کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ فہمیدہ ریاض نے اس قومی کم زوری کو بڑی خوبی سے بیان کیا جب انہوں نے بتایا کہ مختلف الفاظ کی جڑوں کی تحقیق کا تجربہ کیسا رہا۔ ان کو اس بات نے حیران و پریشان کیا جب ان کے کارکنان نے یہ دریافت کیا کہ ''ابابیل'' کا لفظ جو قرآن شریف میں آیا ہے، کسی پرندے کا نام نہیں ہے جیسا کہ ہم میں سے بہت سے لوگ ایک عرصے سے سمجھتے چلے آئے ہیں۔ یہ جان کر وہ حیران رہ گئیں کہ عربی میں اس نام کی کوئی چڑیا نہیں ہوتی۔ یہ صیغۂ جمع میں ہے اور اس سے مراد پرندوں کا ایک جھنڈ یا غول ہے۔

ہمارے اس رجحان سے مماثلت قائم کرتے ہوئے کہ ہم پر اس چیز کو تسلیم کرنے سے انکار کردیتے ہیں جو ہمارے عوامی مسلّمات کے برخلاف ہے، انہوں نے کہا کہ حقیقت کو بے نقاب کرنا ضروری ہے، وہ چاہے کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو۔ ان کی نظم کے یہ مصرعے سب کچھ کہہ دیتے ہیں:

بناتے ہیں ہم اک فرہنگِ نو
جس میں ہر لفظ کے سامنے درج ہیں
وہ معنی جو ہم کو نہیں ہیں پسند

جو دوسری صفت ہم کو مصر کے سے انداز کے انقلاب کے لیے نااہل ٹھہرائے گی، وہ ان لوگوں کی محدود اور غیر شمولیتی روّیہ ہے جن سے توقع کی جاسکتی ہے کہ معاشرے میں تبدیلی کے عمل کا اور سیاسی انتظامات کی قیادت کریں گے۔ جب بعد میں مجھے فہمیدہ ریاض سے ملاقات کرنے کا موقع ملا تو انہوں نے اس معاملے پر تفصیل سے بات کی۔ ان کو اس بات سے شدید تکلیف ہے کہ اپنی برتری کا احساس ہماری روح میں جاگزیں ہوگیا ہے۔ اس کا تعلق ان ماورائے حقیقت، دور دراز اجتماعی یادوں سے ہے جو ماضی کی عظیم اسلامی سلطنتوں سے متعلق ہیں اور جن کو ہم اب تک سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ ''مگر حقیقت تو یہ ہے کہ ان سلطنتوں میں بہت تنوع تھا اور ان میں غیر مسلم موجود تھے،'' فہمیدہ ریاض نے مجھے یاد دلایا۔

ہمیں اس بات کی ضرورت ہے کہ دوسروں کی شمولیت والا روّیہ اختیار کریں ارر دوسروں کی

عظمت کا بھی اعتراف کریں۔ مسلمان معاشروں نے جب تنوع اور تکثیریت کو گلے لگایا تو ان کو فروغ بھی حاصل ہوا۔ جب ہم نے اپنے درمیان ''دوسروں'' کے وجود سے انکار کرنے لگتے ہیں تو معاشرے میں جمود طاری ہوجاتا ہے۔ اس بات کو انہوں نے یوں بیان کیا ہے:

دوسروں کے لیے صرف نفرت لیے
خشک ہونٹوں پر حرفِ حقارت لیے
جو خلا ہے جہاں اس کو بھرتے نہیں
چار آنکھیں حقیقت سے کرتے نہیں

ان کی بات برمحل ہے۔ ہمارے درمیان جو نفرت امڈ رہی ہے، اس کا نظارہ کرنے کے بعد ایک مضمون جو میں نے نیویورک ٹائمز میں پڑھا، وہ بہت پتے کا معلوم ہوا۔ حسنی مبارک کے اقتدار چھوڑنے سے دو دن پہلے اخوانِ مسلمون کے ایک ترجمان نے لکھا کہ ہم سبھی کے لیے اصلاحات اور حقوق کا ہدف لے کر آگے بڑھے ہیں: صرف اخوانِ مسلمون کے لیے نہیں، صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ مصر کے تمام عوام کے لیے۔ اس کے برخلاف ہمارے ہاں کے اسلام پسند ہمارے معاشرے کے غیر مسلموں اور اقلیتی فرقے کے لوگوں کو کافر قرار دینے میں بڑی خوشی محسوس کرتے ہیں۔ وہ دوسرے مسلک کے علماء کو بھی بُرا بھلا کہتے ہیں۔ یہاں پر منظم تبدیلی کیسے آسکتی ہے؟ یہاں صرف انتشار برپا ہوسکتا ہے۔ لیکن فہمیدہ ریاض نے مستقبل کے لیے امید قائم کرنے کی کوشش کی جب انہوں نے طلوعِ سحر کا ذکر کیا جس سے نئے امکانات کھلیں گے جس وقت تکثیریت، تنوع اور مساوات ہمارا معمول بن جائیں گے۔

اس گلستان کے ہر ایک مہمان کے
روبرو ہوں گے ہم اصل امکان کے
جس کے آگے برابر ہیں میں اور تو
جس کی نظروں میں یکساں ہیں میں اور وہ
بناتے ہیں ہم اک فرہنگِ نو

لیکن کیا ہم اس امید میں شامل ہوسکتے ہیں؟ معاشرے میں موجود دراڑیں بہت گہری ہیں۔ وہ تعدادیں زیادہ ہیں اور ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی گزرتی ہیں۔ کیا ان کو ایک زندگی کے عرصے میں ختم کیا جاسکتا ہے؟

اردو فکشن کا غیر فانی کارنامہ

تہذیب، ادب، عشق، فن، سیاست اور تاریخ کا نادر مرقع

کئی چاند تھے سرِ آسماں

شمس الرحمٰن فاروقی

اٹھارویں انیسویں صدی کی ہند اسلامی تہذیب کے پس منظر
میں زندگی، فن اور محبت کی تلاش پر مشتمل

تصحیح شدہ نئی اشاعت

حمیرا رحمٰن کی کتابوں کی نئی اشاعت

اندمال

انتساب

شعری مجموعہ

ڈاکٹر اسلم فرخی

موسم بہار جیسے لوگ

خاکوں کے مجموعے

سوزن ابوالہوا

زخم کا نشان

ترجمہ: مسعود اشعر

شاہد احمد دہلوی کے قلم سے

دلّی کی بپتا

نئی اشاعت

قلم کار

آننا احمتووا
اجمل سراج
احمد فواد
احمد مشتاق
افضال احمد سیّد
انتظار حسین
انیس اشفاق
پنہاں
تنویر انجم
جے جی بیلارڈ
حسن منظر
خالدہ حسین
خواجہ رضی حیدر
ڈاکٹر طاہر مسعود
راشد اشرف
زبیدہ مصطفیٰ
زہرا نگاہ
شاہدہ حسن
شمس الرحمٰن فاروقی
ظفر اقبال
عرفان ستار
غازی صلاح الدین
فہمیدہ ریاض
فہیم شناس کاظمی
کشور ناہید
محمد سلیم الرحمٰن
مرزا عبدالقادر بیدل
منشا یاد
نزار قبانی
ن۔م۔ دانش

شہرزاد
SCHEHERZADE
Price Rs. 200/-
سرورق: سلمان حسن